فہرست کتب قیمہ

خُطباتِ عالیہ

یعنی

آل انڈیا مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے

چہل سالہ خُطباتِ صدارت کا مجموعہ

حصّۂ دُوم

(از اجلاس بست و یکم تا اجلاس سی ام)

جس میں ہر معزز صدر کے قابل مطالعہ و سبق آموز حالاتِ زندگی مع فوٹو کے چھاپے گئے ہیں

مُرتّبۂ

مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مارہروی)

حسب الارشاد جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء

مُسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئے

(صدر دفتر کانفرنس نے شائع کیئے)

بار اوّل] [۱۰۰۰ جلد

فطرتِ اطفال

یعنی

فنِ تعلیم و تربیت کے متعلق انگریزی کی ایک مختصر لیکن نہایت مفید کارآمد اور دلچسپ کتاب کا ترجمہ اساتذہ و والدین دونوں کے لیئے اس کا مطالعہ ضروری ہے یہ رسالہ ۴۶ صفحہ کا ہے اور ابھی حال میں کانفرنس نے ترجمہ کرا کر شائع کیا ہے۔ اولاد کی تعلیم کا معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تمام خاندانوں کی آیندہ ترقی اسی پر منحصر ہے۔ اس لیئے کسی شخص کو ایسے اہم مقصد پر چار آنے خرچ کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ جب آپ اس رسالہ کو غور سے پڑھینگے تو اندازہ ہوگا کہ صرف چار آنے خرچ کرکے آپنے کس قدر معلومات و تجربہ حاصل کیا۔ خود بھی خریدیئے اور صاحب اولاد احباب کو بھی خریداری کی ترغیب دیجئے۔

تاریخ التعلیم

مصنفہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم اے ڈی ایس سی پی ایچ ڈی سی آئی ای
سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اس رسالہ میں فنِ تعلیم و تدریس کی گزشتہ تاریخ نہایت سلیس و شگفتہ عبارت میں بیان کی گئی ہے۔ اور مختلف اوقات میں ماہرین فن تعلیم نے جو تعلیمی اصول قایم کیئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں مختلف ممالک و اقوام کے اصولِ تعلیم میں واقع ہوئیں اُن کو نہایت حُسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔ جملہ اصحاب جو فن تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت ۱۲۴ صفحہ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ:- دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

خطباتِ عالیہ

حصّہ دُوم

(از اجلاس بست و یکم منعقدہ کراچی سنہ ۱۹۰۷ء تا اجلاس سی ام منعقدہ علی گڑھ سنہ ۱۹۱۶ء)

فہرست مضامین

(حالات، خطبات، تصاویر)

(خطبات عالیہ کی اس دوسری جلد میں حسب ذیل بزرگوں کے حالات، خطبات، اور عکسی تصاویر موجود ہیں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقدّمہ

نوشتۂ مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی

موجودہ زمانہ میں جب کہ انگریزی تعلیم ہندوستان میں سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے، ہزاروں اسکول اور کالج قایم ہیں اور یُونی ورسٹیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اُس زمانہ کی حالت کا اندازہ کرنا مشکل ہے جب کہ آج سے پچاس برس پہلے مسلمان نہ صرف انگریزی تعلیم سے ناآشنا تھے بلکہ اس کے سخت مخالف تھے چنانچہ سرسید مرحوم نے جب اپنی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا تو عام طور پر مُسلمانوں کے ہر طبقہ نے اِن کی مخالفت میں آواز بلند کی اور بجز چند افراد کے جو اُن کے ہم آہنگ تھے عام مسلمانوں کی طرف سے سرسید کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ لیکن باوجود شدید مخالفت کے سرسید اور اُن کے رفقائے کار استقلال اور مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ مُسلسل پچاس برس

کی جد و جہد کے بعد فضا میں اس قدر تبدیلی پیدا ہو گئی کہ اب کوئی آواز جدید تعلیم کی مخالفت میں بلند نہیں ہوتی۔ اور اگر ہو بھی تو کوئی شخص اس آواز پر لبیک کہنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمان اپنے ضرب المثل افلاس، تعلیم کی گرانی اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اب بھی بہ نسبت غیر مسلم اقوام کے جدید تعلیم میں پس ماندہ ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ جدید تعلیم کے مخالف ہیں یا اس کی ضرورت سے انھیں انکار ہے۔ سرسید نے اس مخالفت کے طوفان کا جس طریقہ سے مقابلہ کیا اور آخرکار جن ذرائع سے کامیابی حاصل کی، اس موقع پر اختصار کے ساتھ اس کا تذکرہ کرنا غالباً بے جا نہ ہو گا۔

(۱) جب سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان مذہبی حیثیت سے انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں اور اُن کا یہ عام خیال ہے کہ ایک غیر مسلم قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں، تو اُنھوں نے مضامین، خطبات، مستقل رسائل، اور اپنے مشہور ماہانہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اوہام و خیالات کی تردید کی اور بتایا کہ مذہب علوم جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے تاریخی حیثیت سے ثابت کیا کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج و کمال میں غیر قوموں کے علوم سیکھے بلکہ اُن میں خاص فضل و کمال حاصل کیا۔ سرسید کے ان پُر زور مضامین نے اُن کے بہت سے حامی و مددگار پیدا کر دیئے۔ جو اپنے عالمانہ

مضامین اور تصنیفات و خطبات کے ذریعہ سے مسلمانوں کے خیالات
کی اصلاح کرتے رہے یہاں تک کہ مخالفت کا وہ طوفان ٹھنڈا ہو گیا۔
اور اب لوگوں کو سرسید اور اُن کے احباب کے خیالات سے وہ
نفرت نہیں رہی جو پہلے تھی۔

(۲) چونکہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں مُسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی
انتظام نہ تھا، اس لیئے مسلمانوں کو عام طور پر انگریزی تعلیم سے وحشت
تھی۔ وہ خیال کرتے تھے کہ مذہبی تعلیم نہ حاصل کرنے سے اُن کے بچے
اسلام سے بیگانہ ہو جائینگے۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال کچھ بے جا نہ تھا اس لیئے
سرسید نے یہ تجویز کیا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کے لیئے اپنی مخصوص درسگاہیں
قایم کریں۔ جو خود مسلمانوں کی نگرانی و انتظام کے ماتحت ہوں اور اُن
درسگاہوں میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جائے
چنانچہ چند سال کی سعی و کوشش کے بعد سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج
کا سنگِ بنیاد رکھا۔ شیعہ و سُنّی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیئے علیحدہ علیحدہ
کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نصابِ تعلیم تجویز ہوا۔ نماز کے لیئے مسجد تعمیر کی گئی۔ اور
اخلاقی نگرانی کے لیئے اتالیق و نگراں مقرر کیئے گئے ان انتظامات سے
مسلمانوں کو ایک حد تک اطمینان ہوا، اور وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے اس
کالج میں بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔

(۳) باوجود مندرجۂ بالا تدابیر کے ابھی مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت ہندوستان میں ایسی موجود تھی جو یا تو سرسید کی تحریک سے قطعًا نا آشنا تھی یا اُن کے مخالف تھی۔ اِس لیئے کالج قایم کرنے کے دس سال بعد ۱۸۸۶ء میں سرسید نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کوئی مُفید تحریک اُس وقت تک سرسبز و کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک مسلمانوں میں ایک مستقل و مضبوط جماعت ایسی نہ ہو جو لگاتار اس تحریک کے متعلق تبلیغ و اشاعت کی خدمت انجام دیتی رہے۔ بلکہ ملک کے مختلف صوبوں میں دورہ کر کے اور لوگوں کو جمع کر کے اپنے خیالات اُن کو سنائے۔ سرسید کے اِس تخیل کا نتیجہ وہ مشہور و معروف انجمن ہے جس کا نام مختلف تبدیلیوں کے بعد آج کل **آل انڈیا مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس** ہے اور جس کا صدر دفتر مُسلم یونیورسٹی کے پہلو میں بمقام علی گڑھ قایم ہے۔ اس موقع پر کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ گزشتہ چالیس سال میں کانفرنس نے اپنے مقاصد کے متعلق اس قدر کثرت سے لٹریچر شائع کیا ہے اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر اتنے اجلاس منعقد کیئے ہیں کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان نہ صرف کانفرنس کے نام سے واقف ہو چکا ہے بلکہ اجمالی طور پر اس کے اغراض و مقاصد سے بھی باخبر ہے۔

کانفرنس مسلمانوں کی سب سے پہلی باقاعدہ انجمن ہے جو ایک خاص قانون اور دستور العمل کے ماتحت کام کرتی ہے اور موجودہ تہذیب و تمدّن نے قومی مجالس کے متعلق جو تہذیب و ضابطہ لازم قرار دیا ہے اُس کی پابند ہے۔ یہ کانفرنس ہر سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں اپنا اجلاس ہندوستان کے کسی خاص شہر میں منعقد کرتی ہے جو اکثر تین روز تک رہتا ہے۔ اجلاس کی رہنمائی کے لئے پہلے سے ایک صدر کا انتخاب ہوتا ہے۔ صدر اجلاس کے نظم کو باقاعدہ قایم رکھنے کے علاوہ اپنا خطبۂ صدارت بھی پڑھتا ہے جو عموماً لکھا ہوا ہوتا ہے۔ چوں کہ صدارت کے لیئے اکثر ملک کے قابل و ممتاز اصحاب کا انتخاب ہوتا ہے جو علاوہ تعلیم یافتہ ہونے کے اپنی قوم کی حالت کے متعلق وسیع تجربہ رکھتے ہیں (بلکہ پہلے سے قومی خدمت میں مصروف ہوتے ہیں) اِس بنا پر وہ اپنا خطبۂ صدارت خاص توجّہ اور محنت سے تیار کرتے ہیں اور اپنے تجربہ و وسیع معلومات کے لحاظ سے جن چیزوں کو مسلمانوں کے لیئے مفید سمجھتے ہیں بیان کرتے ہیں۔ اس لیئے یہ خیالات و افکار درحقیقت اس لائق ہیں کہ قوم ان پر عمل کرے اور آیندہ نسلوں کے لیئے اُن کو محفوظ رکھے۔ گزشتہ چہل سالہ مدّت میں کانفرنس کے اُنتالیس اجلاس ہندوستان کے مختلف صوبہ جات میں منعقد ہوئے اور ہر اجلاس کی رپورٹ سال بہ سال شایع ہوتی رہی جن میں یہ خطباتِ صدارت بھی شامل تھے۔ لیکن آج یہ رپوٹیں ناپید ہیں۔

اِس لیئے اگر کسی شخص کو ان خطبات کے پڑھنے کا شوق بھی ہو تو اُن کا مُہیا کرنا ممکن نہیں۔ البتہ کانفرنس کے صدر دفتر میں ایک ایک جلد محفوظ ہے۔ لیکن اس سے ہر شخص مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے کانفرنس کا یہ کارنامہ لایق تحسین و ستایش ہے کہ اُس نے اِن پراگندہ خطبات کو ایک جا کرکے شایع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

جو اصحاب ابتدا سے کانفرنس کے شریک و مددگار رہیں اُنھوں نے آہستہ آہستہ چالیس سال میں یہ خطبات سُنے ہیں اور اس طرح سے سنے ہیں کہ ان کے لیئے سفر کی زحمتیں اُٹھائی ہیں، روپیہ صرف کیا ہے، اور با اوقات آرام و راحت کی قربانی بھی کی ہے۔ لیکن **خُطباتِ عالیہ** کے ناظرین خوش نصیب ہیں کہ جو داستان دوسروں نے چالیس سال میں بصرفِ دولت و راحت سُنی وہ آج مکمل صورت میں اُن کے سامنے موجود ہے جس کو وہ چند گھنٹے میں اِس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ نہ سفر کی ضرورت ہے نہ صرفِ زر کی حاجت۔

قوم میں ہر خیال کے لوگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے بعض اشخاص ایسے بھی ہوں جن کے نزدیک کانفرنس کی یہ خدمت مفید و لایق ستایش نہ ہو اور اُن کے خیال میں اس داستانِ کہن و افسانہ پارینہ کا شایع کرنا تحصیلِ حاصل سمجھا جائے۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ ملک میں اہلِ نظر بھی ہیں جو اس کام کی اہمیت بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک مختلف حیثیات سے یہ مجموعہ نہایت مفید و دلچسپ ہے۔ اجمالاً بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) اس کتاب کے چالیس ابواب (خطبات) ہیں۔ لیکن ان ابواب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ چالیس سال میں لکھے گئے۔ چالیس اصحاب نے تصنیف کیے اور شایع کرنے سے پہلے ہندوستان کے مختلف چالیس موقعوں پر سنائے۔ ہزاروں سامعین دور و دراز مقامات کا سفر کرکے آئے تاکہ خود مصنفین کی زبان سے سنیں۔ اخبارات نے ان کو شائع کیا، اور ہندوستان کے ہر گوشہ گوشہ تک پہونچایا۔ اور آخر کار چالیس سال بعد یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ کیا یہ خصوصیت اردو کی کسی اور کتاب کو بھی حاصل ہے؟

(۲) عام طور پر ہر کتاب زبان و طرز ادا کے لحاظ سے ابتدا سے انتہا تک ایک شان رکھتی ہے۔ اگر مصنف صاحبِ ذوق ہے اور اس کو زبان پر قدرت حاصل ہے تو اس کی کتاب اپنے عہد کی زبان کا بہتر نمونہ ہوتی ہے۔ لیکن خطباتِ عالیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ زبان کے لحاظ سے اس کا ایک باب دوسرے سے مختلف ہے۔ چوں کہ اس کی ترتیب و تکمیل چالیس سال میں انجام پذیر ہوئی ہے، لہذا زبان میں تدریجاً جو انقلابات و تبدیلیاں ہوتی رہیں اور طریقۂ ادا، طرزِ استدلال،

اسلوب بیان، اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے زبان میں جو ترقی ہوئی اُن سب کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔ ابتدائی خطبات مختصر اور سادہ ہیں۔ اُن میں مضامین کی کوئی خاص ترتیب یا تقسیم نہیں، نہ مختلف تعلیمی مسائل پر بحث ہے۔ بلکہ سادہ زبان میں کانفرنس کی ضرورت کا اظہار کر کے مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسی ذیل میں کہیں کہیں اُن نکتہ چیں اشخاص کا جواب بھی ہے جو کانفرنس اور انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں زبان میں مغربیت کا اثر مطلق نہیں پایا جاتا۔ البتہ وہ سادہ طرزِ بیان ضرور موجود ہے جو سرسید نے واقعات و مسائل کے بیان کے لیئے اختیار کیا تھا۔ ابتدا میں لوگ زیادہ تر سرسید، نوّاب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، اور علامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار مشاہیر کے دیکھنے اور اُن کا لکچر یا کلام سُننے کے لیئے آتے تھے۔ خطبۂ صدارت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ صدر قاعدہ کے مطابق اجلاس کا نظم قایم رکھتا۔ مگر سرسید کی زبردست شخصیت سے مرعوب ہو کر اُن کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔ لیکن جب چند سال بعد آہستہ آہستہ اس کانفرنس نے مستقل و مضبوط حیثیت اختیار کر لی، اور تعلیمی کام کے تجربہ کی بدولت بہت سے مسائل بحث و نظر کے لیئے سامنے آ گئے تو خطبۂ صدارت

نے بھی ایک خاص حیثیت اختیار کرلی۔ اب صدر کا کام صرف اجلاس کے طریقۂ کار کی رہ نمائی کرنا نہ تھا۔ بلکہ لوگ اُس سے یہ توقع بھی کرتے تھے کہ وہ موجودہ تعلیمی مسائل اور زیرِ بحث مضامین پر مسلمانوں کو اپنے تجربہ و خیالات سے فائدہ پہونچائے گا۔ اُن کی تمام ضرورتوں کے متعلق مفید تدابیر بتا کر اپنی قابلیت کا ثبوت دیگا۔ کانفرنس کے سات ابتدائی اجلاس خطبۂ صدارت کے لحاظ سے کچھ ممتاز نہیں ہیں۔ لیکن ۱۸۹۳ء میں جب کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا اور **نواب محسن الملک** صدر منتخب ہوئے تو خطبۂ صدارت میں ایک خاص وسعت و شان پیدا ہوگئی۔ یہ سب سے پہلا خطبہ تھا جس میں زورِ بیان اور جوش پایا جاتا ہے اور انشا پردازی کی ایک خاص جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً نواب صاحب ایک موقع پر نکتہ چینوں کے جواب میں فرماتے ہیں :۔

"مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس قایم کرکے مسلمانوں کو بہکایا۔ مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیئے یہ بتا دیں کہ انھوں نے

اپنی قوم کے لیۓ کیا کیا، اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیۓ دیر و کنشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمائیے کہ اُن کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جاکر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قایم کی، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا، مگر ہمارے دوست براہِ مہربانی یہ فرما دیں کہ اُنھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مُصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جاکر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر مُضر یا بے سود کام کرنے کے گنہ گار رہیں تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے ؎

گردِ سرِ تو گشتن و مُردن گناہِ من
دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہِ کیست
گیرم کہ وقتِ ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

غرض نواب صاحب کی صدارت کے بعد خطبۂ صدارت آہستہ آہستہ وسعت و جامعیت اختیار کرتا گیا۔ جدید مباحث پیدا ہوگئے۔

انگریزی زبان کے اثر سے اُردو کے ذخیرہ مفردات و مصطلحات میں اضافہ ہوتا گیا۔ طریقہ استدلال اور طرز ادا میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ آج اگر ان خطبات کو مسلسل طریقہ پر پڑھا جائے تو زبان کے یہ تمام ارتقائی مدارج صاف طور پر نظر آتے ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان نے گزشتہ چالیس سال میں اسالیب بیان اور ذخیرۂ الفاظ کی حیثیت سے کس قدر ترقی کی اور مغربی تعلیم کا خیالات و زبان پر کیا اثر پڑا۔ لہذا اس لحاظ سے بھی یہ خطبات ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں جو کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

۳) قدامت اور امتداد زمانہ نے ان خطبات میں ایک تاریخی حیثیت بھی پیدا کر دی ہے۔ جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے یہ خطبات تمام تعلیمی مباحث پر حاوی ہیں۔ اگر بحث کا کوئی پہلو ایک خطبہ میں رہ گیا ہے تو دوسرے میں موجود ہے۔ ان خطبات سے مسلمانوں کی گزشتہ چہل سالہ تعلیمی تاریخ اجمالی طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً ابتدا میں جب مسلمان جدید تعلیم کے مخالف ہیں تو تعلیم کے جواز اور اُس کی ضرورت پر عقلی و نقلی دلائل پیش کیئے جاتے ہیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلیم کے متعلق بہت سے جزئیات پر بحث کی جاتی ہے۔ اور طریقۂ کار تجویز

کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان تعلیم شروع کر دیتے ہیں تو اس راہ میں مشکلات و دشواریاں پیش آتی ہیں۔ کہیں افلاس زنجیر پا بن جاتا ہے کہیں خاص خاص قوانین سنگِ راہ ثابت ہوتے ہیں، کبھی برادرانِ وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری تعلیم میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ اس لیئے مشکلات کے حل کرنے پر توجہ کی جاتی ہے۔ غربا کی تعلیم کے لیئے وظائف مانگے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ سے تعلیم میں آسانیاں بہم پہونچانے کے لیئے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ برادرانِ وطن کی بے مہری پر اظہار رنج و افسوس ہوتا ہے۔ مگر ان سب مشکلات کے باوجود تعلیمی کام برابر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مُسلمان تعلیم پا پا کر اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں۔ اور گورنمنٹ کی کچھ ملازمتیں اُن کو حاصل ہو جاتی ہیں۔

جب تعلیم اس حد تک پہونچ جاتی ہے تو مسلمان ایک قدم اور بڑھاتے، یعنی اب تعلیم نسواں کی ضرورت سامنے آتی ہے اور مُسلمانوں کو خطبۂ صدارت میں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہونگی بچّوں کی تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے ممکن نہ ہوگی۔ کیوں کہ تعلیم کی ابتدا آغوشِ مادر سے شروع ہوتی ہے۔ چند سال کی پیہم تبلیغ کے بعد مسلمان تعلیم نسواں کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کانفرنس

میں ایک مستقل شعبہ قایم ہوتا ہے۔ اور ایک زنانہ اسکول کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

اِس کے بعد بالغ العمر مُسلمانوں کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ اب چند سال سے کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس پر بحث کی جاتی ہے۔ اور یُورپ میں اس کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے اُس کو بطورِ مثال بیان کیا جاتا ہے۔ اِسی سلسلہ میں شبینہ مدارس کے قیام کا معاملہ ہے جس کی ضرورت شدّت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ جبریہ و مفت تعلیم کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آگیا ہے اور اس کی ضرورت پر خاص طریقہ سے زور دیا جاتا ہے اور چوں کہ حالات کی تبدیلی اور برادرانِ وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری کی وجہ سے ملازمت کا دروازہ مسلمانوں کے لیئے بند ہو رہا ہے، اس لیئے اب اُن کو صنعتی و تجارتی تعلیم کے حاصل کرنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے کیوں کہ یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ اگر مسلمان صنعت و حرفت پر متوجہ نہ ہوئے تو کسبِ معاش کے زرخیز وسایل سے محروم رہ جائینگے۔ علاوہ خطبۂ صدارت کے یہ مسایل مختلف تجاویز کی صورت میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں۔ غرض حالات کی تبدیلی اور زمانہ کی ترقی پزیر رفتار نے بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے اس لیئے دائرۂ بحث وسیع ہوا اور

وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس بنا پر کانفرنس کے صدر کا یہ فرض ہوگیا ہے کہ وہ اپنے خطبہ میں مُسلمانوں کی تمام ضروریات کا استقصا کرے اور اُن کے متعلق مفید تدابیر بتائے۔ **خطباتِ عالیہ** کے مُطالعہ سے یہ سب باتیں اجمالی طور پر معلوم ہوجاتی ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ چہل سالہ دَور میں نظامِ تعلیم و طریقۂ تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں، اور مُسلمانوں پر ان انقلابات کا کیا اثر پڑا۔ اس سلسلہ میں مُسلم یونی ورسٹی کی تحریک اور اُس کے انجام کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ غرض سیکڑوں تعلیمی مسائل ہیں جن کی اجمالی تاریخ خطبات کے مُطالعہ سے معلوم ہوتی ہے اور وہ طریقِ کار بھی معلوم ہوجاتا ہے جو بہ حالتِ موجودہ مسلمانوں کے لیے مفید ہے۔ اگر آپ اِن خطبات کا غور سے مُطالعہ کرینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تعلیم کے متعلق کتنے جدید مسایل پیدا ہوگئے اور ملک کی سیاسی و اقتصادی حالت نے مُسلمانوں کی تعلیم پر کیسا زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہ خبریں آپ کو کسی دوسری کتاب سے معلوم نہیں ہوسکتیں لہٰذا اس پہلو سے بھی خطبات کا مُطالعہ مسلمانوں کے لیے مفید و سودمند ہے۔

(۴) یہ خطبات درحقیقت علی گڑھ تحریک کی تاریخ کے چند اجزا یا ابواب ہیں اور ایک اہم ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے علی گڑھ تحریک

کے متعلق کوئی مستقل کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ
ایسی متعدد کتابیں و رسائل شائع ہو چکے ہیں جن کا مطالعہ علی گڑھ
تحریک کے متعلق صحیح معلومات بہم پہونچاتا ہے۔ مثلاً سرسید، نواب
محسن الملک وغیرہ کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں چھپا
کرتے تھے اب مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو گئے ہیں،
اسی طرح سرسید، نواب محسن الملک، اور شمس العلماء مولانا
نذیر احمد کے تمام لیکچر مدت ہوئی چھپ گئے۔ سرسید کی مکمل
سوانح عمری مولانا حالی کے قلم سے حیاتِ جاوید کے نام سے
اِسی صدی کے اوائل میں شائع ہو گئی جس سے علی گڑھ تحریک
کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں کانفرنس
نے نواب وقار الملک کی مکمل لائف وقار حیات کے نام سے
چھاپی ہے جس میں علی گڑھ تحریک کے متعلق بڑا ذخیرہ معلومات کا
موجود ہے۔ ان سب کتابوں کے علاوہ سرسید، نواب محسن الملک
اور نواب وقار الملک کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں،
جن میں علی گڑھ تحریک کے متعلق بہت سے اہم واقعات ملتے ہیں۔
یہ سب چیزیں کالج کی تاریخ کے اجزا اور ابواب ہیں اور اب خطبات عالیہ
نے اس سلسلہ کو بڑی حد تک مکمل کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ان سب

کتابوں کا مُطالعہ کرے تو علی گڑھ تحریک کے متعلق اُس کو کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایک سلیقہ مند شخص ان سب چیزوں کو پیشِ نظر رکھ کر علی گڑھ تحریک کی ایک دل چسپ و مفصّل تاریخ مرتب کر سکتا ہے۔ جو کمی تھی وہ خطبات نے پوری کر دی۔ غرض مختلف وجوہ سے یہ خطبات نہایت دل چسپ و سبق آموز ہیں اور جتنا زمانہ گزرتا جائیگا اِن کی قدر و قیمت بڑھتی جائیگی۔

یہ خطبات بجائے خود دل چسپ تھے لیکن ہر صدرِ انجمن کے مختصر حالات و تصاویر نے اُن کو اور زیادہ دل چسپ بنا دیا ہے۔ ابھی چوں کہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے اس لیئے کوشش کرنے سے یہ حالات فراہم ہو گئے، ورنہ چند سال بعد تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہ آتے۔ تصویروں کا ملنا تو اور زیادہ دشوار تھا۔ اب بھی ایک سال کی تلاش و خط و کتابت کے بعد یہ حالات و تصویریں فراہم ہوئی ہیں۔ **نواب صدر یار جنگ بہادر مولٰینا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی** آنریری سکرٹری ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین کے لیئے جن صاحب کو منتخب کیا اُن کی موزونیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ مولوی **انوار احمد صاحب** زبیری مارہروی (جو ان حالات و خطبات کے جامع ہیں) موجودہ صدی کے اوایل سے کانفرنس سے وابستہ ہیں۔ اُنھوں نے زمانۂ دراز تک

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے ساتھ کانفرنس کا کام کیا ہے اور کانفرنس کے اجلاسوں کے انتظام میں خاص حصہ لیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ گویا کانفرنس کی زندہ تاریخ ہیں۔

گزشتہ چالیس سال میں جس قدر اصحاب کانفرنس کے صدر ہوئے اُن میں سے بجز دو صاحبوں کے مولوی انوار احمد صاحب نے سب کو دیکھا ہے، اکثر سے ملاقاتیں کی ہیں اور اُن کی باتیں سُنی ہیں اور بہت سے لوگوں کے خطبہائے صدارت خود اُن کی زبان سے سُنے ہیں۔ بہت سے بزرگ ایسے ہیں جن کے حالاتِ زندگی دیکھنے کا اُن کو خاص موقع ملا ہے۔ ان حالات کے لحاظ سے اس کام کے لیئے اُن سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا؟ اور شاید اب علی گڑھ میں اور کوئی شخص ایسا موجود بھی نہیں جو ایک رُبع صدی سے کانفرنس سے مستقل تعلق رکھتا ہو، جس نے کانفرنس کے اتنے اجلاس دیکھے ہوں، اور کانفرنس کے مقاصد کے سلسلہ میں ہندوستان کے قریباً ہر صوبہ کا ہزاروں میل سفر کیا ہو۔

چنانچہ جیسی توقع تھی مولوی انوار احمد صاحب نے اس خدمت کو نہایت دلچسپی اور ذوق کے ساتھ انجام دیا۔ حالات کے سلسلہ میں بہت سی چیزیں اُنھوں نے ایسی لکھی ہیں جن کے وہ چشم دید راوی ہیں۔ یہ واقعات ہم کو

صرف اُن ہی سے معلوم ہو سکتے تھے۔ اب جو شخص آیندہ علی گڑھ تحریک کی تاریخ مرتب کرنا چاہے اُس کے لیئے مولوی انوار احمد صاحب کی یہ کتاب بہت مفید و کارآمد ہو اور عام ناظرین کے لیئے بھی جو قومی تحریکات سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہیں نہایت دلچسپ ثابت ہوگی، اور حسنِ قبول حاصل کرے گی
اُمید ہو کہ کانفرنس کی چالیسویں سال گرہ (اجلاس) کے موقع پر (جو امسال مدراس میں ہو) اس کتاب کا شایع ہونا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور مدراس کا چالیسواں خطبۂ صدارت کانفرنس کی تاریخ کو ۱۹۲۷ء تک مکمل کردیگا۔

خاکسار
محمد اکرام اللہ خاں ندوی
شاہجہاں پوری

سلطان جہان منزل،
علی گڑھ

۲۷ مئی ۱۹۲۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ جلد دوم

نوشتۂ جامع اوراقِ ہٰذا

الحمد للہ علیٰ احسانہ "خطباتِ عالیہ" کی پہلی جلد (از اجلاس اوّل منعقدہ علی گڑھ تا اجلاس بستم منعقدہ ڈھاکہ) دسمبر ۱۹۲۷ء کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوگئی۔ باقی رہے بیس برس کے خطبے اور ہر صدر اجلاس کی زندگی کے اہم پہلو اور ان کے فوٹو، وہ اب دس دس برس کی دو جلدوں میں منظر عام پر ہیں۔

یاد ہوگا جب اس مجلس کانفرنس کی بنیاد پڑی تو وہ زمانہ مسلمانوں کی دماغی و شعوری انحطاط کا آخر باب تھا۔ لیکن جب مشیت الٰہی کسی کام کا ارادہ کرلیتی ہے تو وہی اس کے اسباب بھی پیدا کردیتی ہے۔ چنانچہ جب اس کو منظور ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان پھر نئے سرے سے علم و عمل کی زندگی میں اُبھریں اور شایستہ قوموں کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہونے کی طاقت پیدا کریں تو اس قوت کی روح اور اس کا جسم کانفرنس کی شکل و صورت میں ظاہر ہوا جس نے علمی، اخلاقی، اجتماعی نشو و نما کے لحاظ سے نئے سرے سے برگ و بار پیدا کیے۔ اخوتِ اسلامی کا پرانا سبق یاد دلایا، قومی ہمدردی کی آواز کانوں میں پہونچائی، نامور خطیبوں

(یا یوں سمجھو کہ قوم کے ڈاکٹروں) نے قوم کے امراض کی تشخیص کرکے جسم قومی کے ہر کم زور حصّہ کو طاقت پہونچانے کی کوشش کی۔ فطرت کا قاعدہ ہے کہ اس عالم خاکی میں ہر شے کی ابتدا سادہ طریقے سے ہوتی ہے جس میں طرح طرح کی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کا ظہور بتدریج اور ضرورت کے مطابق ہوتا ہے، کانفرنس کے ابتدائی دَور میں خطبات صدارت اسی شان سادگی کا پہلو لئے ہوئے ہیں مگر جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا ہے ضرورتوں کی فراوانی اور حالات کے انقلاب کے ساتھ خیالات کی وسعت بھی ہمہ گیری اختیار کرتی جاتی ہے۔ چنانچہ دوسری اور تیسری جلدوں کے خطبے اُن تمام ضروریات پر حاوی ہیں جو آج علم و فن کے اہم مسائل بنے ہوئے ہیں۔

۱۹۰۰ء سے جو جو نظریات عمل ہمارے سامنے لائے گئے ہیں اگر قوم بہ حیثیت مجموعی ان کو پیش نظر رکھتی تو ستائیس برس گزر جانے کے بعد تمام علمی شعبوں میں جو بلند درجہ ہمارا ہوتا اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس وقت عام طور سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر خاص طور پر بحث ہو رہی ہے۔ ان کی پست حالی، اُن کی اقتصادی اور تجارتی تنزل کی خرابی کا باعث قرار دی جاتی ہے۔ دوسری طرف صنعتی و حرفتی تعلیم کا فقدان اس مرض کا بڑا سبب بیان کیا جاتا ہے۔ ایک پر زور صدا اوقافِ اسلامی کی بدنظمی کے متعلق اٹھتی ہے اور اوقاف کی تنظیم پر شور بلند ہوتا ہے۔ ایک بڑا مسئلہ وقف علی الاولاد کا ہے جو قوم کے تمدنی اور معاشرتی ستون کو کھوکھلا کئے دیتا ہے اور جس پر عمل نہ ہونے سے مسلمانوں کی روزی کا ٹھیکرا جو زمین کی صورت میں بچا کھچا رہ گیا ہے، وہ ان کی غفلت اور عیش پرستی کی بدولت روز بروز ان کے ہات سے نکلا چلا جا رہا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے یہ وہ چند اہم مسائل ہیں جو چاروں طرف ہماری بحث و فکر کے جولانگاہ نظر آتے ہیں مگر کسی نے

یہ بھی نظر کی کہ جو خیالات اب طشت از بام ہیں ان پر ۱۸۹۳ء سے برابر اور لگاتار بحث کرکے قوم کو اس کی ان کم زوریوں پر توجّہ دلائی گئی ہے مگر کتنے اصحاب ایسے ہیں جنھوں نے اس حقیقت پر توجہ کی اور جو کہا گیا اُس کو اُنھوں نے سنا، اور جو لکھا گیا اُس کو اُنھوں نے پڑھا اور عمل کرنے پر ہمت کا قدم بڑھایا۔ تجویزیں، تحریکیں، رزولیوشن نظر آتے ہیں لیکن عمل مفقود ہے۔ اس مجموعہ کا مطالعہ ہماری تمام ضروریاتِ قومی پر حاوی ہے اور اس ترتیب کی یہی غرض ہے کہ قوم عملاً ان خیالات سے استفادہ حاصل کرے۔

ایک خاص بات ہمارے طالبانِ علم کے لیئے اس مجموعہ میں ان بزرگوں کی سیرت کا مطالعہ ہے جو ان اوراق کا بلاشبہ نور افزا اور دل کشا باب ہیں۔ یہی وہ نور ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی دماغی ظلمت کدوں کو منور کر سکتے ہیں بہ شرطیکہ ہم کو اپنی حالت کا حقیقی طور پر احساس ہو، دنیائے عمل کی ہم کس منزل میں ہیں اس پر غور کرنے کی ہم کو صلاحیت ہو۔ لوگ کہتے ہیں (اور اکثر سنجیدہ صحبتوں میں اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے) کہ اگلے زمانہ میں دنیائے اسلام نے جیسے جید عالم، برگزیدہ اہلِ فن اور صاحب کمال صناع پیدا کیئے اور جن کا ذکر اب تاریخوں میں باقی رہ گیا ہے اب ایسے صاحب فن، صاحب اخلاق، جامع محاسن و کمالات پیدا ہونے محالات سے ہیں اِن کے نزدیک گویا اسلامی خیر و برکات کا زمانہ گزر گیا اور مسلمانوں کے لیئے اب مادّی دنیا میں ترقی کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی۔ اسلامی سلطنت کے زیر سایہ ترقی ہوئی تھی اب اس کے نہ رہنے سے علمی، اخلاقی، مادی، ترقیوں کا حاصل ہونا معلوم، بے شبہ انعامات الٰہی میں سے کسی قوم کی آزادی سب سے بڑی نعمت اور اس کی اپنی حکومت سب سے بڑا احسان الٰہی ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ اور موجودہ ماحول کے اندر ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں آخر اسی ملک میں غیر قوم کی حکم رانی اور زیر قیادت دوسرے ابنائے وطن

میں سینکڑوں عالمانِ فن بیسیوں ہمدرد ملک و ملّت کیسے اور کیوں کر پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور نہ صرف ان میں بلکہ ہم میں بھی؛ مثلاً جن مشاہیر قوم کے حالات اور شبیہوں سے خطبات کے صفحات مزین ہیں اور جن علمائے زمانہ کے خطبات سے یہ کتاب معمور ہے ان کے حالات کا ہمارے نوجوان طلبہ مطالعہ کریں اور ان کی سیرت پر غور کریں تو معلوم ہو کہ اس چالیس سالہ مدّت میں جن جن اصحاب کا ذکر خیر پیش نظر ہے اور جن کی زندگی ایک رہنما کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے وہ کیسے اور کیوں کر ان مدارج علیا پر پہونچے۔

یہ حالات ہم کو بتاتے ہیں کہ ان کا علم سطحی نہ تھا کافی غور و فکر، وسیع مطالعہ اور حقایق اشیاء پر توجہ کرنے کی عادت نے شروع سے ان کا ایک نصب العین قرار دے لیا تھا، کتابی درس کے ساتھ ساتھ درسِ عمل ان کی زندگی کا دستور العمل بن گیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہماری ذات کے سوا ہمارے اوپر دوسرے بنی نوع انسان کے بھی حقوق ہیں۔ ان حقوق کی ذمہ داری کو وہ اپنا ایک فرضِ زندگی سمجھتے تھے۔ ان باکمالوں میں دو چار اہلِ دول کو چھوڑ کر باقی تمام ہستیاں ایسے گھرانوں میں پیدا ہوئیں جو عزت و حشمت؛ اور دولت و ثروت کے لحاظ سے معمولی گھرانے کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب جوہر قابلیت پیدا کر کے وہ پروان چڑھے تو انھوں نے نہ صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کو اوج ترقی پر پہونچایا، بلکہ قومی عزت کو اپنے وجود سے شرف بخشا اور نسل انسانی کو اپنی خصوصیات سے امتیاز دیا۔

مولوی سمیع اللہ خاں کے حالات میں آپ نے پڑھا ہوگا، اٹھارہ برس کی عمر میں معقول و منقول کے عالم بن کر مسندِ علم کے وارث قرار پائے اور خود درس دینا شروع کیا حصولِ علومِ دینی کے بائیس برس بعد قانونی تعلیم پر توجہ کی تو اپنے زمانہ کے مشہور مقنّن ثابت ہوئے۔ جب وکالت چھوڑی تو ہندوستانیوں میں پہلے وکیل تھے جو صدر الصدوری کے

عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ موجودہ حالات کو نہ دیکھو جس طرح آج ایک ہندوستانی گورنر بنا دیا جاتا ہے جس زمانہ کا یہ ذکر ہے ان دقتوں میں صدر الصدوری کا عہدہ ملنا گورنری سے کچھ کم مشکل نہ تھا، بالآخر سشن جج کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے، ایک طرف باوقار حاکم تھے تو دوسری طرف عالمِ باعمل صاحبِ تصنیف و تالیف اور سب سے بڑھ کر قوم کے خادم اور مدرستہ العلوم علی گڑھ کے بانیوں میں سے " دو میں کے ایک"۔

نواب محسن الملک غریب گھر میں پیدا ہوئے نشو و نما بھی غربت میں ہوا، ان کی پرجمال اور پرجلال شخصیت اور ان کی عالمانہ خصوصیات زندگی پر نظر کرو عمر کا بڑا حصّہ خدمتِ خلق میں بسر ہوا جن کی موت پر زمانہ ہر دور میں نوحہ کریگا اور جن کا نام ہمیشہ عزت اور ادب کے ساتھ لیا جاویگا۔

نواب عماد الملک سترہ برس کی عمر میں جو طالب علمی کا معمولی زمانہ ہے علوم مشرقی اور مغربی کے علاّمۂ یگانہ اور وحید عصر تسلیم کیئے گئے۔ بیاسی برس کی عمر پائی۔ اللہ اللہ مطالعہ کا یہ شوق کہ مرتے مرگئے اور کتاب آخر دم تک ہات سے نہ چھوٹی۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی اٹھارہ برس کی عمر میں انگریزی کے نامور ادیب فارسی، عربی کے فاضل روزگار قانون کے پتلے، ہائی کورٹ کلکتہ کے زبردست جج بن کر اُٹھے، بہ حیثیت مصنف اور اعلیٰ درجہ کے مؤرخ اسلام ہونے کے تاریخ اسلام پر جو ان کا احسان ہے وہ دنیا پر آشکارا ہے، جن کے نور علم نے مشرق سے نکل کر مغرب تک میں اپنی روشنی پھیلائی۔

حالی کی بانسری نے دنیا کو ہلا دیا۔ اب ایسے ملک الشعرا نامور ادیب پاکباز اور پاک باطن، مجسم نیکی اور خیر و برکت کی صورتِ ظاہری کہاں ہاں یہ برکت بھی کچھ کم

نہیں کہ رہرووں کے لیۓ نقشِ قدم چھوڑ گئے ہیں۔

نواب محمد اسحاق خاں کے حالات میں استاد کے ادب و احترام کا واقعہ دیکھو جو کل تک بہ حیثیت آنریری سکرٹری مدرستہ العلوم علی گڑھ اہم قومی خدمت میں مصروف نظر آتے تھے انھیں حالات میں اپنے نامور باپ کے دوست اور یار کی عزت و احترام کا واقعہ بھی کچھ کم سبق آموز نہیں۔ آج نہ یار ہیں اور نہ یاریاں، استادی شاگردی کے تعلقات کا رکھ رکھاؤ معلوم۔

مولوی حشمت اللہ! پندرہ برس کی عمر میں فارسی عربی کے فارغ التحصیل طلبہ میں شمار ہوتے ہیں، پندرہ برس کے بعد باوجود انگریزی تعلیم سے نفرت کے محض قومی عصبیت کی بنا پر انگریزی کا شوق کرتے ہیں اور بی اے، ایم اے تک کے امتحانات آنرز کے ساتھ پیہم پاس کرتے چلے جاتے ہیں، شوق علم کا مطالعہ کرنا ہو تو بستی سے گورکھپور تک کے سفرِ اونٹ گاڑی کا واقعہ بھی کچھ کم ہمت افزا نہیں۔

منشی امتیاز علی خاں کاکوروی، مولوی سر رحیم بخش معمولی علم کے ساتھ حلقۂ درس سے اٹھتے ہیں اور معمولی نوکریوں سے وزارت کے درجوں پر پہونچتے ہیں۔ لیکن قومی خدمت کا نصب العین جو شروع زندگی سے مقصدِ حیات تھا وہ اپنی اپنی جگہ پر ہمیشہ موجود رہا اور رہے **مسٹر عبداللہ** ابن یوسف علی کا علم و فضل، **نواب حیدر نواز جنگ** کا تبحر فضیلت، **جسٹس شاہ دین** کی کمال اصابت رائے، ان کا پختہ علم، ذوقِ سخن خصوصی کیرکٹر، **سر ابراہیم رحمت اللہ** کا پُروقار نتیجہ خیز عملی علم، مدبرانہ عزم و ارادہ، **سر عبدالقیوم** سراپا حسنِ تدبیر بانیٔ پشاور کالج **صاحبزادہ آفتاب احمد خاں** کی پختہ سیرت، قومی تعلیم سے شیفتگی، علی گڑھ تحریک میں انہماک، اس کی ترقی میں والہانہ اور پرحوصلہ عزم

یہ وہ نقوش ہیں جو اس ماحول میں اُبھرے اور نظر فریب عالم ہوئے۔

سر آغا خاں، مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں شہزادگی میں پلے بڑھے لیکن قومی خلش عیش و عشرت کے خلوت کدوں میں بھی ہمیشہ دمساز رہی۔ ہمارے نوجوان طلبہ کا فرض ہے کہ وہ ان سانچوں پر نظر رکھیں جن میں ڈھلنے سے سیرت میں پختگی، خیالات میں وسعت پیدا ہو کر قوم کی دماغی شگفتگی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ پیکرِ عمل بن کر اس ملک کے دیگر قابل افراد کے مقابلہ میں اپنے علمی، اخلاقی، مادی وقار کو قایم رکھ کر توازن قوت برابر رکھنے کی سرگرم کوشش کریں، یہی سبق ہم کو "خطباتِ عالیہ" سے ملتا ہے۔

زندہ قوموں کے نامور خطیب جب اپنی قوموں کو کسی قسم کی اصلاح کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو پُرجذبات اور پُرحوصلہ اقوام ان کے ایک ایک لفظ کو نہ محض سُنتی یا دیکھتی ہیں بلکہ سرِ اطاعت جھکا کر ساری کی ساری قومیں کامیاب راہوں کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں، نتیجہ میں وہ منزلِ مقصود پر پہونچ جاتی ہیں اور شاہدِ رعنا سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔

ایک اور خیال بھی دل سے لگا ہوا ہے وہ یہ کہ چہل سالہ کانفرنس کی زندگی اور اس کے نتایج پر تاریخانہ واقعات کے سلسلہ میں تبصرہ پیش ہوتا، کانفرنس کی کوششوں سے مسلمانانِ ہندوستان کی ذہنی اور دماغی حالتوں میں جو انقلاب رونما ہوا ہے تعلیمی اور اخلاقی نتایج کے لحاظ سے انھوں نے جو ترقی کی ہے اس پر بحث کر کے قوم کو ماضی کا حال سے مقابلہ کر کے استقبال پر روشنی ڈالی جاتی۔ ظاہر ہے کہ خطباتِ عالیہ اور "تصویرِ حیات" دونوں کاموں کے لئے میرا ہاتھ پاؤں مارنا میری لیاقت اور طاقت سے باہر بات تھی، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ "گاتے گاتے کلاونت ہوتے ہیں" کانفرنس کے سلسلہ میں منسلک ہوئے پچیس برس ہوئے اور گو یہ چوتھائی صدی کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا یہ حصّہ چشم زدن میں گزر گیا۔ عمروں کا قصہ، برسوں اور

قرنوں کا افسانہ ہے۔ اسی زمانہ میں مسلمانان ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ہند کی اسلامی دنیا میں انقلابِ عظیم ہوا۔ خود ہندوستان تعلیمی، سیاسی، اقتصادی حالات کے لحاظ سے کچھ کا کچھ ہو گیا۔ خیالات قدیما ورجدیدہ کے رہبروں کی ایسی پاک صورتیں اورصحبتیں دیکھنے میں آئیں جو اب خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کے طفیل میں مسلم جلسوں کی ہنگامہ آرائیاں سامنے سے گزریں جن میں جوش ولولے، اور دل کی اُمنگیں قدم قدم پر موجود تھیں۔ اسی بہانے سے عمر کا کافی حصہ ملک (اور بیرون ملک) کے دُور دراز مقامات کی گردش میں بسر ہوا۔ قوم کے تمدن و معاشرت کے مختلف نمونے نظروں سے گزرے، ان کی اخلاقی، علمی، مذہبی حالت کے سمیں دیکھے، انکی کاروباری منڈیوں میں بھی گزر ہوا، جہالت، فلاکت اور بے سروسامانی کی منزلوں میں بھی پھیری لگائی، غرض انھیں وجوہ واسباب کی بنا پر نہ کہ تاریخ نگاری اور وقائع نویسی کی حیثیت سے دیکھی بھالی باتوں سُنے سنائے حالات کی بنا پر چند سادہ اور سفید کاغذ کے تختوں کو سیاہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، اگر وقت نے ساتھ دیا اور زمانہ نے سازگاری کی تو کیا عجب کہ "تصویرِ حیات" کی صورت بھی نقش پذیر ہو کر منظرِ عام پر آجائے ؎

غرض نقشیست کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے

خاکسار سراپا گنہگار

انوار احمدؐ (مارہروی)



شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین 'حالی'
صدر اجلاس بست و یکم (کراچی سنہ ۱۹۰۷ ع)

اجلاس بست ویکم

منعقدہ کراچی ۱۹۰۷ء

شمس العلما خواجہ الطاف حسین (حالی)، صدر اجلاس کانفرنس

حالات صدر

سات سو برس سے پانی پت میں قبیلہ انصار کی ایک شاخ آباد چلی آتی ہے جس کے مورث اعلیٰ خواجہ ملک علی سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے تھے سلطان زماں نے خواجہ کے شرافت نفس کا پورا پورا احترام کرکے پرگنہ پانی پت میں عمدہ اور سیر حاصل دیہات بطور مدد معاش عنایت کرکے پانی پت کے منصب قضا و تولیت مزارات ائمہ کے اعزازات میں جو نواح پانی پت میں واقع ہیں شیخ کو عنایت کر دیئے تھے۔

خواجہ حالی انہیں خواجہ ملک علی کی اولاد اور اسی انصاری خاندان کے سپوت فرزند تھے جن کے نام نامی کو سرزمین ہند صدیوں تک عزت، محبت اور نیکی کے ساتھ یاد رکھے گی آپ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے آٹھ نو برس کی عمر میں ماں باپ دونوں نے یکے بعد دیگرے رحلت اختیار کی بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے باپ کی طرح شفقت کرکے پالا پوسا جب اس قابل ہوئے کہ مکتب میں پڑھنے کو بیٹھیں تو سب سے پہلے کلام مجید حفظ کرایا گیا وہ شروع سے پڑھنے والے شوقین لڑکے تھے اور اُن کے دل میں پڑھنے کی اُمنگ اور خواہش ابتدائے تعلیم کے وقت سے پائی جاتی تھی لیکن اتفاقات وقت کے لحاظ سے ان کو باقاعدہ طور پر مسلسل طریقہ پر اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا پڑھا اپنی طبیعت کے شوق اور دل کی اُمنگ سے

کلام مجید حفظ کرنے کے بعد سید جعفر علی سے جو ایک مشہور فارسی داں میانجی تھے اُنھوں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر عربی کا شوق ہوا تو مجتہد حاجی ابراہیم حسین انصاری سے صرف و نحو پڑھی۔ اسی زمانہ میں سترہ برس کی عمر میں بھائی اور بہن کے اصرار سے شادی کرنے پر مجبور ہوئے اور پڑھنا لکھنا چھوٹ گیا گھر والوں کی خواہش تھی کہ اب یہ کہیں نوکری کریں بجائے اس کے کہ یہ نوکری تلاش کرتے گھر والوں سے چھپ کر سیدھے دلّی پہنچے اور مولوی نوازش علی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرکے پڑھنے میں مصروف ہوگئے مولوی نوازش علی مشہور واعظ اور بہترین معلم تھے ڈیڑھ برس تک دلّی میں قیام رہا اور اس عرصہ میں صرف و نحو اور منطق کی کتابوں کا مولوی صاحب مذکور سے درس لیا۔ ان دنوں دہلی کالج بڑی رونق پر تھا لیکن مولانا نے اس کالج سے کچھ استفادہ حاصل نہیں کیا چنانچہ وہ خود اپنی سرگزشت نوشتۂ خود میں تحریر فرماتے ہیں: "جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا انگریزی تعلیم کا خاص کر قصبہ پانی پت میں اول تو کہیں ذکر سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے کہتے تھے دلّی پہنچکر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتوں کو محض جاہل سمجھتے تھے غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے کبھی جا کر ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاءاللہ مولوی نذیر احمد مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی ضیاءالدین وغیرہ وغیرہ۔"

ہنوز سلسلہ تعلیم پختہ نہ ہونے پایا تھا کہ اعزہ نے ۱۸۵۵ء میں پھر اُن کو پانی پت واپس جانے پر مجبور کیا جس کے بعد ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کی کلکٹری میں وہ کسی اسامی پر مقرر ہوگئے اس تقرر کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا فتنہ اُٹھا اور فتنہ بغاوت نے ہندوستان کو تہ و بالا کرنا شروع کر دیا حصار سے انگریزی عملداری جاتی رہی تھی خواجہ حالی حصار سے وطن پہنچے اور پھر چار برس تک کہیں باہر نہیں نکلے اس زمانے میں پڑھنے کا شوق پھر اُبھرا اور پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن مولوی محب اللہ مولوی صفدر علی وغیرہ سے علوم منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر کے درس لیتے رہے اتفاق سے جب ان کے اساتذۂ فن میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا

تو مطالعہ کتب سے اپنی استعداد بڑھاتے رہتے تھے ادب کی کتابیں لغت اور شرح کی مدد سے دیکھتے تھے اور جو وقت اور موقع ملتا تھا وہ اسی شوق اور اسی فکر میں بسر ہوتا تھا۔ پانی پت کے علاوہ ان کی تعلیم کا کافی زمانہ دہلی کے قیام میں گزرا گو اب کمال کے لحاظ سے ان کی دہلی برباد ہو چکی تھی تاہم کاروانِ گزشتہ کے ابھی نقش قدم باقی تھے حالی نے اسی ڈگر پر چل کر منزلِ ہستی کو طے کرنے کی کوشش کی۔ جب ۵۵ء دہلی میں طالب علم تھے انھوں نے نواب مرزا نوشہ المعروف بہ غالب کو قلعۂ معلّٰی کے دیوان عام کی مجالسِ مشاعرہ میں غزلیں پڑھتے دیکھا اور ان کے کلام کو ان کی زبان سے سنا تھا غالب کے اُردو اور فارسی کے اکثر اشعار کے معنی جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھے خود غالب سے پوچھ کر ان کے حل کرنے کی کوشش کی تھی قصائد غالب کے چند اسباق خود مرزا نے حالی کو پڑھائے تھے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں ان کی (غالب) عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو اُنھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔

شاعری ان کی فطرت میں داخل تھی سوسائٹی کے اثر نے مجالس مشاعرہ کی شرکت نے جذباتِ فطرت کو جنبش دے کر اُبھارا اس وقت ان کی عمر تیس برس کی تھی کہ غدر کے بعد معاش کی تلاش میں پھر دلی آئے آتے ہی نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس دلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد سے ان کی ملاقات ہوگئی اور بہ سلسلہ مصاحبت نواب صاحب کی سرکار سے تعلق پیدا ہوگیا جو سات آٹھ برس تک قایم رہا۔ نواب مصطفٰے خاں بڑی آن بان اور قابلیت کے جامع صفات رئیس ہونے کے علاوہ بلند پایہ عالم، صوفی باصفا، عابد و زاہد اور ایسے نامی شاعر تھے کہ غالب تک کو یہ آرزو رہتی تھی کہ وہ ان کے کلام کی داد دیں ایک موقع پر کہتے ہیں۔ ؎

غالب بہ فن گفتگو ناز د بدین ارزش کہ او   ننوشت در دیوان غزل تا مصطفٰے خاں خوش نکرد

جہانگیر آباد کے قیام اور نواب شیفتہ کی مصاحبت نے نہ صرف ان کے جذبات شاعری کو متحرک کر کے شعر گوئی کی طرف پورے طور سے مائل کر دیا بلکہ ان کے وہاں پہنچ جانے سے نواب صاحب کا ذوق شاعری جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا مولانا حالی کہتے ہیں کہ "جہانگیر آباد سے میں اپنا کلام دلی مرزا صاحب کی اصلاح و توجہ کے لئے بھیجتا رہتا تھا لیکن میرے شاعرانہ مذاق کی اصلاح زیادہ تر نواب

مصطفٰی خاں کی صحبت اور مذاق سخن سے وابستہ ہے جو مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے"۔

جہانگیر آباد کے قیام کا تعلق نواب صاحب کی زندگی بھر قایم رہا جو ۱۸۶۳ء سے شروع ہو کر ۱۸۷۱ء تک ختم ہو گیا۔

بعد ازاں لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں اُنھوں نے نوکری کی۔ کام یہ تھا کہ جن کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں یہ ان کی عبارت درست کریں تقریباً چار برس تک اس خدمت پر مامور رہے جس کی وجہ سے انگریزی لٹریچر نے ان کی طبیعت پر خاص ذوق اور اثر پیدا کیا مجاز سے حقیقت کی طرف طبیعت مائل ہو گئی فارسی شاعری اور مشرقی مبالغہ کی وقعت دل سے جاتی رہی۔

اُنھوں نے ایسے زمانہ میں آنکھ کھولی تھی جب قوم میں نکبت، افلاس، مایوسی اور جہل کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں قدیم تہذیب و شائستگی کے جو نشان نظر آتے تھے وہ بھی مٹ رہے تھے حکومت و ثروت قوم سے کنارہ کر چکی تھی۔ عام جہالت، رسومات ناپسندیدہ اور عالمگیر توہمات مبتذل اخلاق نے ساری قوم کو جکڑ رکھا تھا ان حالات روح فرسا کی وجہ سے حقیقت شناس طبیعت کے اندر ہی اندر سوز و گداز کا جو پھوڑا پک رہا تھا تھوڑا زمانہ گزرنے کے بعد بالآخر شاعری کی لے میں پھوٹا اور ایسا ناسور بن کر بہا جو آخر زندگی تک رسنے سے نہ تھما۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا۔

اس زمانہ میں سر سیّد احمد خاں مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی سر سید نے مسلمانوں کے اسبابِ زوال پر نظم لکھنے کی ان سے فرمایش کی اس فرمایش نے اُس آگ کو مشتعل کر دیا جو اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی قدیم طرز کی شاعری سے ان کا دل افسردہ ہو چکا تھا طرزِ نو کی صورت میں قومی مصیبت کی آہِ سوزاں "مسدس حالی" کی شکل میں دُھواں بن کر نکلی جس نے نیم جان اور بے حس قلوب کو چونکا دیا۔

سر سید کو جب اُنھوں نے مسدس کی کچھ جلدیں بطور ہدیہ بھیجیں تو اُنھوں نے رسید اور شکریہ کا خط لکھا جس کے چند فقرے اور جملے ایسے ہیں جن کا بیان قلم بند کرنا اس لئے ضروری ہے کہ گو اب یہ واقعات پرانی کہانیاں ہیں پھر بھی اس مزے کی کہانی ہے کہ جب اور جس وقت بھی دُہرائی جاتی ہے نیا مزہ اور کیف دے جاتی ہے۔



سرسید لکھتے ہیں
جس وقت کتاب ہاتھ میں لی جب تک ختم نہ ہوئی ہات سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔

دوسرے جملے میں کہتے ہیں۔

میری نسبت جو اشارہ اس نظم میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف ان ہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے، بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالیؔ سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"۔

خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے، مسجدوں کے اماموں کو چاہئے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔

تیسرے جملے میں ارقام فرماتے ہیں

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے اور رجسٹری کرا دی جاوے۔ دل سے شکر ادا کرتا ہوں، مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔

میرا دل تو چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں۔ مگر وہ رنڈیاں مسدس گاتی ہوں۔

بظاہر مختصر لیکن اس بڑی تصنیف کی تعریف جس اختصار کے ساتھ اس زمانہ کے مصلح اعظم سرسید نے کی ہے، کیا بڑے سے بڑا قادر الکلام، منشی، انشا پرداز اور خطیب اس سے زیادہ اور حقیقی صنعت کے لحاظ سے بجا طور پر موزوں اور فصیح و بلیغ الفاظ استعمال کر سکتا ہے، ایک سچا اثر تھا ایک واقعی وجدان تھا، ایک قلبی کیفیت تھی جو دل سے اُٹھی اور دل ہی میں اُتر گئی۔ گذشتہ صدی کے بڑے سے بڑے عالم اور فاضل کی کسی تصنیف کو یہ قبول عام اب تک حاصل نہیں ہوا جو "مسدس حالی" نے حاصل کیا۔ مختلف ایڈیشن ادھر چھپے اور لاکھوں کی تعداد میں اُدھر بکے، اُنھوں نے اس نظم کے علاوہ بہت سی دل نشین اور پُر اثر نظمیں قومی مجالس کے لئے لکھیں اور بالخصوص

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں پڑھی گئیں جو اپنے اثر، اسلوب بیان اور حقائق و معرفت کے مختلف پہلوؤں پر واردات حالیہ کو بیان کرتے ہوئے لوگوں کے قلوب پر حیرت انگیز اثر پیدا کرتی ہیں وہ نہ صرف ایک باکمال شاعر تھے جو اپنے کمال فصاحت و بلاغت اور فطری شاعری کی بنا پر لوگوں کے دلوں کو گرماتے تھے بلکہ وہ خوش مقال ناثر بھی تھے ان کا تمام سراپا حسن عمل، نیکی اور ہمدردی کی تصویر تھا۔ ان کی نظم و نثر کیا بہ لحاظ اپنے الفاظ کے اور کیا بہ اعتبار اپنی معنوی خوبیوں کے بلاشبہ پُراثر اور پُرحکمت سمجھی جاتی تھی اور سمجھی جاتی ہے ایک سوانح نگار کی حیثیت سے بھی ان کی موشگافیاں اور تحقیق و تدقیق کا درجہ بہت اونچا نظر آتا ہے اس سلسلہ میں حیات سعدی، حیات جاوید، عرصہ دراز تک قابل مطالعہ رہیں گی ان کی مشہور عالم شاعری اور حکمت آموز کلام نے ان کی زندگی میں لاکھوں زبانوں نے ان کو شکسپیر ہند اور سعدی ہند کے خطاب سے مخاطب کیا۔ ۱۸۶۷ء میں اُنھوں نے سب سے پہلے کتاب تریاق مسموم ایک نیو کرسچیئن کی کتاب کے جواب میں لکھی تھی دوسری کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصّہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النسا لکھی جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایجوکیشنل دربار مقام دہلی میں لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے مولانا کو چارسو روپیہ کا انعام دلوایا تھا۔ جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدتوں جاری رہی۔

ان کی بعض تصانیف کے غالب ترجمہ کے ذریعہ سے مختلف زبانوں میں ڈھالے گئے وہ زبردست مصنف زبردست شاعر زبردست زباں دان اور عالم و فاضل ہونے کے علاوہ سیرت اور اخلاق کے لحاظ سے سراپا نیکی اور بنی نوع انسان کے لئے ہمدردی اور برکت کا نمونہ تھے۔ آج ہماری یونیورسٹیاں کہیں برسوں میں جاکر تعلیم و تربیت کا جو مفید نتیجہ پیدا کرتی ہیں اُن کی چند روزہ ملاقات اور ہم نشینی یک صحیح الفطرت آدمی کو آدمی بنانے کے لئے کافی تھی۔

اس عاجز (انوار احمد) ترتیب کنندہ اوراق ہذا کو خوش بختی سے تین مرتبہ ایسا موقع ملا ہے کہ اس محترم اور مقدس ہستی کے لطف و کرم کا دو مرتبہ پانی پت میں اور تیسری بار لکھنؤ کے قیام میں مزا لے چکا ہے۔

مدتیں اور برس کے برس گذرنے پر بھی آج ان ملاقاتوں اور عنایتوں کی یاد دل سے محو نہیں ہوئی، سیرت اور اخلاق صحیح کا اصلی رنگ اب کہاں ہے جو نئے خاکے تیار ہوں اب تو ایک رنگ آتا اور دوسرا جاتا ہے۔ جاڑے کا موسم غالباً آخر نومبر یا شروع دسمبر ہے صبح کا وقت ہے کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے مولانا پلنگڑی کے قریب گدے یا نمدے کے فرش پر دگلہ پہنے کنٹوپ اوڑھے

بیٹھے ہیں سامنے مٹی کی چھوٹی سی انگیٹھی سُلگ رہی ہے حقہ لگا ہوا ہے میں پاس بیٹھا ہوں سامنے مولوی خواجہ سجاد حسین صاحب بی۔ اے اسسٹنٹ انسپکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب جو مولانا کے چھوٹے صاحبزادے ہیں تشریف فرما ہیں اتنے میں مولانا نے نوکر کا نام لے کر آواز دی اتفاق سے وہ نہ بولا غیر حاضر تھا مولانا دو آوازیں دے کر خاموش ہو رہے۔ خواجہ صاحب نے باادب دریافت کیا کیا ارشاد ہے؟ جواب میں فرمایا چوکی پر جاتے، یہ سن کر خواجہ صاحب نے سامنے سے حقہ اُٹھا کر پاخانہ میں رکھا پھر لوٹے میں پانی بھرا وہ پہنچایا دونوں چیزیں رکھ کر اطلاع کی کہ پانی تیار ہے مولانا اُٹھے اور داخل بیت الخلا ہوئے چونکہ دائمی قبض کی وجہ سے چوکی پر حقہ پینے کی عادت ہو گئی تھی معمول کے خلاف دیر میں باہر آئے جتنی دیر وہ اندر رہے خواجہ صاحب صحن میں ٹہلتے رہے بعد انفراغ جب حقہ اپنی جگہ پر اور آفتابہ اپنی جگہ پر پہنچا دیا اس کے بعد اسی طرح سے اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے میں حیرت زدہ اس حالت کو دیکھ رہا تھا خواجہ صاحب کی تل چانولی ڈاڑھی بی۔ اے تک مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تعلیم ذمہ داری کے معزز عہدہ پر مامور، اور پھر یہ ادب و فرض شناسی سعادت و اقبال مندی کے ان جواہر پاروں سے اب تو ہماری یونیورسٹیوں کے ایوان و قصور بیشتر خالی پڑے ہیں ان کی آبادی ہو تو کیسے ہو۔

حالی غریب آدمی تھے ۱۸۸۶ء میں نواب وقار الامرا بہادر مدار المہام حیدرآباد کی توجہ سے جبکہ وہ علی گڑھ میں رونق افروز ہوئے تھے اور اس موقع پر سرسید نے خواجہ حالی کا تعارف نواب ممدوح سے پہلی مرتبہ کرایا تھا اُن کا علمی وظیفہ پہلے پچھتر روپیہ اور پھر سو روپیہ سکہ حالی ریاست حیدرآباد سے مقرر ہو گیا تھا۔ چونکہ ان کی طبیعت حرص و ہوس سے بالاتر تھی ادھر وظیفہ ہوا اُدھر وہ ملازمت کے خیال سے بے نیاز تھے چنانچہ دہلی اسکول کی مدرسی سے وظیفہ یاب ہو کر فوراً قطع تعلق کر لیا۔ اب ان کی عمر کا گراں مایہ حصہ بہ فراغت تمام تصنیف و تالیف اور مطالعہ کتب میں بسر ہونے لگا۔ باوصف عدم فارغ البالی کے وہ نہایت فیاض طبیعت، مہمان نواز، دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر جلد متاثر ہو جانے والے تھے، ان کا دست کرم ہمیشہ غریب طلبہ کی امداد کے لئے کشادہ رہتا تھا اُنھوں نے شروع سے اپنے خاندان کے لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی جنھوں نے علوم جدیدہ کو کامیابی اور شہرت کے ساتھ حاصل کیا اور جس تعلیم و تربیت کے ثمر خواجہ سجاد حسین بی۔ اے خواجہ غلام الثقلین بی اے خواجہ تصدق حسین بی اے خواجہ غلام الحسنین کی صورت اور سیرت میں حاصل ہوئے۔ وہ مدرسۃ العلوم کے قدیم ٹرسٹی تھے بوجہ دولت مند نہ ہونے کے وہ بڑے

چندوں سے کالج کی مدد نہیں کر سکتے تھے تاہم جو اُن سے بن پڑتا تھا دامے درمے ہر موقع پر آمادہ رہتے تھے۔ رہی قدمے اور سخنے کی امداد تو اس لحاظ سے بھی ان کی خدماتِ قومی مستغنی عن البیان ہیں اُنھوں نے اپنے بہترین خصائل اور اخلاقی پرتو سے اپنی زبردست شاعری سے اپنی بیش بہا تصانیف کے حق سے قوم کے خیالات کی اصلاح کی اس میں قومی خدمت کا صحیح طور پر احساس پیدا کرنے کی ایسی کوشش بلیغ کی جس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا وہ حد درجے کے مقبول عام مصنف تھے ان کی کتابیں ہاتوں ہات بکتی تھیں لیکن اُنھوں نے باوجود ضرورت مند ہونے کے کبھی تالیف و تصنیف کو اپنا ذریعہ معاش نہ بنایا ان کی تصانیف وقف عام رہیں جس نے چاہا چھاپا اور ہزارہا کا نفع حاصل کیا بعض تصانیف کا حق تصنیف مدرسۃ العلوم کے حق میں اور دیگر قومی درس گاہوں کو دیا۔ برخلاف اُن کے اُن ہی کے زمانہ کے اکثر اہل قلم اپنی تالیف و تصنیف کی بدولت امیر بن گئے وہ علی گڑھ کے علاوہ جس جگہ قومی بھلائی کا کام کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھتے تھے وہ ان کے دوست اور مددگار بن جاتے تھے۔

قومی تعلیم کی فکر نے انھیں اپنے وطن پانی پت میں ایک اسکول قایم کرنے کا خیال پیدا کیا یہ اسکول ۱۸۹۰ء میں مڈل کے درجے تک کھولا گیا جو اب "حالی مسلم ہائی اسکول" کے نام سے قایم ہے اور جس کے سیکرٹری مولانا کے خلف اصغر خواجہ سجاد حسین صاحب بی۔اے ہیں۔ مولانا حالی کو طبقہ ذکور کے تعلیمی شغف کے ساتھ صنف نازک کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص اہتمام مدنظر تھا چنانچہ پانی پت میں ۱۸۹۵ء میں زنانہ مدرسہ قایم کر کے اس کی بذات خود نگرانی اپنے ہاتھ میں رکھی اُنھوں نے تعلیم و تربیتِ نسواں کے متعلق وقتاً فوقتاً نہایت پُراثر اور دل گداز نظمیں لکھیں اور اس ذریعہ سے قوم میں عورتوں کا درجہ بلند کرنے کی کوشش کی، اور ان کے ذریعہ سے ان کی عمدہ تعلیم و تربیت کو قومی خصلت اور ترقی کی بنیاد ثابت کیا۔

وہ ایک ایسے واعظ اور شفیق ناصح تھے جن کی نصیحت میں بجز شیرینی کے تلخی کا نام نہ تھا بڑے بڑے شعرا کا کلام مدح اور ذم کے اعتدال سے گزر گیا ہے اُنھوں نے بھی کبھی کبھی بڑے بڑے امرا اور عالی مرتبت لوگوں کی تعریف میں قصیدے کہے ہیں لیکن ان کے قصائد و محامد میں اُنھوں نے جن خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے یہ خیالات نہ متقدمین کے کلام میں پائے جاتے ہیں نہ متاخرین کے۔ اعلیٰ حضرت نظام الملک میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ جب سریر آرائے مسند دولت و اقبال ہوئے تو مولانا نے بھی ایک نظمِ تہنیت ترتیب دی

جس کے چند شعر اس قابل ہیں کہ وہ ناظرین خطبات کی دلچسپی کے لئے یہاں نقل کئے جاویں۔ فرماتے ہیں !

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں — مبارک تمھیں مسندِ شہریاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل — جہاں چپّے چپّے پہ ہے ذمہ داری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو — جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
اب ان کی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا — خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہیں دینا ہے ان کو سہارا — جو بے یار ہیں اُن کی کرنی ہے یاری
نکمے جو ہیں اُن کو کامی بنانا — بڑھانا دل ان کے جو ہیں کاروباری
جگانا اُنھیں نیند کے جو ہیں ماتے — پڑھانا اُنھیں علم سے جو ہیں عاری

نظم کیا ہے امید، آرزو اور جذبۂ صادق کے ٹکڑے ہیں جو بے ساختہ نظم کی شکل میں کلیجے سے صفحہ کاغذ پر نکل پڑے ہیں۔

تاثیر نے ہمت کے قدم لئے جو امید ملت بیضاء کے کمن سال ہمدرد قوم نے قوم کی سب سے پر عظمت ہستی سے باندھی تھی دنیا نے دیکھا اور دیکھ رہی ہے کہ اعلیٰ حضرت کی توجہ گرامی سے نہال آرزو پھول کر کیسا کچھ بار آور ہو رہا ہے۔

عزت و جاہ کی خواہش سے وہ مستغنی تھے تاہم ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ نے ان کی علمی خدمات کے سلسلہ میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا اور قوم کی طرف سے ان کے حبِ قومی اور عالمانہ شان کا احترام اس شکل میں کیا گیا کہ وہ اجلاس کراچی کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء کے پریسیڈنٹ نواب وقار الملک کے زمانہ سیکرٹری شپ میں بنائے گئے اجلاس کانفرنس کے خطبات میں یہ خطبہ بہ لحاظ خیالات اظہار رائے ایسی چیز ہے جس کا مطالعہ دلچسپی اور کیفیت سے خالی نہیں۔

آخر عمر میں کئی سال سے صحت خراب ہو گئی تھی ضعف و نقاہت کا سلسلہ ترقی کرتا جاتا تھا بالخصوص ممالک اسلامیہ کے انحطاط نے اور جنگ طرابلس کے واقعات نے ان کو بہت پژمردہ کر دیا تھا بالآخر ۱۳؍ دسمبر ۱۹۱۴ء کو حسن عمل کا آفتاب کمال ستتر برس کی عمر میں ڈھل کر حضرت شاہ بو علی قلندر کی درگاہ میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

ان کے حالات زندگی ہمیں بتاتے ہیں کہ ناداری، تنگ دستی زمانہ کی ناسازگاری غرض مشکلات کی کوئی شان بھی ان کے عزم استقلال اور کسب فضائل کی خواہش میں اُن کے سدِ راہ

نہ ہوئی گوناگوں مصائب کی موجودگی میں زندگی کی دشوار گزار منزل کو جس کامیابی کے ساتھ اُنھوں نے طے کیا اور اپنے اعلیٰ اخلاق بیش بہا خصائل بے مثال جامعیت اور رہ نما سیرت کا جو قابل عمل نمونہ ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ ہر سمجھ دار کے لئے سبق آموز ہے۔

نوٹ۔ خواجہ حالی مرحوم کے حالات خود مرحوم کے لکھے ہوئے حالات سے ماخوذ ہیں جو سب سے پہلے کانفرنس گزٹ جلد نمبر ۲ سنہ ۱۹۲۰ء میں تذکرہ حالی کے عنوان سے شائع ہوئے بعض حالات خاکسارِ جامع کے مشاہدات میں سے ہیں۔

خطبۂ صدارت

حضرات! جو عزت کہ آج مجھ کو آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا پریسیڈنٹ بنانے سے دی گئی ہے جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا خیال میں نہیں آتی کہ چونکہ سندھ میں انگریزی تعلیم گویا بالکل مفقود ہے اس لئے شاید یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس موقعہ پر صدر انجمن ایسے شخص کو بنایا جائے جو انگریزی کا ایک حرف تک نہ جانتا ہو۔ ورنہ میں اپنے تئیں ہرگز اس جلیل القدر منصب کے لایق نہیں سمجھتا۔ لیکن ہر حال میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور خاص کر اُن عنایت آمیز الفاظ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جو جناب ینگ ہسبنڈ صاحب کمشنر سندھ نے اپنی اسپیچ میں مجھ ناچیز کی نسبت ارشاد فرمائے ہیں۔ اس کے بعد میں نہایت ادب سے تمام حاضرین کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اس عظیم الشان خدمت کے فرائض ادا کرنے میں جو فروگذاشت یا کوتاہی میری کم لیاقتی کے سبب ظہور میں آئے اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمانی چاہیئے۔ اور میری صدر انجمنی کو اُن اعلیٰ درجہ اور عالی مقام بزرگوں کی صدارت کے پیمانے سے نہ جانچا جائے۔ جو گزشتہ اجلاسوں میں اس معزز کرسی پر جلوس فرما چکے ہیں۔

صاحبو! پہلے اس سے کہ کانفرنس کے اصلی مقصد کے متعلق کچھ بیان کیا جائے میں چند الفاظ اس دردناک واقعہ کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں جس سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو عموماً اور محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کو خصوصاً نہایت سخت صدمہ پہنچا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ مرحوم سر سید احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں بعد قیام مدرستہ العلوم علی گڑھ اس کانفرنس کی نبیاد اس لئے ڈالی تھی کہ اس کے ذریعہ سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی منادی کی جائے۔ چنانچہ اس مرحوم و مغفور نے باوجود کبرسنی اور طرح طرح کے موانع اور معذوریوں کے جس طرح اول کالج کے لئے لمبے لمبے سفر کئے، اسی طرح ملک کے مختلف مقامات میں خود پہنچکر کانفرنس کے اجلاس منعقد کرائے اور ایک حد تک تعلیم کی منادی اطراف و جوانب میں کرکے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ لیکن اس مرحوم کی زندگی میں کانفرنس کا اثر صرف پنجاب اور ممالک متحدہ کے چند خاص خاص شہروں میں محدود رہا۔ مگر اُن کی وفات کے بعد جب تمام قوم پر مایوسی چھائی ہوئی تھی اور کالج اور کانفرنس بلکہ تمام قومی کاموں کی طرف سے مختلف کئی قسم کے تردد آمیز خیالات دلوں میں موجود تھے، خدائے تعالی نے اپنی رحمت کاملہ سے قوم کی کشتی بانی کے لئے ایک ایسے شخص کو کھڑا کر دیا جس نے کالج اور کانفرنس دونوں کے حق میں فی الحقیقت مسیحائی کا کام کیا اور قوم کے مُردہ اور افسردہ دلوں میں از سر نو جان ڈال دی اور پانسو برس بعد لسان الغیب کی یہ بشارت پوری ہوئی کہ ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

اب سب صاحب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس قوم کے مسیحا سے میری کیا مراد ہے خدائے تعالے نواب محسن الملک کو اعلی علیین میں جگہ دے۔ اُنھوں نے کالج اور کانفرنس کو سر سید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صرف اپنی قدیم حالت ہی پر قایم نہیں رکھا۔ بلکہ چند سال کے عرصہ میں دونوں کی بالکل کایا پلیٹ دی اور اُن کو اس درجہ پر پہنچا دیا جو امید و توقع و وہم و گمان سے بالاتر تھا محسن الملک کے عہد میں جو غیر مترقبہ ترقیاں کالج کو نصیب ہوئیں اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے جس کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ مگر جو وسعت اور عام قبولیت کانفرنس کو اُن کی بدولت حاصل ہوئی۔ وہ یہی ایک کارنامہ ہے جو مسلمانوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ہندوستان کا کوئی حصہ (الا ماشاء اللہ) ایسا باقی نہیں رہا جہاں اس جوان مرد کُہن سال کی کوشش اور حُسن تدبیر سے کانفرنس کا قدم نہیں پہنچا۔ کلکتہ۔ مدراس۔ بمبئی۔ اور ڈھاکہ جیسے دور دست مقامات میں پہنچکر اُس نے کانفرنس کے اجلاس نہایت دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کئے اور مسلمانوں کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے عالی ہمتی اور جفاکشی کی ایک مثال قایم کر دی ؎

غُل علم کا برہما میں مچایا جاکر ÷ مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر
واں آبِ حیات اُن کو پلایا جا کر ÷ چھائی ہوئی مُردنی جہان قوم میں تھی

افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہم میں موجود نہیں ہے۔ مگر اُس کی جدائی کا داغ بطورِ قایم مقام کے ہمارے دل میں موجود ہے۔ اور اُس کی یاد نشتر کی طرح ہمارے سینہ میں کھٹک رہی ہے۔ کئی سال سے نواب محسن الملک کی صحت نہایت نازک چلی آتی تھی اور نہایت شدید امراض نے اُن کو مغلوب کرلیا تھا۔ مگر وہ ہر حالت میں برابر قوم کی خدمت کرتے رہے۔ اور بیماریوں سے ہمیشہ لڑتے رہے یہاں تک کہ آن کا وقت آپہنچا اور قوم اُن کی جلیل القدر خدمات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۵

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر — یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر
وہ مُلک کا محسن وہ مسلمانوں کا غمخوار — سر کرکے مہم قوم کی، کام آگیا آخر
سیّد کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اُس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
رہتا تھا زبس قوم کی تقدیر پہ بے کس — لکھا ہوا تقدیر کا پیش آگیا آخر
نکبت کا پتہ ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدر — نکبت کا مقدر کو پتا پا گیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اُس پہ تھے کیا کیا — پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے — وہ خون کے آنسو اُنھیں رُلوا گیا آخر
یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوم کے فدائی — دنیا کو تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر

مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری
کُہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

صاحبو! فی الواقع نواب محسن الملک کا اس وقت دنیا سے اُٹھ جانا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے عموماً اس کانفرنس کے لئے خصوصاً ایک ایسا صدمہ ہے کہ اگر خدا کی مہربانی ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو اُس کی تلافی اِمکان سے خارج تھی۔ مگر میں تمام ممبران کانفرنس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ قوم نے بالاتفاق نواب مرحوم کا جانشین ایک ایسے معزز اور محترم شخص کو منتخب کیا ہے جس کی ذات سے مرحوم کے بعد مسلمانوں کو وہی اُمیدیں ہیں جو سرسید کے بعد نواب محسن الملک مرحوم کی ذات سے تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے تمام اسلامی اخبار تمام اسلامی انجمنوں اور تمام ٹرسٹیان محمدن کالج بغیر کسی استشار کے اس بات پر متفق ہوگئے کہ بجائے نواب

مرحوم کے محمدن کالج اور محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا آنریری سیکرٹری نواب وقارالملک وقارالدولہ بہادر انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین صاحب کو بنایا جائے۔ اور یہ اتفاق اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ انتخاب قوم کے حق میں، کالج کے حق میں، اور کانفرنس کے حق میں خدا کی رحمت ثابت ہوگا۔ کیونکہ مخبر صادق علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ما راٰہ المسلمین حسنا فھو عند اللہ حسن، یعنی تمام مسلمان جس بات کو بہتر سمجھیں وہی خدا کے نزدیک بہتر ہے۔

نواب محسن الملک کی وفات اور اُن کے بعد نواب وقار الملک کی جانشینی پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے۔

عید رمضان آمد و ماہ رمضان رفت
صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

صاحبو! اس ناگزیر تمہید کے بعد میں اصلی مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ آج کا اجلاس جو ملک سندھ کے اس مشہور بندرگاہ میں منعقد ہوا ہے ہماری کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ہے۔ لیکن جو خصوصیت کہ ملک سندھ کو اہل اسلام کی ساتھ ہے اُس کے لحاظ سے یہ ملک اس بات کا مستحق ہے کہ اہل اسلام کی کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس اس ملک میں ہوتا۔ عربی لٹریچر میں جس کثرت سے سندھ کا نام آیا ہے ہندوستان کے کسی دوسرے حصّے کا نام نہیں آتا۔ کیونکہ ہندوستان کے جس حصّہ سے عرب کو سب سے پہلے واقفیت ہوئی وہ یہی ملک سندھ تھا یہی وہ خطّہ ہے کہ جس کو سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے پہلے صدی ہجری کے اخیر میں فتح کر کے یہاں بنی امیہ کی سلطنت کا جھنڈا گاڑا اور گویا کہ مسلمان کشورکشاؤں کے لئے ہندوستان کی آیندہ فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔ یہی وہ ملک ہے جہاں ہندوستان میں سب سے پہلے علمائے اسلام کے حلقۂ درس قائم ہوئے۔ اور فتح کے بعد ایک صدی میں تمام خطہ محدّثین اور فقہا کی کثرت سے عراق و شام کا نمونہ بن گیا۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کو عرب، اصلی وطن سے زیادہ عزیز سمجھنے لگے تھے۔ محمد بن قاسم کے حُسن انتظام اور عمدگی قوانین کی وجہ سے یہ ملک نہ صرف ریگستان ہونے کے لحاظ سے بلکہ دین مذہب مذاق عادات اور اوضاع و اطوار کی حیثیت سے بھی سرزمین عرب کی سچی تصویر بن گیا تھا اور جیسا کہ حال کے ایک مشہور مصنف نے لکھا ہے اس نوجوان فاتح نے چند روز کی حکمرانی میں جو گہرا اور پائدار نقش اہل سندھ کے دلوں پر جما دیا تھا ایسا نقش پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانسو برس میں بھی نہیں جما سکیں۔ مگر افسوس ہے کہ جو حال ہندوستان کے دیگر صوبوں میں مسلمانو

کی غفلت اور بے پروائی کا زمانہ حال کی تعلیم کی طرف سے دیکھا جاتا ہے ویسا ہی بلکہ اُس سے بھی زیادہ سندھ کے مسلمانوں کا حال نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی قیام کانفرنس سے لے کر اب تک جس کو بیس ۲۱ اکیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے کوئی تحریک ملک سندھ کی طرف سے کانفرنس کے مدعو کرنے کے لئے نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے سال گزشتہ میں آنریبل سردار محمد یعقوب خاں مرحوم نے اس باب میں سلسلہ جنبانی کی تھی۔ انھوں نے ایک مختصر رپورٹ مسلمانان سندھ کی تعلیمی حالت کے متعلق قلمبند کر کے آنریری سکرٹری کانفرنس کے پاس بھیجی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی۔ اور اپنی زندگی میں کانفرنس کو یہاں نہ بُلا سکے۔ لیکن وفات کے بعد اُن کے معزز جانشین آنریبل خان بہادر شیخ صادق علی صاحب وزیر مال ریاست خیرپور سندھ نے اس منصوبہ کو جو سردار صاحب مرحوم نے باندھا تھا بہ سرپرستی ہز ہائنس میر صاحب خیرپور سندھ بوجہ احسن پورا کیا ہے جس کا نتیجہ اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

حضرات! اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اطلاع کے لئے۔ سردار صاحب مرحوم کی مذکورہ بالا رپورٹ اور نیز بعض دیگر بہی خواہان قوم کے بیان کا خلاصہ نہایت مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے بیان کروں جس سے آپ سندھ کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔ مذکورہ بالا ذریعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آبادی بمقابلہ دیگر اقوام کے بہت زیادہ ہے یعنی منجملہ ۳۲ لاکھ دس ہزار نوسو ۱۰ نفوس کے جو سندھ میں آباد ہیں، ۲۴ لاکھ ۴۶ ہزار چار سو ۹، یعنی تین چوتھائی سے زیادہ مسلمان ہیں ۱۸۴۳ء میں جبکہ یہ ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا اُس وقت گیارہ سو برس سے زیادہ زمانہ اُس کو مسلمانوں کے تحت حکومت میں رہتے گزر چکا تھا۔ اب بھی تمام کاشتکار اور تمام جاگیردار مسلمان ہیں۔ اور انگریزی عملداری سے پہلے تمام اراضی کے مالک مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہ تھی۔ البتہ اب مہاجنوں اور دیگر اقوام نے مختلف طریقوں سے زمین کا بہت سا حصہ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اب بھی زمینداری کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ ہے۔ یعنی تین چوتھائی سے زیادہ زمین مزروعہ مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ مگر باوجود تمام ان فوقیتوں کے جو سندھ کے مسلمانوں کو اب تک حاصل ہیں جب اُن کا حال اُس معیار سے دیکھا جاتا ہے جو آجکل قوموں کی پستی اور عروج کا معیار ہے۔ تو نہایت مایوسی ہوتی ہے۔ تعلیم تجارت۔ صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمت یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کی ترقی یا تنزلی کی خبر دیتی ہیں۔ مگر سندھ کے مسلمان ان میں سے ہر ایک حیثیت کے لحاظ سے

نہایت پست حالت میں ہیں۔ اگرچہ اہل اسلام کی حالت تعلیم کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں بمقابلہ ابنائے وطن کے عموماً قابل افسوس ہے۔ مگر سردار صاحب اپنی رپوٹ میں لکھتے ہیں کہ کسی صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اس قدر ابتر نہ ہوگی جیسی کہ یہاں کے مسلمانوں کی حالت ہے۔ بی۔ اے پاس مسلمانوں کی تعداد اُنھوں نے بمقابلہ (۸۰ ہنود) ہندو گریجو ئیٹس کے تمام سندھ میں صرف (دس) لکھی ہے مگر میں نے سُنا ہے کہ ان دس میں ایک آدھ کے سوا سب کراچی کے غیر سندھی باشندے ہیں جو تجارت کی غرض سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹری، سائنس اور انجنیرنگ میں بمقابلہ ۲۰ ہندوؤں کے صرف ایک مسلمان ڈگری یافتہ ہے بیرسٹرایٹ۔ ایل۔ بی۔ اور پلیڈر اس صوبہ میں دو سو سے زائد ہیں۔ جن میں مسلمان صرف (۲۰) ہیں۔ اور منجملہ (۱۲۰) طلباء کے۔ جو گزشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے صرف (۱۲) مسلمان تھے۔ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کے مسلمانوں میں صرف انگریزی تعلیم ہی کم نہیں ہے۔ بلکہ عربی۔ فارسی۔ یہاں تک کہ سندھی زبان میں بھی ان کی تعلیم کا تقریباً ایسا ہی حال ہے کہ فیصدی ایک دو سے زیادہ نوشت خواند نہیں کرتے برخلاف اس کے ہندوؤں میں نہ صرف انگریزی تعلیم ہی کی ترقی ہے۔ بلکہ فارسی تعلیم بھی قدیم سے اُن میں چلی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت سرکاری گویا ہندوؤں کا حصہ ہو گئی ہے۔

سردار صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہونے کے باعث اُن کے ہاتھ سے ہر قسم کی سرکاری نوکریاں نکل گئی ہیں۔ اور یہی حال پیشہ اور صنعت و حرفت کا ہے۔ سندھ میں ایک ہندو صاحب سشن جج اور ایک اسسٹنٹ جج ہیں مگر اس درجہ کا کوئی عہدہ کسی مسلمان کے ہاتھ نہیں آیا ہے۔ (۲۰) سب ججوں میں صرف ایک شخص مسلمان ہے اور محکمہ مال میں منجملہ (۲۰) ڈپٹی کلکٹروں کے صرف تین مسلمان ہیں اور باقی سب ہندو۔ منجملہ (۲۷) تحصیلداروں کے صرف (۲۲) مسلمان اور باقی سب ہندو۔

۱۹۰۶ء میں اصلاح تمدن کے کسی ممبر نے دو مضمون سندھ کی تمدنی اور تعلیمی حالت پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے تھے جن میں ثابت کیا گیا تھا کہ سندھ کے مسلمانوں کی تمدنی اور تعلیمی حالت ہندوستان کے تمام صوبوں سے گئی گزری ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ زمانہ آہستہ آہستہ اہل سندھ کو ترقی کی جانب مائل کرتا جاتا ہے۔ ان کو اپنی پستی اور تنزّل کا احساس ہونے لگا ہے۔ گورنمنٹ بھی ان کی معروضات پر زیادہ توجہ اور ان کے حقوق کا زیادہ لحاظ فرمانے لگی ہے۔ کراچی کا اسلامی مدرسہ جو

مرحوم خان بہادر حسن علی صاحب کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ ترقی کرتا جاتا ہے خصوصًا جب سے کہ مسٹر وائلس اس مدرسہ کے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں اُس کے نتائج خاطر خواہ ظہور میں آرہے ہیں۔ لاڑکانہ میں وہاں کے زمینداروں کی کوشش اور مسٹر پیٹرآئی۔سی۔ ایس کلکٹر لاڑکانہ کی خاص توجہ سے ایک مدرسہ۔ جس میں انگریزی کی پانچویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے۔ قایم ہوگیا ہے۔ جس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس بھی ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں مسٹر علی محمد خاں دہلوی بیرسٹرایٹ لا کی کوشش سے لوکل محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس کے نتائج ظہور میں آرہے ہیں۔ گورنمنٹ نے کانفرنس کی کارروائی پر نہایت شفقت آمیز رزولیوشن پاس کیا۔ اور ایک کمیٹی موسومہ بہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس مقرر فرمائی جس کی تجویز سے ایک چھوٹا سا رزیڈنشل مدرسہ ضلع حیدرآباد کے شمال میں کھولا گیا۔ اور جیسا کہ سردار صاحب مرحوم کی رپورٹ میں درج ہے۔ دوسرا مدرسہ حیدرآباد کے جنوب میں کھلنے والا تھا اور تیسرا کلارک آباد میں۔ اور چوتھا ان سب مدرسوں کی نسبت بڑے پیمانہ پر ضلع تھرپارکر کے مقام پیتارمیں جس کی عمارت تیار ہوچکی ہے۔ جاری ہونے والا ہے اور پانچواں سکھر میں کھولا جانا تجویز ہوا ہے جس کی عمارت کے واسطے زمین لی گئی ہے اسی طرح سندھ کے کل اضلاع میں ایک ایک مدرسہ جاری کرنے کا سامان ہوچکا ہے۔ اور خاص کر حیدرآباد میں دو مدرسہ قایم کرنے کا ارادہ ہے۔ مگر سردار صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مذکورہ بالا مجوزہ مدارس کے لئے روپیہ کی بہت ضرورت ہے۔ صرف مدرسہ کراچی کا بورڈنگ ہوس بڑھانے کے لئے جس میں زیادہ طلبا کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی۔ پچاس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ جس میں سے چھہ ہزار ریاست خیرپور نے عطا کیا ہے اور بیس ہزار عام مسلمانوں کے چندے سے وصول کیا گیا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم سے مستفید ہونے کا خیال شروع ہوگیا اور قدیم تعصبات جو انگریزی تعلیم سے مانع آتے تھے۔ سندھ میں بھی مثل اور صوبوں کے روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ اور صوبوں کی طرح یہاں بھی بغیر امدادی وظائف کے مسلمانوں کا تعلیم پانا نہایت دشوار ہے۔ جو لوگ تعلیم پانے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ تعلیم سے بھاگتے ہیں۔ اور جو تعلیم کے خواہاں ہیں وہ استطاعت نہیں رکھتے۔ اگرچہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے گورنمنٹ اُن کی تعلیم کی طرف نہایت متوجہ پائی جاتی ہے۔ اور ریاست خیرپور سے بھی اُن کو بہت کچھ امداد کی توقع ہے۔ مگر پھر بھی سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کا پھیلانا کوئی

آسان کام نہیں ہے۔جس قوم کی حالت تعلیم سے اس قدر بعید ہو کہ اپنی مادری زبان میں نوشت خواند کرنے والے نہایت کمیاب ہیں۔ اُن کو انگریزی تعلیم سے مانوس کرنا ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ ہے۔ جب تک قوم میں بہت سے ایسے جوان مرد صاحب استقلال اور قوم کے ہمدرد پیدا نہ ہوں گے جیسے کہ مرحوم خان بہادر حسن علی بانی مدرسہ کراچی تھے یا جیسے انریبل خان بہادر شیخ صادق علی صاحب وزیر خیرپور اور مسٹر علی محمد خان دہلوی بیرسٹرایٹ لا اب موجود ہیں۔ اس وقت تک صرف گورنمنٹ کی توجہ اور ہزہائینس میر صاحب خیرپور سندھ کی امداد سے کام نہیں چل سکتا۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے جب علی گڑھ میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج قایم کرنے کا ارادہ کیا تھا تو سب سے پہلے اُنھوں نے اس بات کے دریافت کرنے کے لئے کہ مسلمان کیوں اپنی اولاد کو سرکاری مدارس میں تعلیم پانے کے لئے نہیں بھیجتے۔ ایک انعامی اشتہار جاری کیا تھا کہ سب لایق آدمی اس معاملہ پر اپنی رائے ظاہر کریں چنانچہ (۳۲) مضمون مختلف لوگوں کے اُن کے پاس پہنچے۔ جن کا ماحصل یہ تھا کہ سرکاری طریقۂ تعلیم جس کو سرکار کسی خاص فرقے کی حالت کے موافق بدل نہیں سکتی۔ مسلمانوں کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہے۔ اور مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لئے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کی آپ فکر کریں۔

صاحبو! میں سمجھتا ہوں کہ جو مشکلات سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کے سدّراہ ہیں اگرچہ اُن میں بہت سی ایسی ہیں جو گورنمنٹ کی توجہ سے رفع ہو سکتی ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں کہ جب تک خود قوم کے لیڈر اُن کے حل کرنے کی طرف متوجہ نہوں۔ ہرگز رفع نہیں ہو سکتیں۔ یہاں میں چند مشکلات کا جو معتبر ذریعوں سے مجھے معلوم ہوئی ہیں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اولاً سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کے عام نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اب تک لوکل سیس فنڈ سے ابتدائی مدارس زیادہ تر ایسے مقامات میں قایم ہوتے رہے ہیں۔ جہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔ اور مسلمان آسانی سے وہاں اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے بھیج نہیں سکتے۔ اس کے سوا مدارس میں اُستاد اکثر غیر قوم کے ہیں جن کی نسبت یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ اُن کا برتاؤ مسلمان طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ جیسا کہ اُستادوں کا برتاؤ شاگردوں کے ساتھ ہونا چاہیئے نہیں ہے۔ میں نہیں کہ سکتا کہ یہ شکایت کہاں تک صحیح ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کی اولاد کو تعلیم کی طرف سے متوجہ کرنے کا

اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اُن کی تعلیم کے لئے زیادہ مسلمان اُستاد مقرر کئے جائیں۔ دہلی میں انگریزی تعلیم مدت دراز سے جاری تھی۔ مگر ۱۸۵۷ء سے پہلے وہاں کے مسلمان تعلیم سے ہمیشہ متنفر رہے۔ حالانکہ وہاں کے ایک مسلمان نواب نے ایک لاکھ ۷۰ ہزار روپیہ اہل دہلی کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ کی سپرد کیا تھا کہ اس کے منافع سے دہلی کے طلبہ کو وظائف دیئے جائیں۔ باوجود اس کے اس فنڈ سے مسلمانوں نے بہت کم نفع اُٹھایا۔ لیکن غدر کے بعد گورنمنٹ نے اس فنڈ کی آمدنی سے ایک علیحدہ مدرسہ بنام اینگلو عربک اسکول خاص مسلمانوں کے لئے قایم کر دیا۔ اور اُس میں یہ شرط لگا دی کہ یہاں کل اُستاد مسلمان رکھے جاویں۔ اس تدبیر سے چند روز میں دہلی کے مسلمان یک قلم تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ کے بعد مدرسہ مذکور مڈل اسکول سے ہائی اسکول بنا دیا گیا۔ اس وقت دہلی میں جس قدر گریجوایٹ اور انٹرنس پاس مسلمان پائے جاتے ہیں وہ سب اسی مدرسہ سے ابتدائی تعلیم پا کر نکلتے ہیں۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں سب سے بڑی اور بدیہی مثال۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ ہے جہاں ابتدائی تعلیم زیادہ تر مسلمان اُستاد دیتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے یہاں کے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہی کہ مجوزہ مدارس جو سندھ کے ہر ایک ضلع کے لئے قایم ہونے قرار پائے ہیں۔ وہ جہاں تک ممکن ہو ایسے مقامات میں قایم کئے جائیں جہاں مسلمانوں کی اولاد آسانی سے تعلیم کے لئے جا سکے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس مدرسہ میں ہندو اور مسلمان طلبا اُن میں داخل ہوں۔ اول اول سندھ میں اُستاد بلاشبہ مشکل سے مل سکتے ہیں۔ مگر موجودہ حالت میں علی گڑھ کالج یا لاہور کے اسلامیہ کالج سے کسی قدر زیادہ تنخواہ پر بلائے جا سکتے ہیں۔

جس طرح مسلمان اُستادوں کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح معائنہ کرنے والے افسروں میں بھی مسلمانوں کا ہونا کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

دوسری مشکل جو مسلمانوں کی تعلیم میں درپیش ہے۔ وہ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ اور یہ کچھ ایسی مشکل ہے جس کا حل کرنا خود ہمارے ہاتھ میں ہے نہ کہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں۔ کیونکہ گورنمنٹ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ ہندوستان کی بے شمار قوموں میں سے کسی خاص قوم کی مذہبی تعلیم یہاں تک کہ عیسائی مذہب کی تعلیم بھی اپنے مدارس میں جاری نہیں کر سکتی۔ پس ضروری ہے کہ جو ابتدائی سندھ کے اضلاع میں قایم کئے جائیں۔ اُن میں مذہبی تعلیم کا انتظام خود قوم کی طرف سے کیا جائے میں سنتا ہوں کہ سندھ میں جس طرح دینوی تعلیم مفقود ہے اسی طرح مذہبی تعلیم کی طرف سے

بھی یہاں انتہا درجہ کی غفلت اور بے پروائی پائی جاتی ہے۔ مجھ سے میرے ایک ثقہ دوست نے بیان کیا کہ سندھ میں ایک موقع پر تین نوجوان مسلمان تھے۔ میں نے جو اسلامی روایات سے اُن کی حد سے زیادہ ناواقفیت دیکھی تو امتحاناً اُن سے یہ سوال کیا کہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمھارا نبی کون ہے؟ ایک نے کہا کہ امام حسین دوسرے نے کہا فیض محمد خاں میر خیرپور اور تیسرے نے کہا پیر پگھاڑا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سندھ میں مذہبی تعلیم کا کیا حال ہے جو لوگ کراچی یا حیدرآباد میں رہتے ہیں وہ اس حکایت کو سُن کر بلاشبہ تعجب کریں گے۔ مگر جو لوگ دیہات کے مسلمانوں کی حالت سے خبردار ہیں۔ اُن کو اس سے کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا۔

تیسری مشکل اور سب سے بڑی اور سخت مشکل وظائف کے لئے سرمایہ مہیا کرنا اور قوم کے ہونہار بے استطاعت لڑکوں کو امدادی وظائف دے کر مختلف مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم کے لئے بھیجنا ہے۔ بالفعل کراچی کا اسلامیہ اسکول اور لڑکا نہ کا مدرسہ اور حیدرآباد سکھر وغیرہ کے مجوزہ مدارس۔ بشرطیکہ وہ بہمہ وجوہ مکمل ہو جائیں۔ سکنڈری تعلیم تک کافی ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کراچی میں گورنمنٹ کالج موجود ہے اور اگر کافی امداد طلبہ کو دی جائے تو لاہور کے اسلامیہ کالج اور علی گڑھ کے محمدن کالج میں بھی اُن کو بھیجا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ اُن سے تعلیم کے لئے چندہ وصول کرنا نہایت مشکل ہے۔ مگر تجربے سے ثابت ہو گیا ہے۔ کہ اگر چندہ وصول کرنے والے موجود ہوں۔ تو چندہ دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ چندہ مانگنے والے جس قدر ذی وجاہت۔ ذی رتبہ اور زیادہ اعتبار والے ہوں گے اُسی قدر چندہ فراہم کرنے میں زیادہ کامیابی ہو گی۔ پس جب تک کہ قوم کے سربرآوردہ اور ممتاز لوگ اس کام کے کھڑے نہ ہوں گے اور جب تک وہ قوم کے لئے گداگری کرنے کو بجائے ننگ و عار سمجھنے کے ذریعہ فخر و مباہات نہ سمجھیں گے۔ روپیہ تحصیل کرنا مشکل ہے۔ تعلیم روز بروز گراں ہوتی جاتی ہے اور بے مقدور لوگوں کے لئے جو سب سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہیں۔ اُس کا میدان تنگ ہوتا جاتا ہے پس نہایت ضرورت اس بات کی ہے کہ یا تو ذی مقدور لوگوں میں بہت سے ایسے عالی ہمت اشخاص پیدا ہوں جو اپنی دولت کا ایک حصہ قوم کی تعلیم میں صرف کریں اور اپنی ہموطن قوموں کے اہل ہمت سے سبق حاصل کریں جو لاکھوں روپیہ اور لاکھوں کی جائدادیں قوم کی بھلائی کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ یا چند جوان مرد کمر ہمت باندھ کر اور جھولی گلے میں ڈال کر کھڑے ہو جائیں اور قوم کے بچوں کے لئے گداگری اختیار کریں۔ سرسیّد کی کامیابی کا بھید زیادہ تر اسی گداگری میں

چھپا ہوا ہے۔ اِن کے ایک دوست کے ہاں پوتا پیدا ہوا تھا اُنھوں نے پوتا ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپیہ طلب کئے جس پر اُن کے دوست نے ایک معقول رقم چراغی کے نام سے نذر کی۔ ایک اور دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علی گڑھ میں آئے۔ آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے پہنچے۔ وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آئے۔ نمائش علی گڑھ میں اُنھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔ اُنھوں نے چندہ مانگنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں۔ کس سے مانگتا ہوں۔ اور کس طرح مانگتا ہوں۔ صاحبو! آپ کے سامنے اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دنیا میں تعلیم نے کیسا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ قوموں میں وہی نسبت نظر آتی ہے۔ جو آدمی اور جانور میں ہونی چاہئے۔

جو قومیں غفلت یا تعصب سے ابتدا میں مغربی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں وہ اپنی نادانی پر کفِ افسوس ملتی ہیں۔ اور گو ترقی کا موقع اُن کے ہات سے بہت دور جا پڑا ہے۔ مگر چار و ناچار اُن کو بھی آخر کار اس مغربی تعلیم کے سایہ میں پناہ لینی پڑی ہے۔ جس کے نام سے وہ سو سو کوس دور بھاگتی تھے۔ خصوصًا مسلمان جو سب سے زیادہ تعلیم کے مخالف تھے اُن کی بھی اب بہت دیر کے بعد آنکھیں کھلی ہیں۔ اور اُنھوں نے بھی اُس مسافر کی طرح جو قافلہ سے بچھڑ کر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ نہایت شتابی کے ساتھ اُفتاں و خیزاں قافلے کے پیچھے دوڑنا شروع کیا ہے۔ مصر۔ ٹرکی۔ ایران و افغانستان میں تعلیم کا خیال روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے وہاں کے مسلمانوں نے بھی اپنی قومی ہستی ترقی تعلیم پر منحصر سمجھی ہے۔ چنانچہ مصر کے ذی مقدور مسلمان اپنے عطیات سے اور متوسط الحال لوگ قومی چندوں کے ذریعہ سے اپنے ملک کے اہل اسلام میں تعلیم پھیلا رہے ہیں۔

جو لکچر روس کے مشہور اسلامی اخبار ترجمان کے ایڈیٹر نے یکم نومبر سنہ حال کو قاہرہ میں دیا تھا اُس میں اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ اخیر چوتھائی صدی میں روس کے مسلمانوں میں ترقی کے خیالات کثرت سے پھیلنے لگے ہیں۔ اُنھیں خیالات کا اثر ہے کہ اخیر زمانہ میں اُن کی توجہ مدارس کی اصلاح پر مائل ہوئی ہے۔ اور وہ مفید کتابیں علوم جدیدہ اور ترقی علم و ادب کی شائع کرنے لگے ہیں۔ اور جدید طرز کے مدارس کھولے جاتے ہیں۔ اور اُنھوں نے علوم جدیدہ اور علوم عربیہ اور ادبیہ کی تحصیل کے لئے اپنے طلبہ کو روس کے مدارس عالیہ اور یورپ اور

ٹرکی اور مصر کے مدارس میں بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ ابتدائی اسلامی مدارس جن کی ترقی تعلیم کی اصلاح ہو گئی ہے۔ تعداد میں ایک ہزار کے قریب ہیں۔ مذہبی مدارس میں سے جن کی اصلاح ہو چکی ہے ایک مدرسہ کازان میں ایک اورنبرگ میں اور ایک اوفا میں ہے۔ ان مدرسوں میں ریاضیات۔ طبعیات۔ جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور علوم دینیہ کی کتابیں بھی حسب معمول پڑھائی جاتی ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے بیان کیا کہ حسن اتفاق سے روسی مسلمانوں میں ایسے فیاض دولتمند پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے اپنی دولت علم کی اشاعت اور ترقی میں بے دریغ صرف کی۔ اُن میں سے خاص کر ذکر کرنے کے لایق مرحوم حاجی نعمت اللہ فرامیشف ہیں جنھوں نے ایک سو مدرسوں اور ایک سو مسجدوں کی اپنے روپیہ سے بنیاد ڈالی۔ اور ایک عالی شان کتب خانہ قایم کیا۔ جس میں نہایت عمدہ اور نادر کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ کازان کے نامور مسلمان تاجر مرحوم احمد حسینی نے بھی مدرسوں کی بنیاد ڈالنے اور علوم جدیدہ کے پھیلانے میں تین لاکھ روبل یعنی سات لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپیہ صرف کیا۔ مرحوم احمد حسینی کے بھائی عبد الغنی حسینی نے بھی دو سو ابتدائی اسکول نئے طریقہ تعلیم کے قایم کئے۔ اور اسکولوں کی اصلاح کے خیالات کو انھوں نے روس کے اندرونی صوبوں ہی میں نہیں۔ بلکہ اُن دور دراز صوبوں میں بھی پھیلایا ہے۔ جو چین کی آسمانی سلطنت کی حدود پر واقع ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ منجملہ ان فیاض دولتمند مسلمانوں کے ایک حاجی زین العابدین تالیف ہیں جو باکو کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے علم کے پھیلانے اور محتاج و غریب مسلمانوں کی امداد کرنے میں سب سے زیادہ کوشش کی ہے۔

اس فیاض شخص نے داغستان میں ایک سو مسجدیں اور ایک سو ابتدائی مدرسے قایم کئے۔

باکو کے نواح میں علم زراعت کے جدید اصولوں کے مطابق ایک وسیع قطعۂ زمین بطور نمونہ کے مخصوص کیا۔ تاکہ جدید طریقہ کاشتکاری کو مسلمان سیکھیں اور اُس کی تقلید کریں۔ روسی اور ٹرکی زبانوں میں کئی اخبار شائع کرائے جن سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانان روس کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اور مسلمانوں کے ملکی اور سیاسی خیالات کا اُن کے ذریعہ سے اظہار کیا جائے۔ اس کے سوا انھوں نے لاکھوں روپیہ یورپ اور روس کی یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبا کو تعلیم دلانے میں صرف کئے۔ سر روس میں جو آجکل نامور مسلمان ڈاکٹر وکیل اور انجینیر ہیں وہ سب اس فیاض دولت مند مسلمان کے شرمندۂ احسان ہیں۔ انھوں نے مسلمان لڑکیوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ باکو میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جس عالی شان مدرسے کی بنیاد انھوں نے ڈالی

ہی۔ صرف اُس کی تعمیر پر تین لاکھ روپیہ یا ۲۰ ہزار پونڈ کی رقم صرف ہوئی ہے۔ اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے اُنھوں نے ایک جائداد بھی وقف کی ہے جس کی سالانہ آمدنی ۳۰ ہزار پونڈ یا ساڑھے چار لاکھ روپیہ ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے مسلمانان مصر کو مخاطب کرکے کہا کہ "اے معزز و محترم مسلمانانِ مصر! آپ لوگ میرے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ خداوند عالم اس فیاض ہمدرد قوم کو مدّت دراز تک زندہ و سلامت رکھے" پھر کہا کہ ایسے مسلمان دولت مند جنھوں نے ایک ایک ابتدائی یا متوسط درجہ کے مدرسے روس میں قایم کئے ہیں اُن کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہے کہ میں اُن کا کوئی شمار نہیں بتا سکتا"

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ روس کے مسلمانوں نے ترقی کے میدان میں جو قدم بڑھایا ہے وہ انہیں مدرسوں کی بدولت ہی۔

صاحبو! اِس فاضل لکچرار کے بیان میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ اس نے اپنے طول طویل لکچر میں جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے گئے ہیں کہیں ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے پایا جائے کہ روس کے مسلمانوں کے پرائیویٹ اسکولوں میں گورنمنٹ روس نے بھی کچھ امداد دی ہے یا نہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے صاف صاف اس بات کا اظہار کیا ہے کہ روس کے مسلمانوں نے جو کچھ تعلیم میں اب تک ترقی کی ہے وہ محض اپنی قوم کی امداد سے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ برٹش کی رعایا کا حال اس باب میں گورنمنٹ روس کی رعایا سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں گورنمنٹ ان قوموں کو جو تعلیم میں دیگر اپنے ہم وطنوں سے نہایت پست حالت میں ہیں طرح طرح سے تعلیم پر متوجہ کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے اون کی تعلیم میں آسانیاں پیدا کرتی ہے اور اُن کے پرائیویٹ اسکولوں میں امداد دیتی ہے اور اگر ان کی کوشش سے کوئی بڑا قومی انسٹیٹیوشن قایم ہوتا ہے تو اُس کی خود سرپرست بنتی ہے۔ پس ہم مسلمانوں کو بمقابلہ روس کے مسلمانوں کے تعلیم میں ترقی کرنا نہایت آسان ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنی تعلیم کا دارومدار محض گورنمنٹ کی امداد پر نہ رکھیں بلکہ گورنمنٹ کو رفتہ رفتہ اپنی تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش کرتے جائیں۔ گورنمنٹ کا کام صرف اس قدر ہے کہ رعایا میں تعلیم کا مذاق اور اُس کی ضرورت کا احساس پیدا کردے۔ اس کے بعد یہ کام خود رعایا کا ہے کہ وہ آگے قدم بڑھائے اور جو پودہ گورنمنٹ نے اپنے زور ہاتھوں سے لگا دی ہے اُس کو اپنی ذاتی کوششوں اور محنت سے پروان چڑھائے اور ملک اور قوم کو اُس سے

فائدہ پہنچے۔

صاحبو! سندھ کے مسلمانوں کی حالت نہایت افسوس ناک ہے آجکل تمام ترقیات کا مدار محض تعلیم پر ہے۔ جب سندھ میں تعلیم ہی نہیں تو جاننا چاہئے کہ کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ زمینداری پر نازاں ہیں۔ اگر انھوں نے تعلیم کی طرف توجہ نہ کی تو زمینداری کوئی دن کی مہمان ہے۔ کیونکہ جو لوگ ملک میں تعلیم یافتہ ہیں وہ رفتہ رفتہ اُن کی زمینداری پر قابض ہوتے جاتے ہیں۔ اور جس طرح سے سرکاری ملازمت سے مسلمان خارج ہوگئے ہیں۔ اسی طرح سے زمینداری سے بھی آخر کار اُنھیں دست بردار ہونا پڑے گا۔ جس طرح بدنِ انسان میں خون کی کمی تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح تعلیم کی کمی تمام قومی مصائب کی جڑ ہے۔ بغیر تعلیم کے اب دنیا میں عزت سے رہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس وقت دور دور سے مسلمان اسی غرض سے کراچی میں آئے ہوئے ہیں کہ سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔

ہز ہائینس میر صاحب خیرپور اور اُن کے روشن ضمیر وزیر نے اُن کو اسی لئے مدعو کیا ہے۔ کہ اس ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کریں اور ایسی تجویزیں پیش کریں جن سے اُن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا ہوں۔ سرکاری افسر خصوصاً جناب ینگ ہسبینڈ صاحب کمشنر سندھ تہ دل سے ترقی تعلیم مسلمانان سندھ کی حمایت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر جائلز ڈائرکٹر جنرل تعلیمات ہند جو پہلے ایک مدت تک اس صوبہ میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم رہ چکے ہیں۔ وہ بھی عنقریب تشریف لانے والے ہیں اور امید ہے کہ اپنی تشریف آوری سے اس کانفرنس کو عزت بخشیں گے۔ اب وقت ہے کہ سندھ کے مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اُن کی ترغیب کے جو اسباب جمع ہوگئے ہیں۔ اُن کو غنیمت سمجھیں اور اُن سے فائدہ اُٹھائیں ؎

زمانہ دیر سے چلّا رہا ہے اے مسلمانو
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو

سُنا تم نے نہ ہو قولِ نبی گر شان میں میری
تو اب سن لو کہ ہوں میں شانِ ربّانی مجھے مانو

وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانوگے تو پچھتاؤ گے نادانو

مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بیگانو

گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے
بس اب ثروت ہی مزدور کا حصہ ہے تن آسانو

گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے
ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل مری جانو

نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری — جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ اُن کو — کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں — نہ چل سکتی ہے اب بے علم تجاری نہ معماری
جہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر — تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئے گی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت — جنھیں پائیں گے آقا زیورِ تعلیم سے عاری
جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے — جو سچ پوچھو تو یہ علم ہے اور یہ خدائی ہے
گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا اک زیور — ہوئی ہے زندگی اب منحصر خود علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا — نہ زرگر اور نہ آہنگر نہ بازی گر نہ سوداگر
مہندس چاہئیے مزدور اب اور راج اقلیدس — بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور
گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے — برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا — جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اُس سے اعلیٰ تر
نہ تھا غیر از تنفس فرق کچھ انسان و حیواں میں — دیا ہے امتیاز انسان کو یہ تعلیم نے آ کر

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دوں گا

صاحبو! یہاں تک جو آپ کے سامنے بیان کیا گیا وہ خاص کر سندھ کی موجودہ تعلیم سے علاقہ رکھتا تھا۔ اب میں چند الفاظ عام مسلمانان ہند کی تعلیم کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ اس کے متعلق پہلے اس قدر کہا جا چکا ہے کہ میں کوئی بات اس سے زیادہ نہیں بیان کر سکتا۔

سر سید مرحوم جنھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد ڈالی ہے۔ ابتدا سے اُن کا خیال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت یہ تھا کہ جب وہ تعلیم پا کر کالجوں سے نکلیں گے تو اُن میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ جو ذریعہ معاش وہ اپنی طبیعت کے مناسب اور اپنی حالت کے موافق دیکھیں گے اُس کو خود اختیار فرما لیں گے۔ کیونکہ تعلیم اُن کی خود رہنمائی کرے گی اور اُن کو اُسی رستہ پر ڈال دے گی جس کی قابلیت اُن کی فطرت میں موجود ہوگی۔ پس یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کے سوا اُن کو کسی خاص پیشہ یا صنعت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جہاں تک دیکھا جاتا ہے اب تک اس خیال کا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ اور جو اُمیدیں اُن سے کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ تعلیم کے زمانہ میں ہر مسلمان نوجوان محض سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت ہی کو اپنی

منزل مقصود جانتا ہے اور تعلیم کے بعد اُسی کی تلاش میں دائیں بائیں ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہے اور اگر حسب دلخواہ اُس کو ملازمت نہیں ملتی تو یہ خیال کرتا ہے کہ تعلیم میں جو محنت اور کوشش کی گئی تھی وہ سب رائگاں گئی - ڈاکٹری اور انجنیری بھی وہ بھی ملازمت کی غرض سے سیکھتا ہے - صرف قانون ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے معدودے چند مسلمان جب تک کہ اُن کو کوئی سرکاری عُہدہ نہیں ملتا - البتہ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں - اس کے سوا کسی آزاد پیشہ کے اختیار کرنے کی اُن میں جرأت نہیں پائی جاتی -

سرسید مرحوم نے اپنے خیال کی تائید میں ایک موقع پر یہ حکایت لکھی ہے کہ ایک دہقان کے بیٹے نے اضطراب کی حالت میں اپنے باپ سے کہا کہ گاؤں کے تالاب میں پانی چلا آتا ہے - جب تالاب بھر جائے گا تو پانی کہاں جائے گا - اُس کے باپ نے کہا - بیٹا اندیشہ مت کر جب تالاب بھر جائے گا تو پانی اپنے نکاس کا راستہ آپ نکال لے گا - اس حکایت کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ یہی حال مسلمان نوجوان تعلیم یافتہ کا ہے - ابھی اُن کی ایسی قلت ہے کہ کوئی راستہ آیندہ زندگی کے لئے نہیں نکال سکتے جب کثرت سے ہوں گے تو کوئی راستہ نکال لیں گے - راستوں کی کمی نہیں ہے - مگر ابھی تالاب بھرا نہیں ہے -

لیکن اے صاحبو - جس رفتار سے مسلمانوں میں تعلیم چل رہی ہے اس رفتار سے تالاب کے بھرنے میں بہت دیر معلوم ہوتی ہے - مگر راستہ نکالنے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے - اور اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو تالاب بھر جانے کے بعد بھی خاص کر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ اُمید نہیں ہے کہ وہ ملازمت کے سوا کوئی دوسرا راستہ آیندہ زندگی کے لئے نکال سکیں - ہندوستان کے اس خاص حصہ میں جس میں کہ آگرہ - دہلی - اور لاہور کے قدیم دارالحکومت شامل ہیں زیادہ تر عرب - ایران - ترکستان اور افغانستان - کی نسلیں آباد ہیں - جن کے آبا واجداد ہمیشہ یا تو خدمات سلطانی پر مامور تھے - یا معافیات یا جاگیرات کے بھروسہ پر اُن کو کسی قسم کے آزاد پیشہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی - یہاں تک کہ قانون وراثت طبیعی کے موافق رفتہ رفتہ تجارت اور صنعت وغیرہ کی قابلیت اُن کی نسلوں میں بالکل مفقود ہو گئی اور آزاد پیشوں کی جرأت کرنے کا اُن میں بالکل حوصلہ باقی نہیں رہا - اون کی یہ خاصیت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ نہ تعلیم سے اُن میں حس وحرکت پیدا ہوتی ہے - نہ اپنی ہم وطن قوموں کی کاروباری زندگی دیکھ کر اُن کی ریس کرنے کا خیال اُن میں پیدا ہوتا ہے - اور نہ یورپ کی عالمگیر تجارت وصنعت کا سیلاب اُن کی

آنکھیں کھولتا ہے۔ اول اول جو مسلمان شرفا دستکاری یا دوکانداری کو اپنی شان کے خلاف جانتے تھے۔ اُن کا یہ خیال بھی روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اُن کی جھجک جو آزاد پیشوں کی طرف سے اُن کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے وہ کسی طرح نہیں جاتی۔ بعض تعلیم یافتہ نوجوان جو بڑی جرأت کر کے کوئی کام شروع کرتے ہیں۔ تو اکثر بہ سبب ناتجربہ کاری اور عدم وقفیت کے اُس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اور آخر کار کسی قدر نقصان اُٹھا کر اُس سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور جب اُن کے دیگر ہم چشم جو کاروباری دنیا میں قدم رکھنا چاہتے تھے۔ اپنی آنکھ سے اُن کی ناکامی دیکھتے ہیں تو اُن کے حوصلے بھی پست ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کو بھی ہمیشہ کے لئے اپنی آزادی سے دست بردار ہونا اور وہی ملازمت کا طوق گلے میں ڈالنا پڑتا ہے یہ حالت تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کی نہایت مایوس کرنے والی اور تعلیم اولاد سے مسلمانوں کا دل اُچاٹ کرنے والی ہے۔ اب تک ہندوستان کے مسلمانوں میں جس قدر تعلیم کا خیال پیدا ہوا ہے۔ اُس کی بنیاد صرف اس بات پر ہے کہ وہ تعلیم کو ایک ذریعہ حصول معاش کا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب اُن کی اولاد تعلیم پانے کے بعد معاش کی طرف سے فارغ البال نہ ہوگی تو سوا اس کے کہ وہ تعلیم کا خیال چھوڑ دیں اور کیا انجام ہو سکتا ہے۔ سرکاری ملازمتیں نہایت محدود ہیں۔ اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد روز بڑھتی جاتی ہے۔ پس ممکن نہیں ہے کہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان کے لئے حسب دلخواہ سرکاری ملازمت مل سکے البتہ صنعت و حرفت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس قدر تعلیم یافتہ لوگ بڑھتے جائیں گے اُسی قدر اُن کی مانگ بھی زیادہ ہوتی جائے گی۔ یورپ کے ایک روشن خیال مصنف کا قول ہے کہ جس ملک یا قوم کا دار مدار ملازمت پر ہوتا ہے۔ وہ کبھی مرفعہ الحال نہیں ہو سکتی۔ اُن کی قدرتی قوتیں ہمیشہ پژمردہ رہتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بالکل فنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن جہاں صنعتوں اور حرفتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے وہاں یہ سمجھنا چاہیئے کہ قومی زندگی کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ اور وہ زمانہ قریب ہے کہ تازگی اور رونق تمام چھا جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ یورپ کے جن شہروں میں لوگ ملازمت کرنے کے عادی ہیں وہاں تمام کوچوں اور بازاروں میں ہر وقت افسردگی اور اُداسی برستی ہے۔ لیکن جہاں صنعت اور تجارت کا بازار گرم ہے وہاں ہر شخص کے چہرہ پر رونق و شگفتگی و زندہ دلی کے آثار نظر آتے ہیں۔

صاحبو۔ صنعت و حرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے جب سے سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے۔ ہمارے ہم وطن اُس کی طرف اور بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس ملک کی مالی مشکلات جن میں وہ اکثر مبتلا ہوتا رہتا ہے

اُس سے اُس کا نجات پانا محض صنعت وحرفت کی ترقی پر منحصر ہے۔ ممالک متحدہ میں اسی مقصد کے لئے انڈسٹریل کانفرنس قایم کی گئی ہے۔ اور صوبوں میں بھی اس طرف توجہ ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ مسلمان بھی اس ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ اب تک اس سے بالکل الگ رہتے ہیں۔ اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنی تمام ہم وطن قوموں سے پیچھے رہ گئے اور اب کسی طرح اُن کی برابری نہیں کرسکتے۔ اسی طرح صنعت وحرفت سے بھی اس وقت اُن کی غفلت کا وہی انجام نہ ہو۔ میں صنعت وحرفت کی تعلیم کے متعلق آپ صاحبان کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہتا۔ بلکہ جو کچھ پہلے کہا جاچکا ہے اُسی کو دُہراتا ہوں اور قوم کے لیڈروں کو یاد دلاتا ہوں کہ تعلیم یافتہ نوجوان کو صنعت وحرفت کی طرف متوجہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہر سال ہر درجہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے اُن کی حیثیت کے موافق معقول وظیفے دئے جایا کریں۔ تو اُمید ہے کہ چند سال میں ایسے کثیر التعداد نوجوان پیدا ہوجائیں گے۔ جو اپنے ہم چشموں میں آزاد پیشیوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت دلاسکیں گے اور اگر قوم کے دولت مندوں کو خدا ایسی توفیق دے کہ بی۔ اے پاس نوجوانوں کو وقتاً فوقتاً صنعت حرفت کی تعلیم کے لئے معقول وظیفے دے کر یورپ۔ یا جاپان بھیجتے رہیں۔ تو اُمید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہماری قوم کے دن پھر جائیں گے۔

جس زمانہ میں سرسیّد مرحوم نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ولایت بھیجنے کے لئے سول سروس فنڈ کے نام سے سرمایہ جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک زمانہ تھا کہ لوگ قومی ہمدردی کے نام سے بالکل بے خبر تھے۔ اور اسی لئے اُس وقت سرسید کو اس منصوبے میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی مگر اب ہماری قوم کے دولت مندوں میں روز بروز ایسی مثالیں قایم ہوتی جاتی ہیں کہ اگر کوئی ایسا فنڈ قایم کیا جائے جس کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی تعلیم کے لئے غیر ملکوں میں بھیجا جائے تو اس مقصد میں کامیابی ہونی ناممکن نہیں ہے۔

جس طرح صنعت وحرفت کی تعلیم کا قوم میں پھیلانا ضروری ہے۔ اسی قدر بلکہ اس سے بہت زیادہ ہمارے نوجوانوں کو نئے طریقۂ زراعت کی تعلیم دلانی ضروری ہے۔ خصوصاً ایسے صوبہ میں جیسا کہ سندھ ہے۔ اور جہاں۔ (۸۰) فیصدی کے قریب مسلمان کاشتکار وزمیندار ہیں۔ بجائے صنعت و حرفت کے زراعتی اسکولوں میں جو گورنمنٹ نے اکثر صوبوں میں کھول رکھے ہیں۔ تعلیم دلانا زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ جو لوگ زراعتی اسکولوں سے تعلیم پاکر نکلیں وہ زراعت کے عمدہ عمدہ فارم قایم کرکے عملی

طور پر اپنے بھائیوں کو دکھائیں کہ زمانہ حال میں زراعت نے کس قدر ترقی کی ہے کہ جس زمین سے قدیم طریقہ کے موافق مثلاً پانچ روپیہ بیگہ منافع ہو سکتا تھا۔ اب نئے طریقہ سے کم و بیش دس روپیہ منافع بہ آسانی ہو سکتا ہے۔

بہرحال مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر ایک شعبے میں دستگاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں جس میں اُن کے ہم وطن اُن سے بہت دور آگے نکل گئے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ وہ زمانہ بہت قریب ہی کہ اُن کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا۔

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتی نہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہمان ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ہیں اُن کو نگلے جاتے — دریا میں مچھلیاں جو کم زور ناتواں ہیں

سنبھلو وگرنہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں

فقط



آنریبل نواب سر خواجہ سلیم اللہ خان بہادر
صدر اجلاس بست و دوم (امرتسر سنہ ۱۹۰۸ ع)

اجلاس بست و دوم

منعقدۂ امرتسر ۱۹۰۸ء

صدر نواب سر خواجہ سلیم اللہ مرحوم جی سی آئی ای
رئیس ڈھاکہ

حالاتِ صدر

نواب سر سلیم اللہ کے اجداد متوطن کشمیر تھے۔ آپ کے بزرگوں میں سے خواجہ عبدالحکیم نے ترک وطن کر کے مغربی بنگال کے ضلع سلہٹ میں سکونت اور تجارت شروع کی۔ ان کے بعد ان کے جانشین ڈھاکہ میں آباد ہوئے اور انھوں نے مختلف اضلاع بنگال میں زمینداری کی بڑی بڑی حقیتیں خریدیں اور کچھ زمانہ گزرنے کے بعد بڑے تاجر ہونے کے علاوہ بڑے بڑے زمیندار بھی بن گئے ان کے دادا نواب سر عبدالغنی خاں نے زمینداری کو بہت کچھ وسعت دے کر اپنی فیاضی سیر چشمی اور اپنے کاروبار زمینداری میں خاص قابلیت کا اظہار کر کے کافی شہرت اور ہر دل عزیزی حاصل کی تھی۔ وہ ہوشمند زمانہ شناس تھے۔ حکام انگریزی میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا جو بڑے بڑے خطابوں سے مخاطب کئے گئے۔

انھوں نے لاکھوں روپیہ پبلک اور پرائیویٹ طریقہ سے رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا اسکول، کالج، شفاخانے، مسجدیں، مقبرے یہ سب چیزیں ایسی تھیں جو ان کی توجہ کو اور فطری فیاضی کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہتی تھیں۔ ڈھاکہ واٹر ورکس کی بنا انھیں کی فیاضی کی بدولت پڑی جس کا بنیادی پتھر ۱۸۷۴ء میں لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے نصب کیا گیا تھا ۱۸۹۶ء میں انھوں نے نہایت

نیک نامی کی زندگی بسر کر کے انتقال کیا۔ ان کے بیٹے نواب سر احسن اللہ خاں ان کے بعد جانشین ہوئے جو مثل اپنے باپ کے مخیر اور فیاض طبع شخص تھے مغربی بنگال کے مسلمانوں میں حکام رسی، اثر وجاہت اور امارت کے لحاظ سے ان کا سب سے بڑا درجہ تھا جس طرح ان کے والد نے ڈھاکہ میں واٹر ورکس کی بنیاد قایم کی۔ سر احسن اللہ خاں کی فیاضی نے تمام ڈھاکہ کو برقی روشنی سے منور کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے نواب سر سلیم اللہ ارادہ کے مضبوط بلند ہمت، فیاض طبیعت، ہمدرد ملت اور مشکلات کے وقت نڈر اور بے خوف شخص تھے۔ چوں کہ یہ اپنے باپ کی زندگی میں گورنمنٹ بنگال میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر بھی رہے تھے۔ اس لئے ان کو انتظامی معاملات کی اصلاح کا بھی خاص سلیقہ تھا۔ تعلیم بنگال کے زمانہ میں گورنمنٹ کے خلاف جب بنگالیوں نے زبردست ایجی ٹیشن کیا اور بنگالیوں کی شورش نے اور بائیکاٹ کے مظاہروں نے سر یندرو ناتھ بنرجی (جو بعد کو سر سریندر و ناتھ ہوئے) کو بے تاج کا بادشاہ بنگال بنا دینے سے تمام بنگال میں اودھم مچا دی تھی اور جس کی وجہ سے گورنمنٹ کو ملک میں بدامنی اور خطرہ کا پورے طور سے خوف اور اندیشہ ہو گیا تھا اس وقت نواب سر سلیم اللہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اٹھے اور لارڈ کرزن کی گورنمنٹ کی جو مدد اور حمایت تحریر تقریر خیالات اور روپیہ کے صرف سے اُنھوں نے کی وہ ان کی دلیری اور گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لحاظ سے حیرت انگیز تھی۔ اس لئے کہ بنگال کے اہل ہنود کی قوت قابلیت، قوت ارادی، قوت مالی، قوت اجتماعی تمام ملک پر چھا گئی تھی۔ جس کا مقابلہ کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس زمانہ میں ان کی جان تک معرض خطر میں تھی لیکن ان کی دلیرانہ اور پر دبدبہ طبیعت نے نہ صرف اپنے صوبہ بنگال کے مسلمانوں کے دلوں میں بلکہ ہندو بنگالیوں کے قلوب میں بھی اپنی شجاعت، ہمت اور اثر کی دھاک بٹھا دی تھی۔ ہر دل عزیزی کے لحاظ سے جو درجہ ان کے صوبے کے باشندوں میں ان کا تھا۔ وہ عزت آج بھی دوسرے صوبوں کے کسی بڑے سے بڑے رئیس، تعلقہ دار، خطاب یافتہ اور حکام رس کو میسر نہیں۔

ان کی قوت ارادی بہت زبردست تھی وہ جس کام کا ارادہ کر لیتے تھے اس میں پورے طور سے منہمک ہو جاتے تھے اور جب تک اس کو پورا نہ کر لیتے تھے چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ روپیہ خرچ کرنے میں وہ لکھ لٹ تھے۔

وہ ہر کہ و مہ سے اخلاق اور تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے۔ گورنمنٹ نے بھی ان کے ذاتی اوصاف اور خاندانی روایات کی بنا پر ان کی کافی عزت اور قدردانی کر کے جی سی آئی ای کے خطاب سے مخاطب کیا۔ اور ان کی پوزیشن یوروپین اور ہندوستانی دونوں طبقوں میں بہت بلند نظر آتی تھی۔

ان کے دل میں اپنی قوم کی تعلیمی پستی کا کافی احساس تھا وہ اس امر کا اعتقاد رکھتے تھے کہ جب تک مسلمان علوم جدیدہ کی ترقی کے ساتھ مذہبی تعلیم اور اخلاقی تربیت پر توجہ نہ کریں گے وہ دنیائے عمل کی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں نواب صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو اور آل انڈیا مسلم لیگ کو ڈھاکہ میں دعوت دی۔ کانفرنس کی زندگی میں اس کا یہ پہلا بری اور بحری سفر تھا جو دو صوبوں بہار اور مغربی بنگال کو پھاند کر علی گڑھ سے تیرہ سو میل پر چل کر ختم ہوا تھا۔

مہمانان کانفرنس کی مدارات، کمپ کانفرنس کی ترتیب وغیرہ کے متعلق جو اہتمام ان کے پیش نظر تھا اس کیفیت کو خاکسار (جامع اوراق ہذا) نے تین مہینے ڈھاکہ میں رہ کر چشم خود دیکھا ہے۔ دسمبر ۱۹۰۶ء کا آخر ہفتہ سرزمین ڈھاکہ کے حق میں ہندوستان کی جان تھا جس میں پنجاب، سندھ، ممالک متحدہ اودھ بہار، بمبئی، بنگال، سی پی اور دیسی ریاستوں سے تمام مقتدر اور تعلیم یافتہ مسلمان سمٹ کر ڈھاکہ پہونچ گئے تھے۔ مشہور باغ دلکشا کے علاوہ جو کمپ کانفرنس کا اصلی مرکز اور اپنی پرکیف بہار کے لحاظ سے اسم با مسمیٰ تھا ان کے تمام عالی شان محلات مہمانوں کے لئے معہ اپنے تمام بیش بہا ساز و سامان کے وقف راحت تھے۔ باوجود اس کے کہ بیسیوں کارکن موجود تھے لیکن ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بسا اوقات وہ نگرانی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ایسے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے جو مزدوروں اور قلیوں کے کرنے کے ہوتے تھے۔

جس روز نواب محسن الملک اور پریسیڈنٹ اجلاس ڈھاکہ پہونچنے والے تھے ان کی خواہش تھی کہ ان کے پہنچنے سے ایک دن قبل دلکشا کی تمام ترتیب اور تہذیب مکمل ہو جائے۔ بلا مبالغہ سیکڑوں آدمی مختلف فرائض پر لگے ہوئے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس رات سونا تو در کنار آرام کرسی تک پر ان کی آنکھ نہیں جھپکی۔ اس رات کو انھوں نے کھانا تک نہ کھایا تاکہ طبیعت پر کسل اور آرام طلبی کا خیال نہ آنے پائے۔ دو تین مرتبہ چائے پی کر رات گزار دی۔ ان کی میز پر ٹیلیفون تھا جس کا سلسلہ ان تمام مقامات سے تھا جہاں جہاں دلکشا کی وسعت میں قیامگاہوں، پنڈال وغیرہ کی تعمیر ہو رہی تھی جب وہ تھک کر اپنے آفس میں آ گئے تو پھر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ٹیلیفون کے ذریعہ سے ہدایات اور تاکیدوں کا سلسلہ جب تک صبح کی پو نہ پھٹ گئی جاری رہا۔

بے شک ناچ رنگ کی مجلسوں میں تھیٹر اور تماشا گاہوں میں عیش و عشرت کے خلوت کدوں میں

راتیں آنکھوں میں کٹ سکتی ہیں لیکن ایک قومی اور تعلیمی مجلس کے اہتمام میں ایسی بلند ہستی کا اپنے جسم کو تکلیف دینا ایسا پرحوصلہ نظارہ تھا جو دیدنی تھا نہ کہ گفتنی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

اُنھوں نے مہمانوں کی مدارات وغیرہ میں چالیس ہزار روپیہ صرف کیا۔

۱۹۰۸ء میں نواب وقار الملک آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے نواب صاحب سے اجلاس منعقدہ امرت سر کی صدارت منظور کرنے کی خواہش کی۔

چنانچہ اجلاس مذکور اس کامیابی کے لحاظ سے کہ مسلم یونیورسٹی کی تجویز کو تقویت دینے کی غرض سے سب سے پہلے پچاس ہزار روپیہ کا چندہ اس اجلاس میں ہوا تھا ہمیشہ قابل یادگار رہے گا۔

امرت سے لوٹ کر نواب صاحب پہلی مرتبہ علی گڑھ آئے جہاں ان کے درجہ کے لحاظ سے شان دار خیر مقدم کیا گیا۔ کالج کی ہر چیز کو اُنھوں نے غایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ اور مختلف مدات اور ضرورتوں کے سلسلہ میں انھوں نے زرپاشی کی۔

افسوس ہے کہ اس مخیر اور پُرحوصلہ رئیس قوم کی عمر نے وفا نہ کی اور تقریباً (۵۴) برس کی عمر میں ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

خطبۂ صدارت

حضرات اراکین و حاضرین۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جیسے مہتم بالشان مجمع کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُس نے اپنی صدارت سے مجھ جیسے ناچیز اور ژولیدہ بیان کی عزت افزائی فرمائی۔ آپ حضرات مجھے بحکم ظَنُّ الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا جو کچھ خیال فرمائیں۔ مگر بمصداق صَاحِبُ الْبَیْتِ اَدْرٰی بِمَا فِیْہِ اپنی حالت سے بخوبی آگاہ ہوں ایسی حالت میں اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو تو مجھے معاف فرمائیں گے۔ اَلْعَفْوُ عِنْدَ کِرَامِ النَّاسِ مَامُوْلٌ۔

اور ساتھ ہی اس کے آپ حضرات کی اس عنایت و نوازش کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں کہ آپ صاحبوں نے مجھے کراچی کانفرنس کا صدر منتخب فرمایا تھا۔ اور میں بوجہ کثرت مشاغل و اُمورات ضروریہ اُس کی شرکت سے قاصر رہا اور پھر دوبارہ اس کانفرنس کی صدارت سے مجھے

ممتاز فرمایا - اگرچہ میری حالت صحت مجھے اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں اتنی دور کا سفر اختیار کروں اور اس شاندار مجمع میں شریک ہوں - مگر آپ حضرات کے اخلاص نے مجھے مجبور کیا اور ڈھاکہ سے یہاں تک کھینچ لایا - ڈھاکہ امرت سر سے سیکڑوں منزل پر واقع ہے - مگر میں یقین کرتا ہوں اور یقین کرنے کے کافی وجوہات میرے پاس موجود ہیں کہ اپنے وطن میں ہوں - میرا خیال ہے کہ امرت سر کی آبادی پنجاب میں بلحاظ کشمیری آبادی کے بہت زیادہ ہے اور اپنے خواص اور پیداوار اور صنائع کے اعتبار سے ثانی سری نگر ہے اور شاید آپ حضرات واقف ہوں گے کہ میں کشمیری الاصل ہوں اس حیثیت سے اپنے موجودہ وطن سے جس قدر آگے بڑھوں گا اصلی وطن یعنی کشمیر مجھ سے قریب ہوتا جائیگا میرے جد امجد مرحوم نواب سر خواجہ عبدالغنی کے سی ایس آئی اور والد ماجد مغفور سر خواجہ احسن اللہ کے سی آئی ای رحمۃ اللہ علیہما باوجود عالمگیر شہرت اور ملکی و قومی محبت کے ہمیشہ سیاسی تعلقات سے مجتنب رہے اور کبھی پولٹیکل اسٹیج پر قدم نہیں رکھا لیکن اس گمنام ناچیز انام نے جب دیکھا کہ پیارے مقبول رسول پاک صلعم کی پیاری امت تباہ ہو رہی ہے ضروری سمجھا کہ جہاں تک ہو سکے گو خود تباہ ہو جاؤں مگر امت مرحومہ کو بقدر امکان تباہی سے بچاؤں اور ان کی مشکلات کو علیٰ قدر حال دور کرنے کی کوشش کروں اَلسَّعیُ مِنِّی وَالاِتمَامُ مِنَ اللہِ تَعَالٰے یہی خیال ہے کہ مجھے امرت سر کھینچ لایا ورنہ بوجوہات چند در چند جن کی تفصیل بیان ضرور نہیں اور جن سے آپ حضرات واقف ہوں گے ڈھاکہ چھوڑنا مجھے اس نازک وقت میں کس قدر دشوار تھا آپ حضرات بخوبی جان سکتے ہیں -

حضرات ! ہمارے برادرانِ ملت ہمارے صوبہ میں جن قیامت خیز ہنگاموں میں مبتلا ہیں اور ہمارے حلقہ آبادی میں جس قسم کی پُر فساد ہوا چل رہی ہے وہ پولٹیکل تعلقات کی ہوا ہے اور اُسی کے ہم خوگر ہو رہے ہیں - میرا مقصد یہ نہیں اور نہ میں اس کے لئے بلایا گیا ہوں کہ ان دونوں جن مصائب اور آفات میں ہمارے صوبوں میں اسلامی تمدن گھرا ہوا ہے یا اس کے متعلق ہندوستان کے اہل اسلام کی جیسی نازک حالت ہے اُس کو بیان کروں - اگرچہ اُس کے اظہار کو میں مناسب سمجھتا ہوں مگر میری کانفرنس اجازت کہاں دیتی ہے کیوں کہ وہ اپنے کو پولٹیکل تعلقات سے دور رکھتی ہے اور اسی سے اس کی خیر و بہبودی وابستہ ہے - مگر اُس کے ساتھ اس کو بھی تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ کوئی قوم بغیر پولٹیکس کے زندہ نہیں رہ سکتی اور فی الحقیقت ہماری کانفرنس تمام ملکی پولٹیکل مجامع اور مجالس سے بہت بڑھ کر پولٹیکل تعلقات کا مخزن ہے - فوائد تعلیم کی اشاعت اور اُس کی تحصیل کی سہولت و آسانی کا پیدا کرنا بغیر تعلیم یافتہ افراد کی تائید کے میسر ہونا ممکن نہیں اور ہماری کانفرنس

علماء وفضلائے وقت کا مجمع ہے۔ اس صورت میں یہ کانفرنس پولیٹکس کی اصل اصول ہے۔ مجھے اس موقع پر اور بھی چند جملوں کے عرض کرنے کی ضرورت پڑی اور وہ یہ ہیں کہ بعض تعلیم یافتہ اشخاص کانفرنس کی شرکت کو اس وجہ سے ضروری نہیں سمجھتے کہ اُس میں مشروحاً پولیٹکس کا ذکر نہیں ہوتا۔ مگر اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی اشاعت جو ہماری کانفرنس کے عمدہ ترین نتائج سے ہے دنیا کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور یہ اُس وقت کہ کانفرنس اپنے مقاصد میں علیٰ وجہ الکمال کامیاب ہو جائے اور اس کا کمال یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم اسلامی اخلاق اور مذہبی تربیت سے آراستہ ہو جائے اور اس قسم کے تعلیم یافتہ پولٹیکل معاملات کے محرک ہوں اور ایسے پولٹیکل امور ملک وقوم ونیز گورنمنٹ کے لئے مفید ترین اور اہم امور ثابت ہوں گے۔ اور اسی قسم کی پولٹیکل تحریکوں پر پبلک اور نیز گورنمنٹ کی نظر انتخاب پڑے گی اور اب جن لوگوں کو پولٹیکل تحریروں اور تقریروں سے انکار رہے وہ خوشی سے مان لیں گے کہ مناسب اور جائز پولٹیکس سے ایک متنفس الگ نہیں رہ سکتا۔

حضرات! میں کنسروٹیو مسلمان ہونے کی وجہ سے مرحوم گرینڈ اولڈ مین **سرسید احمد خاں بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی** کے مذہبی خیالات سے اتفاق نہیں کرتا۔ مگر اُن کی قومی بہبودی کے خیالات اور مسلمانوں کی اصلاح وفلاح اور بیش قیمت مفید تدبیروں کا مجھے برابر اعتراف ہے اور اس بارہ میں ان کا ہم خیال ہوں۔ جب اُنھوں نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز حشر انگیز غدر کے بُرے نتائج کو تعمق کی نظر سے معائنہ فرمایا۔ اُن کے دل میں ایک تمدنی اُمنگ پیدا ہوئی۔ مگر چونکہ اس وقت عام طور پر تمام ہندوستان میں ایک افسردگی اور مردنی چھائی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ غدر کے الزامات میں مبتلا ہو کر تباہ وبرباد ہو چکے تھے اور بہت سے گمنام ہو کر افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سرسید نے دیکھا کہ مسلمانوں کی مقابل قوم غلط اور بے بنیاد اتہام مسلمانوں کے سر تھوپنے کی کوشش میں ہے اُس وقت اُس جہاں دیدہ اور مدبّر بزرگ نے بزور ان خیالات کی تردید کی اور مسلمانوں کی فلاح کی یہ صورت نکالی کہ فاتح قوم سے ان کو مانوس کیا جائے اور مغربی تعلیم کا مسلمانوں میں رواج دیا جائے۔ چنانچہ ایک زمانہ دراز کے بعد بعنایت ایزدی اُن کی گرمجوشانہ اور مخلصانہ کوشش بحکم لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلّا مَا سَعیٰ مشکور ثابت ہوئی اور مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوئے۔ ملک میں جتنے جلسے اور انجمنیں علمی دیکھی جاتی ہیں گو وہ بادی النظر میں اعلیٰ درجہ کے فوائد کے گنجینہ ہیں مگر اکثر **سرسید احمد** کی مقلد ہیں اور وہ سب کی سب سیاسی تعلقات سے الگ سمجھی جاتی ہیں۔

حضرات! ابھی میں نے ذکر کیا ہے کہ اہل اسلام کو پہلے انگریزی تعلیم سے انکار تھا اب بھی پرانے خیال کے ایسے لوگ موجود ہیں جن کی رائے میں انگریزی پڑھنا پڑھوانا کفر ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کی وجہ پر غور فرمایا ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ صرف مذہبی خیال ہے۔ سرسید احمد کو ایسے لوگ گالیاں دیا کرتے تھے اور وہ اُن گالیوں کو سُن کر خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ہم کو مذہب کا مخالف سمجھ کر گالیاں دیتے ہیں۔ شکر ہے کہ اُن کو اتنا بھی مذہب کا پاس ہے ہم کو اس موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ ہم کو چاہیئے کہ اُن پرانے خیال والوں کے طعن وتشنیع کی طرف توجہ نہ کریں اور اس امر پر غور کی نظر ڈالیں کہ کیا انگریزی تعلیم اسلامی عقائد کے مخالف ہے؟ اور اسی طرح حضرات مخالفین کانفرنس بھی غور فرمائیں کہ باعث مخالفت کیا ہے؛ ہم کو سوچنا چاہیئے کہ انگریزی تعلیم میں کونسی خرابی ہے۔ اگر فی الحقیقت کوئی خرابی ہے تو کیا ہے اور اُس کے دفعیہ کی کیا صورت ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس مادہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کروں محض انگریزی تعلیم یا اور کسی زبان کی تعلیم فی حد ذاتہ عقائد اسلام کے خلاف نہیں۔ ہاں طرز تعلیم اور بعد تحصیل تعلیم اس کے ناجائز استعمال سے بُرا اثر ضرور پیدا ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں جیسا فلسفہ اور دہریت پھیلی ہوئی ہے اس کے پیشتر بھی اسلام اس سے زیادہ بلائے دہریت میں مبتلا رہا ہے۔ اس زمانہ میں تو خیر سے ایک مسلمان بھی صحیح معنی پر فلاسفر نہیں ہے اور نہ کوئی کسی اصول خاص کا موجد اُس وقت گھر گھر فلسفی اور گلی گلی موجد اور مخترع تھے۔ کہا جاتا ہے اور شاید صحیح بھی ہو کہ اُس وقت کے علمائے اہل اسلام نے فلسفہ کے جواب میں علم کلام کو ایجاد کیا۔ جس سے فلسفہ کی بنیاد کمزور ہوگئی۔

حضرات! اس وقت علم کلام سے زیادہ طرز تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ابتدائی تعلیم میں ایسی صورت کیوں نہ اختیار کی جائے کہ ہمارے بچے شروع ہی سے اچھے عقائد مذہبی سے آراستہ و پیراستہ کئے جائیں اور شروع ہی سے انھیں عقائد اسلام کی تعلیم دی جائے۔ عالم طفلی میں خزانہ دماغ فضول خیالات اور بُرے عقائد سے صاف رہتا ہے تعلیم اور تربیت کا اثر عمدہ طور سے ہوتا ہے اس منشاء کے حصول کے لئے بورڈنگ سسٹم بہت ہی موزوں طریقہ ہے بشرطیکہ بورڈنگ میں عقائد اسلام کی تعلیم کے کافی سامان موجود ہوں انھیں خیالات کی بنا پر ہم نے اپنے صوبہ کی دارالسلطنت میں ایک اسلامی بورڈنگ اعلیٰ پیمانہ پر قایم کرنے کی تجویز کی ہے۔ گورنمنٹ نے بکمال فیاضی اُس کی امداد کا وعدہ کیا ہے جس کے ہم تہ دل سے ممنون ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی ہمارے صوبہ کے دوسرے شہروں میں اسلامی ہوسٹلوں کی تائید فرمائی ہے۔ مگر جو فوائد ہمارے مرکوز خاطر ہیں وہ ابھی وقت حاصل

ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو ہوسٹل کی چار دیواری کے اندر بند کر رکھنا ہی پسند نہ کر کے اُن کے اخلاق و عادات کی نگرانی اسلامی تربیت کے ساتھ کرتے رہیں اور اُن کو عملاً اور قولاً مسلمان بنا کر دکھا سکیں اور ہمارے ہوسٹل کے نمونے اور شہروں اور صوبوں کے مسلمان قایم کر سکیں اور پھر گورنمنٹ سے امداد کے طالب ہوں تو امید قوی ہے کہ وہ اپنی عزیز اور پیاری رعایا سے فیاضانہ تائید میں ہرگز دریغ نہ کرے گی۔

علی گڑھ کالج مسلمانوں کے لئے باعث افتخار رہے اور اکثر اعتبارات سے ہندوستان کے موجودہ کالجوں میں ممتاز لیکن بات اسی قدر ہے کہ وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کافی نہیں وہ مسلمانوں کا قومی دارالتعلیم ضرور ہے لیکن مقامی ضرورتیں اور مسلمانوں کا افلاس ہر شخص کو علی گڑھ کالج پہونچا دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور جب کالجوں اور اسکولوں میں لڑکے بھیجے جاتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اُنھیں کالجوں یا اسکولوں میں ہوسٹل قایم نہ کئے جائیں اور کیوں اُنھیں اُن کے وطن ہی میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ عقائد اسلامی کے سیکھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اور کیوں ان کو ایک مرکز خاص (علی گڑھ) سے مخصوص کر دیا جائے۔ علاوہ بریں اگر ہم چھوٹے پیمانہ ہی پر کیوں نہ علی گڑھ کالج کے نمونے قایم کر سکے تو اسلامی یونیورسٹی قایم کرنے کا ایک اچھا رستہ نکل آئے گا۔ اور اگر ہماری یونیورسٹی قایم ہو گئی تو ہماری اس ترقی کا اثر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جائے گا اور یہ ہمارے لئے نہ فقط باعث افتخار ہی ہوگا بلکہ ہماری تعلیمی نجات کی سب سے عمدہ شکل نکل آئے گی۔ ایسی تربیت گاہوں اور تمام اسلامی ہوسٹلوں کی نسبت میں ایک اور رائے دینا چاہتا ہوں گو اسے میں مانتا ہوں کہ اکثر طلبہ خاص وہ جو کالجوں میں پڑھتے ہیں ایسی تربیت گاہوں سے زیادہ مستفید نہ ہوں گے۔ لیکن جب تک ایسے ہوسٹل قایم نہ ہوں ہم معطل کیوں رہیں۔ میرے خیال میں ذیل کے دو کام اس وقت بھی بہت مفید ہوں گے۔ اول یہ کہ طلبہ کے قیام گاہوں میں لکچر دینے کا انتظام کریں اس کے لئے باعمل مخلص عالموں کی ضرورت ہے۔ گو یہ فرقے انگریزی تعلیم یافتوں کے اخلاق و عادات کو کسی قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تاہم جب وہ ہم کو عقاید اسلامی کی طرف راغب دیکھیں گے ضرور ہماری تائید کریں گے اگرچہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت اسلامی تباہ ہے تاہم ہزاروں لاکھوں مردانِ خدا ایسے ضرور ملیں گے کہ خدا کو خلوص عقیدت سے معبود برحق جانتے اور ماننے والے ہیں۔ ایسے مواعظ و نصائح بے شک طلبہ کو مفید ہوں گے اور ایسے عالموں کی صحبت اُن کو اکسیر سے زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

دوسرا کام یہ ہے جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں اس سے طلبہ کی مذہبی اور تمدنی مشکلات کے دفع ہونے کی مفید اور تشفی بخش صورت نکل سکتی ہے۔ میں نے کچھ دنوں اس پر غور کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دل میں کسی قسم کا خیال پیدا ہونا اور اظہار نہ کرنا اور دل ہی دل میں اُس کا گھٹ کر رہ جانا مذہبی اور تمدنی غلطیوں کی مضبوطی کا باعث ہوتا ہے مجھے بڑی خوشی ہے کہ نواب **وقار الملک بہادر** نے اس مشکل کے دفع کرنے کی ضرورت کو محسوس فرمایا ہے اور کالج یونین میں عام اجازت دیدی ہے کہ طلبہ ہر قسم کی پولٹیکل تقریریں آزادی سے کریں تا کہ اُن کے غلط اصول اور ناقص آراکی اصلاح کردی جائے اور گھر ہی سے خیالات کی تہذیب شروع ہو۔ میں نواب صاحب کو اس عطائے آزادی اور اصلاح کی مبارکباد دیتا ہوں اور یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ مذہبی تقریروں کی آزادی مرحمت ہو تاکہ مذہبی غلطیوں کی اصلاح بھی گھر سے شروع ہو۔ لیکن جب اصلاح کے سامان اور اسباب مہیّا نہیں تو صرف تقریریں ذہانت اور جودت کی تفریحی جولان گاہیں ہیں۔

محمدن یونیورسٹی کے متعلق ایک زمانہ تک بہت کچھ تحریر و تقریر ہو چکی ہے۔ اس کی نسبت میرا کچھ کہنا شاید تحصیل حاصل ہو لیکن ایسا حوصلہ افزا اور مبارک خواب جو مسٹر **محمود** مرحوم نے علی گڑھ میں دیکھا تھا اور جس کی تعبیر کے ظاہر ہونے کی اب توقع ہوتی ہے، اس پر ایک زمانہ سے مسلمانوں کی مقابل قومیں ہنس رہی ہیں مگر سب سے پہلے قومی یونیورسٹی جاری کرنے کی تحریک و تدبیر ہمیں لوگوں نے کی ہے۔ اب وہی قومیں جو محمدن یونیورسٹی کی تحریک پر ہنستی تھیں نیشنل یونیورسٹی کی ضرورت سمجھ رہی ہیں میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں کنسرویٹو مسلمان ہوں اس لئے ہر مضمون کے غور کرنے کے وقت مذہب کو معیار بناتا ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ لوگ ہمارے کالج کے طلبہ کو امورات دینیہ سے بے خبر و غافل سمجھتے ہیں میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ علی گڑھ کالج پر منحصر نہیں ہے بلکہ اکثر انگریزی تعلیم یافتوں میں باستثنائے معدودے چند مذہب کی محبت اور امورات مذہبیہ کی واقفیت بہت ہی کم پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلامی تعلیم اُن کو دی ہی نہیں گئی اور مذہبی تربیت کی انھیں ہوا بھی نہیں لگی پھر اُن سے مذہب کی محبت کی امید کیوں کر کی جا سکتی ہے۔

حضرات! بورڈنگ کی اسلامی تربیت و تعلیم بچوں کے لئے ضرور مفید ہو گی۔ مگر بڈھے طوطوں کی فہمائش اور کالج کے ہوشیار طلبہ کے معقول کرنے کے لئے ہم کو اسلامی فلسفہ اور دینی علوم بھی مطالعہ کرنا چاہئے اور تعلیم انگریزی کے ساتھ ساتھ ابتدا سے مذہبی کتابوں کا کورس بھی انتخاب ہونا ضروری ہے جس سے ہمارے بچے مسلمانیت سے خارج نہ ہوں اور دہریت کی زہر آلود

ہوا اُن کے دل و دماغ کو تباہ نہ کردے مگر قانون یونیورسٹی اس امر کی اجازت دے گا یا نہیں فیہِ نظر ہے۔ ہاں جس وقت ہماری یونیورسٹی قایم ہوگی اور گورنمنٹ کی رعایت خاص ہم کو عزت بخشے گی۔ اس وقت ہم اپنی دینی اور دنیوی ضرورتوں کے موافق کورس تیار کر سکیں گے اور نہایت آسانی سے حسب منشا عقاید اسلام بچوں کو تعلیم دے سکیں گے۔ اس لئے محمڈن یونیورسٹی کے خیال سے ایک منٹ کے لئے بھی ہم کو غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ اور جہاں تک جلد ممکن ہو محمڈن یونیورسٹی قایم کر دی جائے کوئی کیسی ہی ضروری کارروائی ہو جب تک عام دلچسپی پیدا نہ کرے اور قوم اُس کی طرف یکساں راغب نہ ہو اس کے جاری ہونے کی امید کرنی نہ چاہیئے۔ علی گڑھ کالج ہو یا محمڈن یونیورسٹی۔ پبلک جب تک ہمدردی نہ کرے کامیابی ممکن نہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ ہمدردی کے پیدا کرنے کا ذریعہ اراکین کانفرنس کے ہاتھ آگیا ہے وہ لوکل کمیٹیاں ہیں مگر افسوس ہے کہ تمام ہندوستان میں جس کے اکثر اضلاع میں مسلمانوں کی آبادی بکثرت ہے کل اٹھتیس کمیٹیاں قایم ہوئی ہیں کیا یہ تعداد مسلمانوں کی ضرورتوں کو کافی ہے یا ہمیں اس سے پوری کامیابی کی امید ہوسکتی ہے؟ اگر آپ حضرات زندہ قوم بننا اور عزت کے ساتھ مقابل قوم کا ہم رتبہ ہو کر ہندوستان میں قایم رہنا چاہتے ہیں تو کمیٹیوں کی تعداد بڑھائیں اور گرمجوشی و استقلال کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوں۔ ہر مسلمان کو ضروری ہے کہ محمڈن یونیورسٹی کی مالی قلمی تائید سے دریغ نہ فرمائیں اور جس طرح ہو سکے اُسے قایم کر دیں تاکہ ہم اپنے مذاق اور خیالات کے مطابق تعلیم حاصل کر سکیں اور انگریزی طرز تعلیم میں جو ضرر اور نقصان ہیں۔ اُن کے دفعیہ کی صورت نکال سکیں۔

حضرات! جب ہم مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی اشد ضرورت ہے اور فی الحال سب لڑکوں کو علی گڑھ بھیج دینا ناممکن ہے اور بورڈنگ سسٹم کا اجرا ابھی سردست تمام مقام میں محال ہے۔ اس وقت ہماری نئی نسل کے لئے کیا تدبیر کرنا چاہیئے جو اسکولوں میں داخل ہو رہی ہے۔ میری رائے ناقص میں یہی تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان کو عملی مسلمان بنانے کے لئے قبل اس کے کہ وہ اسکولوں میں داخل کرائے جائیں کم از کم نماز کے ضروری مسائل اور ارکان شریعت کی تعلیم کر دی جائے کیا یہ مسلمانوں کے لئے شرم کی بات نہیں ہے کہ بعض اشخاص باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اس سے بھی واقف نہیں کہ نماز کیوں کر پڑھتے ہیں طہارت کس کو کہتے ہیں۔ وضو کس طرح کرتے ہیں۔ نہ اپنی عمر کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ نماز اور روزہ وغیرہ کے مسائل سیکھیں اور عمل کریں۔ میں جانتا ہوں کہ یونیورسٹی کے قواعد اور زمانہ تعلیم میں یہ باتیں کس قدر دشوار ہیں۔ مگر جب ہمیں اسلامی حیثیت سے ترقی کرنی چاہیئے تو

ان دشواریوں کا دفعیہ ضرور ہے۔ یہ کانفرنس اس لئے منعقد ہوتی ہے کہ تعلیم کی مشکلات کو حل کرے ہم دنیوی معاملات کے پیچ وخم کے نکالنے میں کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں تو کیا دین کی مشکلات کے دفع کرنے میں ایک ذرا سی کوشش بھی ہم سے نہیں ہو سکتی۔ بچوں کی تعلیم کے متعلق میں عرض کرتا ہوں کہ کسی قسم کی اصلاح کیوں نہ ہو۔ اول میں جب اس کی فکر کی جاتی ہے تو آسانی سے کامیابی ہوتی ہے۔ سرسید اگر کالج پہلے ہی بناتے تو شاید ایسا کار آمد اور مفید نہ ہوتا جیسا اب بتدریج ہوا اسلامی تعلیم تقوٰے اور خدا پرستی کا یہی حال ہے ہم کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو اوامر و نواھی سے بطریق ترغیب و ترہیب کے آگاہ کریں اور اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ جزو سے بھی فروگزاشت نہ کریں۔ کیوں کہ چھوٹی باتوں کی بے پروائی سے اکثر بڑی باتیں فوت ہو جاتی ہیں اور ہم اپنے بچوں کو اہل یورپ اور دیگر اقوام غیر اسلام کی غلط اور ناجائز تقلید وتتبع سے بچائیں تاکہ مذہبی اور قومی رسم و رواج میں مستقل اور ثابت قدم ٹھیریں اور ایک زندہ اولوالعزم قوم بننے کے قابل ہوں جب تک ہماری روش مسلمانوں کی سی نہ ہو گی ہرگز ہم مسلمان کہلا نہیں سکتے اور اولوالعزمی حاصل نہیں کر سکتے۔

حضرات! اب میں آپ صاحبوں کی توجہ تعلیمی مردم شماری کی طرف معطوف کرانا چاہتا ہوں تعلیمی مردم شماری ہمارے کالج کے سابق پرنسپل مسٹر تھیوڈور ماریسن کی جاں فشانی اور دماغ سوزی کا نتیجہ تھا۔ انڈیا میں بفضلہ تعالے مسلمانوں کی تعداد علاوہ ان کی پولٹیکل حالت کے ایسی مختصر نہیں ہے لیکن اور ہمارے ہم عصر تعلیم یافتہ اقوام اور ان کی موجودہ نسلیں جو اسکول اور کالج میں بمقابلہ اُن کے ہیں سوائے ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے دوسرے ملکوں کے حصص میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی رفتار بہت سست اور دھیمی ہے۔ برگزیدگان قوم کو اس طرف کافی توجہ کرنی ضرور ہے۔ ان کو لازم ہے کہ اُس کے وجوہات دریافت کریں۔ میں اپنی تحقیقات کے بموجب کہہ سکتا ہوں کہ صرف افلاس کو اس کی وجہ ٹھہرانی صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ افلاس بھی مانع تعلیم ہے۔ مگر اس سے اتنا ضرر نہیں ہوتا جتنا مسلمانوں کی بے پروائی اور غفلت سے ہوتا ہے۔ خاصۃً یہ مرض زیادہ تر متمول اشخاص میں پایا جاتا ہے۔ اگر یہ متوجہ ہوتے تو ثروت وفارغ البالی سے بسہولت اپنی اولاد کی تعلیم کر سکتے تھے۔ حالاں کہ تعلیم کی ضرورت جس قدر اُن کی اولاد کو ہے کسی کو نہیں کیوں کہ یہ بجز تعلیمی مشاغل کے اور کسی کام کے نہیں ہماری کانفرنس کا فرض ہے کہ پہلے اُن کو تعلیمی ضرورتوں کی طرف متوجہ اور اُن کو علم کے فوائد اور جہل کے مضار سے مطلع کریں دوسرا مانع ترقی تعلیم مسلمانان میرے خیال میں یہ ہے کہ مسلمان لڑکے اسکول میں اپنی مقابل قوم کو اس طرح غالب پاتے ہیں اور تعلیم گاہ کی در و دیوار سے ایسی مخالفت اور تعصب کی بو آتی ہے جس کی وجہ سے اُن کو

ایسی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے میں بہت دقت پیش آتی ہے اور تعلیمی ترقی مشکل ہو جاتی ہے اور اس سے بڑھ کر ایک مصیبت غیر مسلمان ٹیچروں کی زبان ہے۔ ہمارے صوبوں میں علی العموم شہر کے مسلمان اُردو بولتے ہیں اور مضافات کے لڑکے مسلمانی بنگلہ میں بول چال کرتے ہیں۔ اس کو بھی ہندوؤں کی زبان سے کوئی مناسبت نہیں ایسی حالت میں ہندو اُستادوں کی زبان سمجھنے میں لڑکوں کو بڑی وقت پیش آتی ہے۔ یہ بلا صرف مشرقی بنگال ہی میں نہیں بلکہ صوبجات ہند میں بھی یہ آفت پھیلی ہوئی ہے اور جب ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں یہ شکایت سنی جاتی ہے جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے روزمرہ میں چنداں فرق نہیں تو اور جگہ کا ذکر کیا۔

یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ ہم کو بہ نسبت دیگر ہمعصر اقوام کے بورڈنگ سسٹم یا الگ اسکولوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے دفعیہ میں کانفرنس نے کچھ کوشش کی ہے اور مسلمان ٹیچروں کے ٹریننگ کے لئے کچھ اسکالرشپ کی منظوری ہوگئی ہے اور اسی طرح ہمارے صوبہ کے پراونشیل محمڈن ایسوسی ایشن کی متواتر تحریکوں سے بغرض ترقی تعلیم و بوجہ ضرورت شدید ڈائرکٹر بہادر پبلک انسٹرکشن نے دوسرے صوبوں سے مسلمان ٹیچروں کی درخواستیں منگوائی ہیں جن کو ہم نے اپنی انجمن کے ذریعہ سے ان کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ شکر ہے کہ کچھ لوگ مقرر بھی ہو گئے ہیں۔

حضرات! اگر تعلیمی مردم شماری مکمل ہو جاتی تو ہم بسہولت اُس کی نسبت کچھ رائے قائم کرتے اور اس کے خیر و نقصان کی کوئی صورت نکالتے۔ افسوس ہے ممالک متحدہ میں جو کانفرنس کا گھر ہے چار پانچ جگہوں کے سوا ایک اہم کام انجام نہ ہو سکا تعلیمی مردم شماری سے ہمارے بہت کام نکلتے اور اس سے اچھے سبق ہم لے سکتے۔ اگر کانفرنس لوکل کمیٹیوں کے قائم کرنے میں کامیاب ہوئی تو یہ کام بہ احسن الوجوہ آسان ہو جائے گا۔

حضرات! اگر اراکین کانفرنس تعلیمی مردم شماری کو ضروری خیال فرماتے ہیں تو مستقل مشاہرہ دار ایجنٹ مقرر فرمائیں صرف آنریری عہدے اور زبانی شکریہ سے کام نہیں نکلے گا اور ہماری قوم کے چند سربرآوردہ معززین کو اس طرف متوجہ ہو کر تعلیمی مردم شماری کے ایجنٹوں کو بہ سہولت کام کرنے کا موقعہ دینا بھی ضرور ہے۔ ابھی میں نے یہ ذکر کیا ہے کہ تعلیمی مردم شماری کے بعد ہم کچھ اچھے سبق حاصل کر سکیں گے۔ اُن سبقوں سے مراد زراعت، صناعت اور تجارت کی تعلیم ہے۔ مردم شماری کے نتائج سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ مسلمانوں میں درحقیقت پانچ طبقہ کے لوگ ہیں۔ پہلا طبقہ اکثر دنیا سے بے خبر آسودہ حال زمینداروں کا ہے اُن کی حالت وسائلِ ترقی کے عدم استعمال سے روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ

اشاعت تعلیم کی ضرورت ہے اور اب بھی ان کا حال ایسا ہے کہ خراجات تعلیم کے بارگراں کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اور اپنا بوجھ قوم پر ڈالے بغیر قوم کی مدد کر سکتے ہیں۔ اُن کو سرکاری ملازمت کی پرواہ نہیں۔ ان سے ہمیں امید ہے کہ یہ علم سے کامل طور سے بہرہ مند ہو کر قوم اور ملک کے نفع رساں ثابت ہوں گے۔ اگر فارغ البالی اور آسودگی نہیں تو ہزار قابلیت کیوں نہ ہو انسان کچھ نہیں کر سکتا جو خود روٹی کا محتاج ہے۔ وہ دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ بفضلہ تعالےٰ اب بھی مسلمانوں میں اس طبقے کے لوگوں کی زیادہ کمی نہیں۔

دوسرا طبقہ ملازمت پیشوں اور آزاد علمی پیشہ والوں کا ہے جیسے وکلاء اور ڈاکٹر وغیرہ ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں گو اب تک متقابل قوم کی تعداد تک نہیں پہنچی۔ ان کی ایک جماعت وہ ہے جس کی آمدنی ماہوار دوسو روپیہ سے زیادہ ہے اور دوسری وہ ہے جس کی آمدنی اس سے کم ہے ان کو عموماً فوائد تعلیم کے بتانے کی ضرورت نہیں خود تعلیم سے بہرہ ور اور اس کے منافع سے واقف ہیں۔ موخر الذکر جماعت جس کی آمدنی دوسو روپیہ سے کم ہے۔ ضروری مدد کی محتاج ہے تیسرا طبقہ قدیم خاندانوں کے سفید پوشوں کا ہے اُن کے وسائل معاش مختصر ہیں۔ دوسرے طبقہ کی دوسری جماعت سے اُن کی حالت مطابقت رکھتی ہے۔ دونوں کی اولادیں سوائے علمی اشغال کے دوسرے کاموں سے غافل اور بے بہرہ ہیں ایسے لوگوں کو اسکالرشپ دیکر تعلیم میں مشغول کرنا نہایت ضرور ہے فی الواقع یہ سب سے زیادہ محتاج اور مستحق امداد ہیں۔ چوتھا طبقہ تجارت پیشوں کا ہے۔

حضرات! جن لوگوں نے مسلمانوں کی ترقی صرف انگریزی ملازمت میں محدود رکھی ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ قومی ترقی اور تمدن کے یہ معنی نہیں کہ اُس میں صرف بڑے بڑے تعلیم یافتہ اشخاص نظر آئیں۔ بلکہ اُس کے افراد میں عام فارغ البالی اور اُن میں تمدن کی ہر صفت ہونی چاہیئے۔ کیا آپ نے کبھی اقوام یورپ کی ترقی کے وسائل یعنی تجارت پر غور نہیں فرمایا ہے؟ ہم آپ کو ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی تاریخ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی ایک زمانہ میں تجارت علی وجہ الکمال جاری تھی۔ پس کیا یہ مناسب ہے کہ جو کچھ شغل تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے بھی اُن کو محروم کر دیا جائے اور اُس کے منافع کے عوض اُن کے ہاتھ میں ڈپلومے دے دیئے جائیں؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ ہم کو مناسب ہے کہ اُن کے لئے تجارت کی تعلیم کا پورا بند وبست کر دیں اور گورنمنٹ کو اس کی طرف متوجہ کریں۔ ہم کو بڑی مسرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بمبئی گورنمنٹ اس اہم مسئلہ کی طرف کچھ متوجہ ہے ہم اپنی قوم کے تجربہ کار افراد سے امید کرتے ہیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے تجارتی تعلیم کے فوائد اور ضرورت پر غور کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ پانچواں طبقہ مسلمانوں کا معمولی پیشہ ور اور کاشتکار

ہیں۔معمولی پیشہ والوں میں ترقی کی گنجائش ہے۔وہ جو کچھ کر سکیں کریں اور جس طرف چاہیں متوجہ ہوں۔لیکن وہ پیشے جو دستکاری سے تعلق رکھتے ہیں اُن کی زندگی بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے سودیشی مومنٹ کیسا ہی زبردست اصول سے کیوں نہو لیکن ملک کی دستکاری میں حسب اقتضائے فطرت زوال آنا ضرور ہے۔مگر جو لوگ زراعت پیشہ ہیں ہمارے صوبہ میں اُن کی فراغ بالی اور آسودہ حالی اسی پیشہ کے طفیل سے ہے زراعت پیشوں کو اُن کے آبائی پیشے سے محروم کرکے یونیورسٹی ایجوکیشن کی طرف کھینچ لانا صریح غلطی ہے۔کیوں کہ نہ تو وہ (ہائی ایجوکیشن) اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ نہ پھر وہ آبائی پیشہ کے قابل رہیں گے۔اس لئے ہماری رائے ہے کہ اُن کے لئے زرعی تعلیم ہی مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔اس سے ملک وقوم اور گورنمنٹ کو یکساں نفع پہونچ سکتا ہے۔چوں کہ ان دنوں علمی طریقہ کی زراعت کا زمانہ ہے۔ضرور ہے کہ اُن کو سائنٹفک اصول سے زراعت کی تعلیم دی جائے اور چونکہ ہندوستان زرعی ملک ہے اس لئے ضروری ہے کہ زراعت کے وسائل ترقی پر سب سے زیادہ غور کیا جاوے اور یہی نیچر کے مطابق ہے۔آپ حضرات یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں موجودہ تعلیم کا مخالف ہوں۔میں تعلیم کا مسلمانوں کے مناسب حال بنانے کی صلاح دیتا ہوں اور اُسے ملک کے لئے زیادہ فائدہ بخش اور منفعت خیز کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔میری رائے ہے کہ تمدن کے لئے مختلف پیشے اور مختلف حیثیت کے لوگ انتخاب کئے جائیں۔یہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک پولٹیکل ضرورت ہے۔بہت جلد ہمیں اور فنون کے ساتھ ساتھ زراعت اور تجارت کی جانب متوجہ ہونا چاہئے۔ایسا نہ ہو کہ ہماری مقابل قوم اس میں بھی ہم پر تفوق حاصل کرے۔

حضرات! مجھے ایک بات اور کہنی ہے اُسے میں ملک اور قوم کے لئے نہایت ضرور خیال کرتا ہوں وہ پروونشیل کانفرنس سے تعلق رکھتی ہے۔بیست سالہ تجربہ سے ثابت ہوا کہ ایجوکیشنل کانفرنس ہمارے لئے بہت ہی مفید اور کارآمد ہوئی۔ہم چاہتے ہیں کہ اسی اصول پر صوبہ وار کانفرنس قایم کریں اور اُس کا اجلاس ایسٹر کی تعطیل میں ہوا کرے۔اس خصوص میں بھی شاید ہمارے صوبہ کو فوقیت حاصل ہے کہ ہم نے باقاعدہ پروونشیل کانفرنس قایم کرلی ہے اس کا اجلاس برابر ہوا کرتا ہے اور اُس نے ملک اور قوم کی تعلیمی ضرورت کے متعلق نہایت عمدگی سے کام کیا ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی کرتی رہے گی۔میری رائے ہے کہ ایسی کانفرنس صوبہ کی ضروریات کے لئے بلحاظ فوائد و باعتبار سہولت نہایت ضروری اور منفعت بخش ہے۔اگر میری رائے پر عملدرآمد کیا گیا اور تعلیمی گرمجوشی ہم میں پیدا ہوگئی تو اس میں شک نہیں کہ جو کام ہم دس برس میں کرتے دو برس میں انجام پا سکیں گے۔آل انڈیا کانفرنس کو

اب جو دقتیں پیش آتی ہیں اُن میں کمی ہو جائے گی کیونکہ ہر جگہ کے لوگ کانفرنس کے فوائد۔ کانفرنس کے کارروائی۔ کانفرنس کے مقاصد اور ضرورت سے واقف ہو جائیں گے۔ اس صورت میں ہماری آل انڈیا کانفرنس کو ہر قسم کی آسانی اور سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس بیان سے میری یہ غرض نہیں کہ ہم ان کانفرنسوں کے اصل کو چھوڑ بیٹھیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ آل انڈیا کانفرنس کی نسبت اور کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگا۔ لیکن آپ کو اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہوں کہ اب کانفرنس کا زمانہ قومی زندگی اور مسلمانوں کے خواب غفلت سے چونکنے کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ مجمع ہے کہ جس میں مشرقی مغربی شمالی اور جنوبی برادران اسلام کو باہمی ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقعہ ملتا ہے اور ایک دوسرے کے خیالات اور جذبات سے مستفید اور متاثر ہوتے ہیں۔

حضرات! اس کو ابھی میں نے بیان کیا ہے اور مجھے یقین کلی ہے کہ اگر پروشیل کانفرنسیں قائم ہو گئیں تو آل انڈیا کانفرنس روز افزوں ترقی حاصل کرے گی اور بہ سہولت تمام اس کی کارروائی انجام پائے گی اور آج ہم اُس کو جس حال میں دیکھ رہے ہیں انشاء اللہ تعالےٰ آئندہ اس کو اس سے بہتر بلکہ بہترین حالت میں دیکھیں گے۔

حضرات! مجھے اپنی بے بضاعتی سے اس کی بھی امید نہ تھی کہ میں اپنے ناچیز خیالات کو آپ حضرات کے سامنے پیش کر سکوں گا اور شاید یہ کام مجھ سے مشکل سے انجام پاتا اگر ابتدا ہی سے آپ لوگ میرا دل نہ بڑھاتے تاہم مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ صاحبوں کا بہت بیش قیمت وقت ضائع کیا جس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ میری کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا سب میرے ذاتی خیالات ہیں اور میں اپنی دانست میں ملک و قوم کے لئے ان کو مفید سمجھتا ہوں اور مجھ کو بڑی مسرت ہے کہ ان کو کسی طرح آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا۔ اگر آپ کو میری ناچیز رائیں پسند ہوں تو آپ عمل درآمد کی صورت نکالیں یا اس پر بحث کریں۔ یہ اراکین کانفرنس کا کام ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

آخر میں میں تمام اراکین کانفرنس ریسپشن کمیٹی امرتسر اور ممبران کانفرنس کی اس عزت افزائی اور خیر مقدم کا جو مجھے اپنے خاندان بھر میں پہلی دفعہ حاصل ہوئی ہے اور جسے میں بڑے سے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں اپنے اور اپنے ممبران خاندان اور اپنے صوبہ کے مسلمانوں کی طرف سے بدل شکریہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام

اجلاس بست و سوم

منعقدۂ رنگون ۱۹۰۹ء

صدر مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے سی آئی ای

تعلقہ دار محمود آباد

حالات صدر

مہاراجہ صاحب! امیر الدولہ سعید الملک ممتاز جنگ بہادر راجہ سر محمد امیر حسن خاں صاحب رئیس محمود آباد (اودھ) کے خلف اکبر اور نسباً حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ اول سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں ہیں۔ مہاراجہ صاحب کا سن پیدائش ۱۸۸۱ء ہے۔

مہاراجہ اپنے نامور باپ کے انتقال کے بعد سن رشد کو پہونچکر مسند نشین ریاست ہوئے۔ اردو فارسی، عربی، انگریزی میں آپ نے لایق استادوں کی اتالیقی میں تعلیم پائی۔ اردو شاعری سے آپ کو خاص ذوق ہے۔ ساحر تخلص فرماتے ہیں اور صنف مرثیہ گوئی میں درجہ کمال کے ساتھ ان کا پڑھنا بھی دیکھنے اور سننے کے لایق ہے۔

مہاراجہ امیر ابن امیر ہونے کے علاوہ منکسر المزاج، با اخلاق، سیر چشم اور فیاض طبع واقع ہوئے ہیں بدو شعور سے انھوں نے سوشیل، پولٹیکل، مذہبی اور علمی خدمات میں حصّہ لینا شروع کیا اور ہمیشہ اپنی دولت، ثروت اور اثر کا بیش بہا حصّہ ملکی اور قومی خدمات میں صرف کیا اور کر رہے ہیں۔ باوصف اس کے کہ ان کا تعلق طبقہ زمینداروں سے ہے اور زمینداروں کا طبقہ قدرتاً حاکمان وقت کے سامنے سر نیاز جھکائے رہتا ہے لیکن ضرورت کے وقت، مہاراجہ صاحب نے نہایت دلیری اور بے خوفی کے ساتھ قوم کا ساتھ دینے میں مشکلات کی مطلق پروا نہیں کی جو زمینداروں کو حکام کی سو مزاجی اور اختلاف رائے کے بعد برداشت



آنریبل مہاراجہ سر محمد علی محمد خان بہادر

صدر اجلاس بست و سوم (رنگون سنہ ۱۹۰۹ع)

کرنی پڑتی ہیں بلکہ جس وقت اور جس زمانہ میں قوم کے طلب حقوق کا وقت آیا اور ان کو ساتھ لینے کی خواہش کی گئی تو انھوں نے بلند آہنگی اور جرأت کے ساتھ قوم کی خواہشوں کا مطالبہ کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا اور طلب حقوق کے وقت نہ اپنے نقصان کی پرواکی اور نہ روپیہ صرف کرنے سے منھ موڑا۔ چنانچہ ۱۶-۱۹۱۵ء میں جب وہ نوجوانان ہندوستان کی حمایت میں مصروف تھے اور علی برادران کے ساتھ اظہار ہمدردی کر کے ان کو قید ورسن کی بندش سے چھڑانے کے لئے ان کے دوسرے دوستوں کے ساتھ شریک کار رہ کر اور کانگریس سے مل کر ہندو مسلم سمجھوتہ میں پیش پیش تھے تو ممالک متحدہ اودھ کے لفٹنٹ گورنر سر جیمس میسٹن ان کے کھلم کھلا مخالف ہو گئے لیکن باوجود اس کے کہ وہ انھیں کے صوبہ کے تعلقہ دار کی حیثیت سے ہر وقت کسر جیمس کی چشم کرم کے امیدوار تھے انھوں نے سر جیمس میسٹن کے خیالات کی مطلق پروا نہیں کی اور جو رائے انھوں نے قایم کی تھی اور جو خیال ان کے پیش نظر تھا وہ برابر اسی رائے اسی خیال اور اسی ڈھن میں مصروف رہے اور پبلک طور پر سر آنر کے خیالات کا جواب انھوں نے ترکی بہ ترکی اخبارات کے ذریعہ سے دیا۔ وہ برسوں مسلمانوں کی پولٹیکل انجمن آل انڈیا مسلم لیگ کی جماعت کے پریسیڈنٹ رہے اور ہزارہا روپیہ کے ذاتی صرف سے مقاصد لیگ کے برلانے میں اپنی توجہ اور اثر کو مختلف طریقوں سے کام میں لاتے رہے مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی امور میں عقدہ کشائی اور رہبری کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دو جماعتیں سرگرم کار ہیں چنانچہ ان دونوں جماعتوں نے اپنے اجلاسوں کے لئے آپ کو صدر منتخب کر کے آپ کے اس اعتراف عزت کی کوشش کی جو آپ کو ملک اور قوم میں حاصل ہے۔

اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ رنگون ۱۹۰۹ء میں جو خطبہ تعلیمی رہنمائی کے وقت آپ نے دیا اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ مسئلہ تعلیم سے آپ کو کس قدر واقفیت کس قدر ہمدردی اور اس ضرورت قومی کا کس درجہ احساس ہے۔ یہ ذمہ داری اور احساس صرف بیان ہی پر ختم نہیں ہو جاتا انھوں نے قومی تعلیم پر اور طلبہ کی اعانت میں لاکھوں روپیہ سے مدد کی ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ میڈیکل کالج، ایسوسی ایشن تعلقہ داران امیر الدولہ ہائی اسکول لکھنؤ، امیر الدولہ پارک لائبریری ان کی مستقل اعانت کے ہمیشہ ممنون رہیں گے۔ خود ان کے اپنی ریاست محمود آباد اور لکھنؤ میں بہت کم تر ایسے قومی اور مذہبی انسٹی ٹیوشن ہوں گے جو ان کے دست کرم سے بے نیاز ہوں لکھنؤ میں ۱۹۰۴ء و ۱۹۱۲ء میں جو جو کانفرنس کے اجلاس ہوئے ان کے انعقاد کے انتظام میں مہمانوں کے اسباب آسائش کی فراہمی اور ان کی کامیابی میں مہاراجہ صاحب کی توجہ اور مالی امداد ہمیشہ شامل

رہی ہے۔ جب صدر دفتر کانفرنس کو مضبوط کرنے کے لئے دوامی گرانٹس کے لئے اپیل کی گئی تو انھوں نے چھ سو روپیہ کی مستقل سالانہ گرانٹ اپنی طرف سے عطا کی، جو سالہا سال سے دفتر کانفرنس کو مل رہی ہے سنہ ۱۹۰۴ء کے سالانہ اجلاس میں جس کے پریسیڈنٹ مسٹر تھیوڈور ماریسن مشہور پرنسپل مدرستہ العلوم علی گڑھ تھے راجہ صاحب نے تمام مہمانان کانفرنس کو حسین آباد کے خوش نما اور پرفضا باغ میں نہایت عظیم الشان شاہانہ پارٹی ہزاروں روپیہ کے صرف سے دی تھی یہ پارٹی ۲۹ دسمبر کو چار بجے شام کے دی گئی تھی اور اس کا انتظام اور اہتمام اس خوبی اور عمدگی سے کیا گیا تھا کہ غالباً سوائے ایسے موقع کے جبکہ کسی وائسرائے یا کسی بڑے فرماں روا کی دعوت کی جاتی ہو۔ ایسے تکلف ایسی شان سے پارٹی کم دی جاتی ہوگی۔

اس اجلاس میں سائنس کی تعلیم کے لئے مدرستہ العلوم کو پینتیس ہزار روپیہ کا گراں قدر عطیہ آپ نے عطا فرمایا تھا اجلاس ناگپور منعقدہ سنہ ۱۹۱۰ء میں ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہ مسلم یونیورسٹی کا امید افزا تخیل جب اپنے ساتھ یورپ سے لے کر ہندوستان کو لوٹے اس زمانہ میں اس تخیل کو وجود میں لانے کا بڑا ذریعہ مہاراجہ صاحب کی ذاتی کوشش اور ان کا اس مقصد سے غایت درجہ کا انہماک تھا جنھوں نے نہ صرف اپنی ذات سے یونیورسٹی کے لئے سوا لاکھ روپیہ کا چندہ پیش کیا بلکہ خود اُٹھ کر پنجاب، سندھ اور صوبہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے مختلف شہروں میں دورہ کرنے کو نکلے اور جہاں گئے مسلم یونیورسٹی فنڈ میں ان صوبوں شہروں اور مسلمانوں کی مختلف انجمنوں کی طرف سے خود چندہ دے کر قلوب میں ہمت اور جوش پیدا کر کے کئی لاکھ روپیہ کا سرمایہ ان کی ہمت اور اثر نے موجود کر دیا۔

مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے حصول چارٹر کی کوشش میں قواعد اور بائی لاز کی ترتیب میں گورنمنٹ آف انڈیا کے تعلیمی ممبر سے زبانی گفتگوؤں اور تحریری مراسلات میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

انھوں نے وائسرائے اور صوبہ کی لوکل گورنمنٹ کی کونسلوں میں بہ حیثیت مسلم نمائندہ ایک سے زیادہ مرتبہ نشست کی اور ہمیشہ قومی مفاد کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی وہ مسلم یونیورسٹی کے سب سے پہلے وائس چانسلر منتخب ہوئے اور آخر سنہ ۱۹۲۵ء میں وہ ہوم ممبر لوکل گورنمنٹ کے محترم عہدے سے مسلسل تین سال کی خدمات کے بعد بڑی عزت و احترام کے ساتھ سبکدوش ہوئے جس کے بعد شہنشاہ معظم کی طرف سے ان کو مہاراجہ کا خطاب عنایت ہوا اور جن کی ذات آج بھی اپنی فیاضی اور قومی ہمدردی کے لحاظ سے مسلمانوں کی قومی خدمت کے لئے وقف خدمت ہے۔

خطبۂ صدارت

حضرات! جس وقت اس خدمت کی بجا آوری کی تحریک مجھ سے کی گئی جس کا بار آج مجھ پر پڑا ہے تو میرا پہلا خیال یہ ہوا کہ میں انکار کردوں نہ اس وجہ سے کہ میں نے اُس عزت کو جو آپ لوگوں نے غایت عنایت سے مجھ کو عطا کرنی چاہی تھی بے حقیقت اور خفیف سمجھا۔ بلکہ اس وجہ سے کہ میں اس جلیل منصب کے لایق ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ سے بہتر اوصاف کے بزرگ اس کام کے واسطے موجود ہیں۔ تاہم میں رنگون کے فیاض اور مہمان نواز مسلمانوں سے ملنے کی خواہش کو ضبط نہ کرسکا اور بالآخر اس تمنّا نے مجھ پر غلبہ حاصل کرلیا۔ آپ حضرات نے مجھے اپنی مجلس کا صدر منتخب فرما کر جو عزت افزائی میری فرمائی ہے اس کی شکرگزاری سے میری زبان قاصر ہے۔ گو میرے نزدیک اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں عمدہ لوگوں کی کس قدر قلت ہے۔ یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ ایسے نازک وقت میں جو ہمارے معاملات کی تاریخ میں درپیش ہے۔ ہماری جماعت کا کوئی مسلّمہ سر گروہ نہیں ہے۔ ہماری قوم میں ممتاز قابلیت کے لوگ مصنف پرانے خیال کے علمار جو علوم شریعت اور ادب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ بیشمار جدید تعلیم یافتہ وکلار اور بہت سے روشن خیال بزرگ موجود ہیں۔ لیکن ایک شخص ایسا نظر نہیں آتا ہے جو دل و جان سے قومی ترقی کا دلدادہ ہو اور ساتھ ہی اس کے پختہ مزاجی، اصابت رائے، وسیع الخیالی اور اعتدال پسندی کا ثبوت دے چکا ہو۔ ایسا شخص جس نے ایثار نفس کشی اور خودداری کی عمدہ مثالیں پیش نظر کردی ہوں اور جو ترقی کی دشوار گزار اور پُرخار راہوں میں ہماری رہبری کرسکتا ہو۔ مثلاً اگر پولیٹیکل کشمکش میں جس کو ابھی چند دن گزرے ہیں اور جب کہ مسلمانوں کے بہترین حقوق کے تلف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ اور وہ ممتاز رئیس یعنی ہز ہائنس سر آغا خاں ہماری دستگیری نہ کرتے اور ہمارے مقاصد کی تنسیق اور تحصیل کے ذمہ دار نہ بن جاتے تو کیسے تباہ کن نتائج نہ پیدا ہوتے۔ لیکن میں معرض بحث سے ہٹا جاتا ہوں۔

حضرات! جو شخص اس کانفرنس کی گزشتہ کارروائیوں پر نظر کرے گا اُس کو ضرور اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس نے تعلیمی اُمور میں مسلمانوں میں سرگرمی پیدا کردی ہے۔ لیکن جب میں اُن کارہائے عظیم کا خیال کرتا ہوں جو ہمارے پیش نظر ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم نے ابھی ابتدا کی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی رفتار کا صحیح اندازہ کرنے کی غرض سے لازم ہے کہ کل ضروریات صیغہ ہائے تعلیم میں اُن کی تعدادی حالت پر نظر کی جائے۔ سب سے پہلے ابتدائی مدارس کے اعداد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں تمام

ملک کے مدارس کی مجموعی تعداد میں بیس فی صدی مسلمان موجود تھے اس سے اُن کی تعداد ابتدائی مدارس میں بظاہر اطمینان بخش نظر آئے گی۔ لیکن اگر آپ صوبہ کی حالت کا جداگانہ موازنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر مختلف ہے۔ سر رشتہ تعلیم کی پالیسی کہ مسلمانوں کے ذاتی مدارس کی اصلاح اور دنیوی تعلیم کی اعانت کی جائے۔ قدر افزائی کی مستحق ہے۔ آپ کی مقامی کمیٹیاں اس امر میں بہت مدد دے سکتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ ہر بڑے شہر میں اس وقت تک قائم نہیں ہوئیں۔ امپیریل کونسل کے گزشتہ بجٹ میٹنگ میں میں نے یہ تحریک کی تھی کہ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ کو مفت دینی چاہیئے لیکن یہ ایک امر ہے اور مجھے خوف ہے کہ ابھی مدت تک اس سمت میں قدم نہ بڑھایا جاوے گا۔

آپ جس قدر اعلیٰ مدارج تعلیم کی جانب نظر کریں گے مسلمان طلبہ کی تعداد کم پائیں گے۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ سکنڈری اسکول یعنی مدارس ثانویہ میں مسلمان طلبہ کی تعداد تمام ملک میں صرف ۱۴٫۲۸ فی صدی ہے۔ جدید قوانین یونیورسٹی کے قیود نے جو مشکلات کہ پیشتر سے درپیش تھیں ان کو بڑھا دیا ہے منجملہ اُن قیود کے ایک یہ ہے کہ آئندہ کسی جماعت میں طلبا کی تعداد تیس سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی اسکولوں کو اکثر اوقات طلباء کے داخلہ سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ اس قاعدہ کا اثر مسلمانوں پر اور بھی سخت پڑا جو کچھ دن پہلے انھیں اسکولوں میں داخل ہونے کے واسطے ہر طرح کی ترغیب کے محتاج تھے۔ گورنمنٹ نے علانیہ یہ کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی جانب سے کوئی نظام مدارس ثانویہ کا مہیا نہیں کر سکتی۔ اُس کی پالیسی یہ ہے کہ ہر ضلع کے صدر مقام میں ایک ہائی اسکول بطور نمونہ کے قائم رکھے۔ اگر ایسے اور اسکولوں کی ضرورت ہو تو ان کا مہیا کرنا خانگی کوششوں پر منحصر ہے۔ علی گڑھ کا اسکول کل قوم کی حاجتوں کے واسطے کافی نہیں ہو سکتا۔ وظائف، معافی فیس اور اسلامی ہوسٹل محض دفع الوقتی کی چیزیں ہیں اور وہ اصلی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اور مدارس قائم کئے جائیں۔ تعلیم انگریزی کے متعلق گورنمنٹ کا طرز عمل اور اس کی روز افزوں ضرورت دونوں صاف بتا رہی ہیں کہ ہم کو اپنی قوم کی تعلیم کا بند وبست خود کرنا چاہیئے۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن اتنا دشوار نہیں ہے جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو ہم کو ہر ضلع میں ایسے مدارس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایسے مقامات پر جو اسلامی آبادی کے بڑے مرکز ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جب وہ مدارس مقامی ضرورتوں کو پورا کریں گے تو ہم کو مقامی مخیر اور مستطیع رؤسا سے اُن کے قائم کرنے کی توقع کرنی چاہیئے۔ اگر دولتمند مسلمان اپنا روپیہ بے امتیازی سے خیرات میں صرف کرنے کے بجائے مدارس قائم کرنے میں اپنے ہم مذہبوں کی اعانت کریں تو وہ اپنی قوم کو بے انتہا فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ میں اودھ کے ایک معزز تعلقہ دار کو جن کی دوستی کا شرف مجھ کو حاصل ہے میں جانتا ہوں

کہ انھوں نے شادی کے موقعوں پر اعزا کو حسب رواج نیوتہ دینے کے بجائے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ اس رقم کو بطور وظیفہ ایسے طالب علم کو عطا کرتے ہیں جو اپنی تعلیم کے اخراجات بہم نہیں پہونچا سکتا یہ نہایت قابل قدر خیال ہے۔ لیکن آپ ایسے ہی بہت سے موقعے پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر صرف یہ امر آپ کے دل نشین ہو جائے کہ حالت موجودہ میں قوم کی تعلیم آپ کا پہلا اور سب سے ضروری فرض ہے۔ مجھے نہایت مسرت ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کی طرف اپنے میلان کا بین اظہار کیا ہے۔ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان طلبہ کی تعداد سرکاری اور خانگی مدارس میں ۱۱۷۸۳ تھی یعنی سات فی صدی سے کچھ زاید مجھے معلوم ہوا ہے کہ دو محمڈن اینگلو ورناکیولر اسکول یعنی مدرسہ اسلامیہ اور مدرسہ رندیریہ یہاں موجود ہیں لیکن دونوں مدرسوں میں مجموعی تعداد طلبا کی ایک سو اکیانوے نفوس سے زائد نہیں۔ غالباً آپ کے فیاض اور اولوالعزم ہموطن مسٹر جمال عنقریب کوئی مدرسہ قائم کرنے والے ہیں۔ آپ کے صوبہ کی رپورٹ سررشتۂ تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم کا اصلی سبب ایک خاص مسلمان ڈپٹی انسپکٹر کا تقرر ہے۔ دیگر صوبجات میں بھی اس کی اشد ضرورت ہے جہاں مسلمان مدرسوں اور انسپکٹروں کی تعداد نہایت کم ہے۔ مجھے صرف دو صوبوں کے متعلق اعداد بہم پہونچ سکے جو سخت اندیشہ پیدا کرنے والے ہیں۔ ممالک متحدہ میں ۳۷ ہیڈ ماسٹروں میں صرف دو مسلمان ہیں۔ منجملہ ایک سو چالیس مدرسین درجہ اعلیٰ کے سات مسلمان ہیں بقیہ ایک سو پچیس ہندو اور پندرہ عیسائی ہیں۔ مسلمانوں کا پرتہ صرف ۶ء۴ ہے مسلمان ڈپٹی انسپکٹروں اور سب ڈپٹی انسپکٹروں کی تعداد دس اور سولہ فی صدی ہے اور صرف ایک مسلمان اسسٹنٹ انسپکٹر ہے۔ بنگال میں مجھے کوئی مسلمان ہیڈ ماسٹر نظر نہیں آتا ہے۔ جو اعداد میں بیان کرتا ہوں وہ فہرست افسران سررشتہ تعلیم ۱۹۰۹ء سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مسلمان مدرسوں کی تعداد بنگال میں پانچ فی صدی کسی قدر زائد ہے لیکن سررشتہ معائنہ میں بیس (۲۰) فی صدی تک پہونچ گئی ہے۔

حضرات! جو اثر معلموں کا مدارس کی عام حیثیت پر پڑتا ہے اس کے بیان میں مبالغہ مشکل ہے اور یہ اعداد سرکاری مدارس مسلمان طلبہ کی کمی کا سبب نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور ترغیب کا عمدہ ذریعہ ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان مدرسین اور انسپکٹروں کی تعداد بڑھائی جائے۔ گزشتہ زمانہ میں کیوں اس قدر کم مسلمان اس سررشتہ میں لئے گئے۔ اس کا سبب بتانا مشکل ہے لیکن اس پالیسی سے مسلمانوں کو جو مضرت پہونچی اس میں کوئی شک نہیں ہے آپ کا فرض ہے کہ آپ اس معاملہ کو گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کریں اور انگریزی داں مسلمانوں کو ترغیب

دیں کہ وہ قومی فائدہ کی غرض سے سررشتۂ تعلیم کی ملازمت کی طرف متوجہ ہوں۔ اگر بہار میں مسلمانوں کے تقرر کی کامیابی ہوئی ہے تو دوسرے مقامات پر جہاں اسلامی آبادی زیادہ ہے۔ اس طرزِ عمل کو وسعت دی جائے تو یقیناً نہایت مفید ثابت ہوگا۔ سکنڈری تعلیم کے ضمن میں مسلمانوں کے واسطے ایک امر نہایت قابلِ لحاظ ہے۔ جو طلبہ بغیر کسی دیسی زبان کے حاصل کئے تحصیلِ انگریزی میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ وہ مدارس کی تعلیم کو بخوبی اپنا خیر و معلومات نہیں بنا سکتے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر انگریزی داں لوگوں پر ناقص الاستعداد ہونے کا الزام عاید کیا جاتا ہے یہ نہایت ضروری امر ہے کہ وہ کسی مشرقی زبان میں خوب پختگی حاصل کرلیں۔ میرا یہ منشا نہیں ہے کہ آپ قدیم طریقہ کی مذہبی تعلیم میں ان کا وقت ضائع کرائیں یا ان کو علم ادب کا ماہر بنائیں۔ لیکن جو مادہ قومی زندگی سے اجنبیت کا ان میں پیدا ہوجاتا ہے اور جن کا ذکر میں آئندہ کروں گا اس کا سبب یہی قومی لٹریچر کا جہل ہے۔ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم ناممکن ہے۔ اگرچہ گورنمنٹ اخلاقی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کررہی ہے۔ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو قبل اس کے کہ وہ مدرسے جانے کے لائق ہوں۔ مذہب کے ابتدائی اصول مادری زبان میں گھر پر تعلیم کئے جائیں یہ ظاہر ہے کہ سرکاری مدارس میں آپ ایسی تعلیم حاصل کرنے کی توقع نہیں کرسکتے جو آپ کی خاص ضرورت کے مناسب ہو اور بہتر سے بہتر حالت میں وہ صرف کسی خاص حد تک آپ کی ضرورت پوری کرسکتی [ہے]

حضرات! اعلیٰ تعلیم کی بحث میں مسلمانوں میں تعلیم کی کمی بیّن طور پر محسوس ہوتی ہے۔ آپ اس کا اندازہ اس امر سے فرما سکتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۸ء میں تمام ملک کے کالجوں کی طلباء کی مجموعی تعداد میں صرف ۸٫۱ فی صدی مسلمان تھے اگر مسلمان اپنی آبادی کے اعتبار سے کالجوں میں تعلیم پاتے تو ان کی تعداد ۲۲٫۶ فی صد ہوتی۔ آپ کے صوبہ میں صرف ۸ مسلمان کالجوں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہایت خوبی سے یوں بیان کی گئی ہے۔ اوّل کسبِ معاش کی غرض سے زیادہ علم حاصل کرنا۔ دوم سیاست مدن تاریخ اور ان واقعات سے بہتر آگاہی حاصل کرنی جو موجودہ امورِ سیاسی اور زندگانی سے متعلق ہیں۔ سوئم نیز تنویرِ خیال و تفریحِ تحصیلِ علم کا خواہاں ہونا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ہم انگریزی تعلیم کی قدر محض دنیوی فوائد اور منافع کے اعتبار سے کرتے آئے ہیں۔ لبرل تعلیم کا مرتبہ اس تعلیم سے بہت افضل ہے جس کا مدعا محض کسبِ معیشت ہے اور جو تربیت دماغی میں اعلیٰ تعلیم کی قائم مقامی نہیں کرسکتی چونکہ انگریزی تعلیم سرکاری ملازمت کے لئے لازمی قرار دے دی گئی ہے، اس کی ضرورت اس مقصد کے حصول کے واسطے سمجھی گئی ہے۔ نہ تربیت دماغ کی غرض سے یونیورسٹی کی ڈگری سرکاری ملازمت یا کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کا پروانہ سمجھی جاتی ہے۔ خاص کر قانون کی طرف ہمارے نوجوان حد سے زیادہ میلان رکھتے ہیں۔ گزشتہ پچیس [۲۵] سال کے عرصہ میں میرے صوبہ میں بیرسٹروں اور وکیلوں کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ موجودہ طرزِ تعلیم پر باوجود اس کے نقائص کے ان نتائج کے پیدا کرنے کا

الزام واجبی طور پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ امر قابل افسوس ہے کہ بجائے سائنس یا طب کے قانون کی طرف اس قدر زیادہ توجہ کی جاتی ہے، جو لوگ تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں اُن کی کثیر تعداد گورنمنٹ کا دست نگر بنانے سے آپ اپنی قوم کی مالی فلاح اور آزادی رائے کا خون کرتے ہیں۔ مسلمان طلبہ کو ایسے پیشے اختیار کرنے چاہئیں جو باعتبار تقسیم محنت اور نیز بلحاظ مناسبت طبع اُن کے لئے موزوں ہوں۔ بیرسٹری کے لئے مسلمانوں کو انگلستان بھیجنا جمیع امور کے لحاظ سے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ جو والدین اپنے لڑکوں کو انگلستان بھیجنے کے خواہشمند ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے انتخاب میں احتیاط کریں۔ میری رائے میں صرف وہی ہونہار طلبہ جو اپنے شوق و محنت کا ثبوت دے چکے ہوں اور جو سائنس اور صنعت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے موزوں ہوں وہاں جانے کے لئے قابل تصور کئے جائیں۔ لیکن والدین کی ذمہ داری اس مقام پر ختم نہیں ہوتی۔ مغربی دنیا کی اُن مکروہ ترغیبات کے علاوہ جن میں ہندوستانی طلبہ کے مبتلا ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ حکومت انگریزی کے خلاف مفسدانہ اور باغیانہ خیالات کے پھیلانے والوں کا اثر انگلستان میں بھی قایم ہو گیا ہے۔ صاحب وزیر ہند نے اس بارہ میں جو تدابیر بغرض حفاظت طلبائے ہند اختیار فرمائی ہیں یہاں کے باشندوں کو شکریہ کے ساتھ اُن کی قدر کرنی چاہیئے۔ لیکن باوصف قیام انجمن شورہ اس امر کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی کہ والدین براہ راست انگلستان میں اپنے لڑکوں کی نگرانی اور تنبیہ کے وسائل اختیار کریں۔ مجھ کو امید ہے کہ مسلمان اس بارہ میں کوشش کریں گے۔

اب میں پھر اس بحث کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جہاں سے میں نے اعلیٰ تعلیم کا ذکر شروع کیا تھا، میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانوں کے طبائع میں اعلیٰ تعلیم کا وجدان صحیح نہیں ہے اور نہ یہ امر ذہن نشیں ہوا ہے کہ ہمارے ملک میں انگریزی داں اشخاص محض ظاہری معنی کے اعتبار سے تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں۔ زندگی کی مادی اور رکیک ضروریات قوم کے بہتر سے بہتر دماغوں کو مستغرق کر لیتی ہیں اور ایسے چند لوگ بھی نظر نہیں آتے جن کو یہ توفیق ہو کہ تحصیل علوم کا مقصود علم سمجھ کر یا روشنی دماغ اور انبساط زندگی کا ذریعہ جان کر اُس کو حاصل کریں۔

حضرات! ہم کو اپنی قوم میں اعلیٰ تعلیم کے لئے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا شوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ وہ ذرایع مہیا کرنا ہیں جو اس کے حاصل کرنے میں معین ہوں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہماری صدا کون سنتا ہے جہاں کہیں مسلمان سینٹ یا سنڈیکیٹ میں ممبر ہیں بھی تو ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ کلکتہ اور مدراس یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ میں کوئی مسلمان ممبر نہیں ہے۔ جب ہم کو امپیریل لیجسلیٹو کونسلوں میں حقوق نیابت مردم شماری کی نسبت سے زائد عطا ہوئے ہیں تو اس نظیر کی بنا پر یونیورسٹیوں میں بھی مسلمان ممبروں کی معقول تعداد ہونی چاہیئے۔ یہ دلیل الہ آباد یونیورسٹی کے بارہ میں تو ہرگز ضعیف نہیں کہی جا سکتی۔ کیوں کہ اس یونیورسٹی سے ہمارے قومی کالج کا الحاق ہے اور

اس کے حقوق کی حفاظت کے واسطے لازم ہے کہ یونیورسٹی الہ آباد کے سنڈیکیٹ میں مسلمان ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے، ایک طرف تو گورنمنٹ کی موجودہ پالیسی نے اعلیٰ تعلیم کے وقتوں کو بڑھا دیا ہے۔ دوسری طرف حال کے انتظامی اصلاحات نے ہماری ذمہ داریوں میں بہت کچھ اضافہ کردیا ہے۔ ہم کو آئندہ ایسے قابل لوگوں کی ضرورت ہوگی جوان ذمہ داریوں کو پورا کرسکیں اور دنیا کو دکھادیں کہ ہم دوسری قوموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اس مشکل کا حل کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ تدبیر آپ لوگوں کو متشتر بتائی جاچکی ہے۔ آپ کو صرف اس پر عمل کرنے کے واسطے مستعد ہوتا ہے۔ آپ حضرات سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس امر کی طرف ہے۔ وہی علی گڑھ کالج کو محمڈن یونیورسٹی کی حد تک پہونچانا ہے۔ اس مسئلہ پر ہر سال کانفرنس کے اجلاس میں بحث ہوئی ہے۔ اخباروں میں اس کے متعلق مضامین شائع ہوئے ہیں اور رسالے لکھے گئے ہیں لیکن اس وقت تک وہ محض ایک منصوبہ ہے یہ نہیں کہ اس تجویز سے کسی کو اختلاف ہو۔ بلکہ بعض اطراف کے مسلمانوں میں اس بارہ میں جوش ہے۔ البتہ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اگر دو یا تین اسلامی کالج علی گڑھ کالج کے نمونہ کے ملک کے مختلف حصوں میں قایم کردیئے جائیں تو شاید یونیورسٹی کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مگر حضرات دوسرا علی گڑھ کالج بنالینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ روپئے کا مل جانا تو ممکن ہے مگر دوسرا سرسید آپ کہاں سے لائیں گے۔ اگر آپ نے ادنیٰ حیثیت کے کالج قایم کرلئے تو والدین اپنے لڑکوں کو اُسی کالج میں بھیجنا پسند کریں گے جو سب سے بہتر ہوگا اور اس طور پر نئے کالج شہرت نہ حاصل کرسکیں گے کیوں کہ شاید وہ سرکاری کالجوں سے بہتر نہ ہوں۔ بلکہ شاید ان سے مقابلہ کرنے میں ان نئے کالجوں کو دشواری ہو۔ مسلمانوں کی علمی ترقی کالجوں کی تعداد پر منحصر نہیں ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم کے رواج پانے پر اور اعلیٰ تعلیم کی اشاعت یونیورسٹی ہی کا منصب ہے۔ اس اعتراض کا جواب کہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے متعدد کالجوں کی ضرورت ہے۔ سابق میں نہایت خوبی سے لیکچر دیا جاچکا ہے۔ محمڈن یونیورسٹی کے فوائد اور اغراض پر سابق میں بعض ممتاز صدر نشینوں نے نہایت فصاحت سے تقریریں کی ہیں ۱۹۰۲ء کے اجلاس میں ہز ہائنس سر آغا خاں نے فرمایا تھا۔

ہم کو ایک کروڑ روپیہ کے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم کو ایک ایسا دارالعلوم قایم کرنا مقصود ہے جو ہماری بے شمار ضرورتوں پر حاوی ہو۔ ہمارا یہ منشاء نہیں ہے کہ ہمارے بچے بہترین تعلیم جو ہندوستان میں میسر ہوسکتی ہے حاصل کریں۔ بلکہ ہم کو ایسی تعلیم دینا منظور ہے جس سے بہتر دنیا کے کسی حصہ میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آئندہ ہماری قوم کے طلباء کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے یا صنعت وحرفت کی اونچی شاخوں میں جانے کے واسطے انگلستان۔ یا جرمن جانا پڑے۔ بلکہ ہم علی گڑھ کو ایسی درس گاہ بنانا چاہتے ہیں جو برلن یا اکسفرڈ لیپ زک یا پیرس کے ہم مرتبہ ہو اور جس کو علم کے طالب وقعت کی نظر سے دیکھیں۔ ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ وہ اسلامی علوم جو عنقریب معدوم ہوجانیوالے ہیں مسلمان طالب علموں کی بدولت دنیا کے ذخیرۂ معلومات میں شامل ہوسکیں اور سب سے بڑھ کر ہماری

خواہش یہ ہے کہ وہ ایک ایسا علمی اور اخلاقی مرکز جہاں بلند اور پاکیزہ خیالات کا مجمع ہو، جہاں سے روشنی اور تہذیب کی شعاعیں تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر پڑیں اور جو تمام عالم کے واسطے ہمارے دین کی سچائی اور پاکیزگی کا ایک عمدہ معیار ہو۔ حضرات! کیا آپ کے نزدیک اسلام کی شان و شوکت کو تازہ کرنے کے مقابلہ میں ایک کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔ اگر آپ سچے دل سے اس مذہب کی قدر کرتے ہیں جس کے آپ معتقد باللسان ہیں تو بے شک یہ قیمت آپ دے سکتے ہیں۔ اگر آج کل کے مسلمانوں کو پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں کی طرح اپنے فرض کا خیال ہوتا تو یہ رقم تین مہینہ میں وہ جمع کر لیتے۔ ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان ہیں اُن میں سے کم سے کم ایک کروڑ ایک روپیہ فی کس دے سکتے ہیں۔ ہم ہر افسر خاندان سے صرف ایک روپیہ مانگتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو بخوبی معلوم ہے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک ہزار یا دس ہزار بآسانی دے سکتے ہیں۔

یہ بات خیال میں نہیں آتی کہ یہ الفاظ بالکل رائیگاں گئے ہوں۔ لیکن اس کے بعد واقعی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ سال گزشتہ کی رپورٹ کانفرنس میں آپ کے آنریبل جوائنٹ سکرٹری کی تجویز پڑھ کر کہ آئندہ بارہ سال میں ہم کو ۲۴ لاکھ روپیہ یونیورسٹی کے لئے جمع کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ مجھے سخت رنج ہوا کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں میں اتنی بھی حمیت باقی نہیں ہے کہ ایک اہم کام کے لئے متفق ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ موجودہ پستی کی حالت سے ترقی کرنے کی خواہش اس قدر قوی نہیں ہے کہ اُن میں حس پیدا کر دے۔ آپ کو جس قدر قوی احساس اس جہالت کا ہوگا جس میں آپ کی قوم مبتلا ہے۔ اُتنا ہی اضطراب اور فکر آپ کو اُس کی تبدیلی حالت کا ہوگا۔ ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ دوسری قومیں کیا کر رہی ہیں، میں نے چند روز ہوئے ایک اخبار میں دیکھا تھا کہ ہندو سنٹرل کالج کو جو کل قائم ہوا ہے یونیورسٹی بنانے کی تجویز ہے۔ محمدن یونیورسٹی کی تجویز سالہا سال سے درپیش ہے۔ مگر اس وقت تک اس نے عملی صورت اختیار نہیں کی۔ میں اپیل کرتا ہوں ان حقوق قومی سے جو آپ پر فرض ہیں۔ میں اپیل کرتا ہوں آپ کی فیاضی اور قومی خودداری سے۔ میں اپیل کرتا ہوں آپ کی موروثی محبت علمی سے۔ میں اپیل کرتا ہوں اُن بہترین اخلاقی خوبیوں سے جو آپ کو خدا نے عطا کی ہیں۔ میں اپیل کرتا ہوں آپ کی قومی ترقی اور شوکت کے اعلیٰ منصوبوں سے۔ اور اخیر میں اپیل کرتا ہوں اُس مذہب سے جس کو ہم سب مانتے ہیں۔ اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ لوگ کمر ہمت باندھیں اور محمدن یونیورسٹی کے واسطے روپیہ فراہم کرنا شروع کر دیں۔ میں آپ لوگوں میں عارضی جوش پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ میری آرزو ہے کہ آپ لوگوں میں ایسی سرگرمی اور مستعدی پیدا ہو جائے جو عملی قوت کی محرک ہو۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ قاہرہ کے مشہور دار العلوم الازہر کو جدید طرز کی یونیورسٹی بنانے کا خیال ہے۔ چند سال ہوئے کہ اس درس گاہ کو دنیا کا دار العلوم بنانے کی تجویز کی گئی تھی جس سے مہذب اصحاب مصر نے سخت اختلاف کیا تھا۔ کاش آپ مصر کے

روشن خیال علماء کی تقلید فرمائیں اور علی گڑھ کالج کو ایک ایسی یونیورسٹی بنا دیں جو مسلمانوں کے لئے علم کا سرچشمہ اور قومی زندگی اور اعلیٰ خیالات کا مرکز ہو۔ حضرات اگر آپ نے اس کام کو متفقہ کوشش اور ثبات عزم سے پورا کر لیا اور علی گڑھ میں آپ نے وہ دل فریبی پیدا کر دی جو اکسفرڈ اور کیمبرج کے کہنہ اور مقدس در و دیوار سے نمایاں ہے تو یقین مانئے کہ اسلام کے کارناموں میں اس ملک میں یہ واقعہ سب سے زیادہ مہتم بالشان ہوگا۔

اب میں اس بے التفاتی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو تعلیم صنعت و حرفت کے ساتھ مسلمانوں کو ہے۔ ان فنون کی جانب سے اُن کی بے پروائی کا یہ کافی ثبوت ہے کہ منجملہ پندرہ وظائف سرکاری کے جو پنج سالہ مختتمہ ۱۹۰۸ء میں صنعتی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے طلبہ کو ہندوستان سے باہر جانے کے لئے عطا کئے گئے ہیں صرف ایک وظیفہ ایک مسلمان کو ملا۔ اصل یہ ہے اُن کو محرری کی محنت گوارا ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ کارخانوں میں اپنے ہاتھ سے کام کریں مسلمانوں نے تجارتی اور کاروباری دنیا میں ابھی وہ مرتبہ حاصل نہیں کیا جو اُن کے شایاں ہے۔ موجودہ افلاس قومی کا یہی بڑا سبب ہے۔ مگر اب جو مواقع ترقی کے موجود ہیں اور جن سے دوسری قومیں مستفید ہو رہی ہیں۔ ان کو چھوڑنا نہ چاہئے۔ اس وقت صنعتی تعلیم کے لحاظ سے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ اور بربہا سب سے پیچھے ہیں۔ یہاں سرکار کو عطائے وظائف کے لئے طالب علم نہیں ملتے۔ نہ ان کے لئے ذریعہ معاش ہے۔ باوصف اس کے کہ سر جان ہیوٹ صاحب نے ہمارے صوبہ میں صنعتی تعلیم کو ترقی دینے کی بے حد کوشش فرمائی ہے۔ اس موقع پر بہت افسوس کے ساتھ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ صاحب وزیر ہند نے سر جان ہیوٹ کی اس تجویز کو جو کانفرنس صنعت و حرفت منعقدہ ۱۹۰۷ء بمقام نینی تال طے پائی تھی کلیتاً منظور نہیں کیا۔ حالانکہ گورنمنٹ ہندوستانی اور یورپین تجار اور بہت سے شائستہ لوگوں نے اس کی تائید کی تھی۔

میں ہر مسلمان سے یہ خواہش کروں گا کہ وہ اپنے گھر میں کم سے کم ایک لڑکے کو صنعتی تعلیم دلائے۔ اس تعلیم سے مناسبت پیدا ہو جائے گی تو آئندہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ سرکاری وظائف کی معقول تعداد مسلمانوں کو ملنے لگے گی۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر مسلمان سب دوکاندار ہو جائیں۔ بشرطیکہ وہ اور علوم و فنون میں بھی ویسی ہی ترقی کریں جیسی اُس قوم نے کی ہے جو ایک وقت میں دوکانداروں کی قوم کہی جاتی تھی اور اب وہ دنیا کی تمام قوموں میں سربرآوردہ ہے۔

اب میں چند الفاظ تعلیم نسواں کی نسبت کہنا چاہتا ہوں۔ خوش قسمتی سے ملک اور قوم کے خیالات کچھ عرصہ سے اس جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ قاعدہ کی رو سے عورتوں کی تعلیم مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ

ہونی چاہیئے۔ مگر ہمارے ہاں جب لڑکوں ہی کی تعلیم ایسی ناقص حالت میں ہے تو عورتوں کی تعلیم خواہ مخواہ قابل تاسف حالت میں ہونی چاہیئے۔ ۱۹۰۱ء میں صرف ایک مسلمان لڑکی بمقابلہ ۳۱ ہندو اور ۲۳ پارسی لڑکیوں کے کالج کی تعلیم پانے والیوں میں تھی۔ سکنڈری مدارس میں صرف ایک سو چالیس مسلمان لڑکیاں بمقابلہ چودہ سو۔ دو پارسی ۳۱۶ ہندو لڑکیوں کے ہندوستان میں ہیں۔ صوبہ برہما میں ۳۵ لڑکیاں انگریزی کی تعلیم پا رہی ہیں۔ ابتدائی مدارس میں البتہ لڑکیوں کی تعداد اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ خاص کر بنگال اور مشرقی بنگال میں۔ میرے نزدیک اب لوگوں کو اس مسئلہ میں کوئی تعصب نہیں ہے۔ مگر پھر بھی بہت سی مشکلیں ہیں خصوصاً متوسط الحال شرفا اپنی لڑکیوں کو پردہ شکنی کے خوف کی وجہ سے سرکاری مدارس میں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہم خود اپنے یہاں زنانہ مدارس قائم کریں اور پرانی رسوم و عادات پر اپنی آئندہ اخلاقی اور تمدنی ترقی کو قربان نہ کریں، یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ عورتوں کی تعلیم دینے سے جو امور قومی ترقی کے سدراہ ہیں ان میں سے ایک عظیم سبب رفع ہو جائے گا۔ ہم نے گزشتہ زمانہ میں عورتوں کی طرف سے بہت لاپروائی کی اور ان کو اس منصب سے جو فطرتی طور پر اُن کو سوسائٹی میں حاصل ہوا ہے محروم رکھا۔ اب وہ گویا اس کا عوض لے رہی ہیں اور ہماری ترقی کی سدراہ رہیں گی۔ جب تک ہم اس بدسلوکی کی تلافی نہ کریں جو سابق میں ان کے ساتھ کی گئی ہے۔ میرے خیال میں ہم کو اُس روشن خیال فرمانروا یعنی بیگم صاحبہ بھوپال سے اس معاملہ میں سبق حاصل کرنا چاہیئے تاکہ مسلمان عورتوں کی آئندہ نسلیں جہالت سے محفوظ رہیں۔

حضرات! جدید تعلیم اور تہذیب کی بدولت مسلمانوں کو جو علمی ترقیاں نصیب ہونے والی ہیں اُس کے ساتھ اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ مغربی خیالات کا اثر ہماری موجودہ معاشرت کو درہم برہم کر دینے والا ہے اور نئی چیزوں کو اپنے مناسب حال بنا لینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لئے قومی اخلاق کا یکساں بنا لینا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ قوم کی قسمت کا فیصلہ آئندہ نسلوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن موجودہ اخلاقی اور تمدنی حالت نہایت وحشت انگیز ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس ملک میں دوسری ترقی یافتہ قومیں انگریزی تعلیم کے اثر سے اپنے یہاں کے پرانے اصولوں کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان قدیم اور جدید طرز میں کوئی شکل مصالحت کی بھی اختیار نہیں کرتے اور نہ اعتدال قائم رکھ سکتے ہیں۔ بلکہ ان کو یہ سہل معلوم ہوتا ہے کہ اپنے یہاں کے اصول اخلاق کے مجموعے کو کلیتاً منسوخ کر دیں۔ اگر ان نوجوانوں نے زمانہ حال اور ماضی میں افتراق کلی پیدا کر دیا اور مادیات کی ظاہری دلفریبی نے ان کو ان روحانی خوبیوں کی جو اسلام کی جان ہیں بے قدری پر آمادہ کیا۔ تو یقیناً اسلامی اخوت اور قومی اتفاق کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ اگر ہم بحیثیت قوم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان چیزوں سے علٰحدگی محال ہے جو قوم کو زمانہ ماضی کی طرف کھینچتی ہیں۔ اگر بلحاظ یک رنگی تہذیب

و تعلیم مسلمان کوئی نئی حیثیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بحیثیت قوم اُن کا ترقی کرنا محال ہے۔ وجود قومی تین چیزوں پر منحصر ہے توحدِ قوم۔ توحدِ مذہب۔ توحدِ اغراض۔ اسلام نے جس ذریعہ سے مختلف اقوام کو فتح کرنے کے بعد اُن کے قومی اختلاف کو مٹا دیا وہ اتحاد مذہب کا ذریعہ تھا۔ اگر مذہب کا شیرازہ توڑ دیا جائے تو جو لگاؤ اخلاقی حیثیت سے آپ کو اپنی قوم کے ساتھ ہے اُسی وقت جاتا رہیگا۔ باعتبار معاشرت کم تر چیزوں میں اشتراک باقی رہیگا کیونکہ خیالات اور عادات میں تو بیشتر ہی علحدگی ہو چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اغراض میں بھی اتحاد اور حقوق کی مجموعی حفاظت کا خیال باقی نہ رہے گا۔ چونکہ اسلام مختلف اقوام کا مجموعہ ہے۔ لہذا ان اختلافات کے بعد جدا جدا فرقے قائم ہو جائیں گے جن کو مذہب اور قوم سے کوئی علاقہ نہ ہوگا۔ یہ گروہ کس نام سے پکارا جائیگا اس کو زمانہ آئندہ کے مورخ پر چھوڑ دیا ہے۔ خدا نہ کرے اس کی نوبت آئے۔

لیکن میں یہ خطرہ اس لئے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ یہ امر مسلمانوں کے دل نشین ہو جائے کہ اُن کی ترقی مسئلہ ارتقاء کے بموجب مشرقی ہی انداز پر ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نے بہترین علوم و فنون جو آپ کو یورپ سے مل سکتے ہیں حاصل کر لئے اور ساتھ ہی اس کے اس باعظمت ترکہ کو جو تیرہ سو برس سے زائد ہوئے آپ کو ملا تھا اسی حیثیت سے قائم رکھا تب آپ ترقی کی اُس حد تک پہنچ سکیں گے جو انسانی خوبیوں کی انتہائی تکمیل تصور کی جا سکتی ہے۔

میں نے عمداً اُن امور کا ذکر نہیں کیا جن کا آج کل چرچا ہے۔ کیونکہ پولٹیکل معاملات سے اس کانفرنس کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہاں اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زمانہ آئندہ مسلمانوں کے واسطے فکر و تردد سے خالی نہیں ہے۔ دنیا میں ہر طرف عظیم تغیرات ہو رہے ہیں اور مسلمان اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ سب سے عمدہ اصول جو مدِ نظر رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ ہم کو ان باتوں کا حوصلہ کرنا چاہیئے جن کا پورا ہونا جائز طور پر ممکن ہو۔ مگر اُن کے جزئی حصول پر کبھی قناعت نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ نیک نیتی سے معقول اعتراض یا نکتہ چینی کرنا ملکی انتظام کے لئے مفید اور معاون ہے۔

میں نے آپ لوگوں کی بہت سمع خراشی کی۔ میں نہایت مشکور ہوں کہ آپ نے مہربانی کر کے میری گزارش کو سُنا۔ میں اس امید کی تو جسارت کر نہیں سکتا کہ میں نے کوئی ایسی بات کہی ہو جس سے عملی طور پر ہماری مشکلات کے رفع کرنے میں مدد مل سکے۔ لیکن اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ ہر لفظ جو میری زبان سے نکلا ہے وہ قوم کی سچی محبت اور ہمدردی پر مبنی ہے۔



عبداللہ ابن یوسف علی اسکوائر
صدر اجلاس بست و چہارم (ناگپور سنہ ۱۹۱۰ ع)

اجلاس بست وچہارم

منعقدہ ناگپور سی پی ۱۹۱۰ء

صدر عبداللہ ابن یوسف علی ایم اے خان بہادر ایل ایل ایم آئی سی ایس پنشنر ڈپٹی کمشنر

حالات صدر

خان بہادر موصوف عربی النسل ہیں۔ قدیم وطن یمن تھا۔ اس کے بعد مسقط ہوا۔ بعد ازاں ہندوستان۔ آپ کے والد سورت میونسپلٹی کے چیرمین تھے۔ تعلیم بمبئی میں ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں بمبئی یونیورسٹی سے آپ نے بی اے کی ڈگری لی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سے وظیفہ قابلیت لے کر انگلستان گئے وہاں جاکر کیمبرج یونیورسٹی میں ایم اے۔ اور ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے۔ سول سروس میں آپ اول درجہ میں پاس ہوئے تھے۔ غرض انگلستان میں آپ کا تمام زمانہ طالب علمی شاندار کامیابیوں کے لحاظ سے ختم ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں واپس ہندوستان ہوئے اور بعہدۂ اسسٹنٹ کلکٹر و مجسٹریٹ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے ضلع سہارن پور میں تعینات ہوئے جس کے بعد مختلف اضلاع شاہ جہاں پور، بریلی، ہمیر پور وغیرہ میں جنٹ مجسٹریٹ کی خدمات شائستہ انجام دے کر مستقل طور سے کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع کے عہدے پر ترقی پائی۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں انڈر سکریٹری اور ڈپٹی سکریٹری رہے اور آپ پہلے ہندوستانی تھے جن کو گورنمنٹ آف انڈیا کی سیکریٹریٹ میں عہدہ دیا گیا۔ اور آخر میں ضلع فتح پور سے نیک نامی کے ساتھ خدمت سرکاری سے سبکدوشی اختیار کر کے پنشن لے لی۔

آپ عربی، فارسی، اردو زبان دانی کے علاوہ انگریزی لٹریچر اور ادب میں خصوصیت کے ساتھ

ذوق اور تبحر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہندی، گجراتی، مرہٹی زبانوں پر بھی علمی حیثیت سے آپ کو عبور حاصل ہے۔ فرانسیسی اور لاطینی زبانوں سے بھی آپ کافی طور سے آشنا ہیں۔ اور اس لحاظ سے علامہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی لسانہ مغربیہ اور مشرقیہ کا لذت شناس مثل آپ کے اب مسلمانوں میں دوسرا نہیں ہے علمی ذوق اور معلومات علمی کی چسک کے لحاظ سے یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ آپ کا دورِ زندگی اس وقت تک طلب علم سے فارغ اور آپ کے کام و دہن تشنگی علم سے سیراب نہیں ہوئے۔ گورنمنٹ سروس سے علیحدہ ہو کر آپ نے کئی مرتبہ یورپ کی سیاحت کی اور کچھ زمانہ کے لئے لندن یونیورسٹی میں اردو ہندی اور مذاہب و تمدن مشرقیہ کے لکچرار رہے۔ اور لندن کاؤنٹی کونسل کے معلمین کی جماعت کو بھی سلسلہ وار لکچر دیئے۔

یونیورسٹی مذکور کی پروفیسری ایسا بلند نشان عزت اور طغرائے امتیاز ہے جس کو شاذ و نادر ہندوستانی حاصل کر سکے ہیں۔

جب اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہ نے نظام سلطنت آصفیہ کی جدید تنظیم فرمائی اور نواب مؤید الملک سر علی امام کو باب حکومت کا صدر نشین قرار دیا تو صدر المہام مال گزاری کے رفیع درجے اور اہم منصب پر مسٹر عبداللہ ابن یوسف علی کو مامور فرمایا۔

آپ نے یورپ میں رہ کر یورپ کی علمی معاشرتی اور تمدنی ترقیوں کے اصول کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ تاوقتیکہ ہندوستانی طالب علم یورپ جا کر انگریزوں کے اصول حیات مثلاً ان کی ہمت، جرأت، آزادی، عصبیت قومی کا کافی طور سے مطالعہ نہ کریں گے اور وہ ان کی اس قومی سیرت کو جس کی قوت نے تمام عالم پر ان کی برتری اور فوقیت مسلم کر دی ہے۔ اس حقیقت پر عبور کرنا نہ سیکھیں گے۔ ان کا علم اور حافظہ اس مقصد سے محروم رہے گا جس کی تلاش و جستجو میں انھوں نے بحر و بر کو ناپنے اور اس سے پار ہونے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کی بہبودی اور ملکی فلاح کے متعلق ان کی یہ رائے بھی پُر معنی ہے کہ جب تک ملکی صنعت کو جہاں تک ممکن ہے ترقی نہ دی جاوے گی اور ملک اپنی ساختہ اشیا کی قدر دانی پر جب تک مائل نہ ہوگا۔ ملکی ترقی کا خیال خواب خیال ہے۔

آپ کو ادبی اور اخلاقی تعلیم سے خاص دلچسپی ہے۔ آپ اخلاقی تعلیم کی بین الاقوامی کانگریس کی انتظامیہ کمیٹی کے رکن ہیں جس کا صدر مقام لندن میں ہے۔ اس کانگریس کا اجلاس ۱۹۲۶ء میں بمقام روما منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں آپ نے ایک فاضلانہ اور عالمانہ مضمون پڑھا جس پر بحث ہوئی اور یہ مضمون کانگریس کی جانب سے انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں چھاپ کر تمام دنیا میں شائع کیا گیا۔

الغرض جب کبھی ان کو علمی انسٹی ٹیوشنوں میں موقع ملا ہی تو انھوں نے اپنی وسیع معلومات عمدہ خیالات اور پُرنتیجہ حالات سے طلبہ کی اکثر دعوت کی ہی۔ وہ چند محققانہ رسائل کے مؤلف اور مصنف بھی ہیں۔ ذوق کتب بینی نے ان کے پاس قیمتی ذخیرہ بصورت کتاب خانہ مہیا کردیا ہی۔

۱۹۱۰ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ناگپور کے آپ ہی صدر نشین تھے۔ اس مجلس میں جو خطبۂ صدارت آپ نے پڑھا تھا اس کے دیکھنے سے آپ کی اس جامعیت علمی اور فکر بلند کا پتہ ملتا ہے جس کا اشارہ اوپر ہوا ہے۔ آپ کے حالات میں سب سے زیادہ خوش خبری اور بشارت کا وہ اعلان تھا جو آپ کے عہدۂ پرنسپلی اسلامیہ کالج لاہور کے منظور کرنے کے متعلق دیا گیا تھا۔ آپ نے اسلامیہ کالج کے عہدۂ پرنسپلی کو قبول کر کے نہ صرف مسلمانان پنجاب کو بلکہ مسلمانان ہند کو ممنون کر کے خدمت علم کی تابناک مثال قائم کی ہی۔ کیا عجب آپ کے دور درس و تدریس میں کالج میں ایسے فاضل بھی پیدا ہوں جو مسند علم کے وارث اور صحیح جانشیں سمجھے جائیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خطبۂ صدارت

خواتین و حضرات! میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے عہدۂ صدارت کے لئے منتخب فرما کر مجھے اعلیٰ اعزاز بخشا ہی۔ جیسا کہ آپ حضرات واقف ہیں بہت سے ڈیلیگیٹ صاحبان طویل اور دور دراز مسافتیں طے کر کے یہاں ایسی حالت میں تشریف لائے ہیں جب کہ دیگر مقامات پر اس پُر تفریح ہفتہ کے اندر بہت سی دوسری کششیں موجود تھیں۔ مقامی استقبالی کمیٹی نے زیر صدارت جناب نواب سلام اللہ خاں صاحب بہادر رئیس دیول گھاٹ جو پُرتپاک و شاندار خیر مقدم ڈیلیگیٹوں کا کیا ہے وہ اس امر کی وافر شہادت ہی کہ ہم بار خاطر مہمان نہیں ہیں اور یہ کہ ہم مہمان و میزبان اس زندگی بخش اسپرٹ اور متحد کن مقصد سے یکساں متاثر ہیں یعنی ترقی تعلیم مسلمانان۔

ہم پر آنریبل مسٹر کریڈک بہادر چیف کمشنر ممالک متوسط کا بھی دلی شکریہ واجب ہی جنھوں نے ہماری تحریک سے پوری ہمدردی کا اظہار فرمایا ہے۔ نیز ان خواتین و حضرات کا جنھوں نے ایسی فیاضی کے ساتھ ہماری امداد کی ہے اور دوران سال میں ہمارے فنڈز کو جو گراں قدر عطیات حاصل ہوئے ہیں اس کے متعلق اسی کانفرنس میں خاص رزولیوشنوں کے ذریعہ سے معطی صاحبان کے عطیات پر اظہار امتنان

کیا جائے گا۔

ہم سب کو قلق اور افسوس ہے کہ علالت طبع کی وجہ سے نواب وقار الملک بہادر آج یہاں تشریف فرما نہیں ہیں۔ اور ہم سب اپنے مستعد اور ان تھک جوائنٹ سکرٹری آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد صاحب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

انتقال شہنشاہ معظم ایڈورڈ ہفتم آں جہانی

اس سال ہم ایک بڑے عالمگیر ماتم کی تاریکی میں جمع ہوئے ہیں اور امسال کل سلطنت ہزلیٹ گریسش مجسٹی شاہ ایڈورڈ ہفتم قیصر ہند کی وفات کی وجہ سے غرق ماتم تھی۔ رنج ہی کے مواقع پر کسی رعایا کے دل کا امتحان ہوتا ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا دل کامل العیار ہے۔ کیوں کہ اس حادثہ پر اس نے مناسب موقع مخلصانہ رنج کا اظہار کیا ہے۔ یہ "صلح کن" (جن کی زندگی اعلیٰ تدبر، شاہی وقار، اور مستحکم فرض شناسی کی ایک مثال تھی) اس کی جدائی نہ صرف اس سلطنت میں محسوس ہوئی ہے جس پر وہ حکمراں تھے بلکہ کل دنیا مبتلائے الم ہے۔ اُن کی ذات سے ایسے متوقع فوائد حاصل ہوئے تھے جو عام انسانوں کی سمجھ میں مشکل آسکتے ہیں مصیبت زدگان و بلا رسیدگان سے جو انھیں گہری ہمدردی تھی اُس کے اقتضا سے اُن کی یادگار بہت سے رفاہ عام یادگاروں کی صورت میں قائم کی جا رہی ہے تاکہ امراض رفع ہوں اور علوم کے ذرائع انسانی مصیبت مایوسی کی ظلمت کے بجائے نور پھیلانے کے کام میں لائے جا سکیں۔

اعلیٰ حضرۃ ملک معظم جارج پنجم۔

یہ ہمدردی ان کے وارث، ہمارے موجودہ ملک معظم نے پورے طور پر میراث میں پائی ہے بحیثیت ولی عہد اس ملک کی سیاحت سے واپس ہو کر انھوں نے سلطنت کو باہمی ہمدردی کی نصیحت کی تھی اور اب اُنھوں نے خود اپنی مثال سے اس سبق کو اثر پذیر کرانے کی نسبت اپنے شاہانہ ارادہ کا اظہار فرمایا ہے۔ دو سال کے بعد یہ پہلا موقع ہوگا کہ دہلی کو اس کل بر اعظم کے شہنشاہ کی تاج پوشی کے دیکھنے کا فخر حاصل ہوگا۔ ہمارے ملک معظم جارج پنجم موجودہ ہندوستان کے پہلے شہنشاہ ہوں گے جن کی سر زمین ہند ہی پر تاجپوشی ہوگی۔ انھوں نے بھی خواہی و ہمدردی کا شاہی پیغام پیشتر ہی سے بھیج دیا ہے۔ اور ہمارے دل فرط وفاداری سے ان کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ یہ واقعہ کہ ملکہ قیصرہ بھی ان کی معیت میں ہوں گی ہماری مسرت کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اور ہمارے نازک ترین محسوسات کو متاثر کرتا ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم، اور حالت امید و بیم

اپنی جماعت کے معاملات پر بحث کرتے ہوئے ہم مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ترقی کی دل فریب تصویروں کا تصور کرتے ہیں۔ اکثر ہم وہ مایوس کن

رائیں بھی سنتے ہیں جو بے صبر واہمہ پرست لوگ مسلمانوں کی تعلیم کے مستقبل کی نسبت پیش کرتے ہیں۔ اور دونوں رایوں کی تائید میں اعداد پیش کر سکنا ممکن ہے۔ کیوں کہ دونوں کے اندر صداقت کا عنصر شامل ہے۔ ہمارے محبوب سید احمد کے کام کی غیر فانی یادگار، جس کی تائید محسن الملک مرحوم سے اپنی قابلیت کے ساتھ عمل میں آئی۔ ہمارے اندر ہمیشہ امید کے جذبات پیدا کرے گی اسی کے مقابلہ میں مولانا حالی جیسے شعرا، خواجہ غلام الثقلین جیسے سوشل ریفارمر اور سید اکبر حسین صاحب جیسے شوخ و ظریف ناظم کی نوحہ خوانیاں ہیں یہ فراموش نہ کرنے دیں گی کہ ہمیں من حیث القوم ہنوز بہت کچھ تلافی کرنی ہے۔

فرض عملی کارروائی کا ہے نہ کہ گفتگو کا!

لیکن خواہ ہم امید و افتخار کی طرف رجوع ہوں یا بیم و یاس کی طرف مائل ہوں۔ بہر حال یہ بات بلا شک و شبہ مسلمہ ہے کہ ہمارا فرض منصبی ہے کہ ہم عملی طور پر کارروائی کریں اور یہ کارروائی فرداً فرداً بھی ہونی چاہیئے اور اجتماعی طور پر بھی۔ مگر دانشمندانہ تدابیر کے ساتھ۔

حضرات! جنگ کی مثال نے کر غور کیجیئے کہ آپ کے خیالات اس فوج کے متعلق کیا ہوں گے جس نے مشکل کے وقت چستی اور آمادگی نہیں دکھلائی اگر اُس کے سرداروں نے خود اپنے کمانڈروں کی غلطیاں دکھلائیں۔ یا اُن قباحتوں کی جس میں وہ مبتلا ہوئے شکایت کی۔ یا اپنے غنیم کی بے انضافانہ ترکیبوں کی نکتہ چینی کی تو گویا اُنھوں نے خود اپنے ہی منصوبوں کی ترقی کو روک دیا اور سخت ہزیمت پہونچ جانے کا موقع دیا جس سے وہ کبھی اور کسی طرح بعد میں جانبر نہیں ہو سکتے۔

ملامت اور بحث نہیں چاہیئے

انگریزی شاعر روڈیارڈ کپلنگ نے ایک بہت عمدہ نصیحت "بائے اسکاوٹس" کے لئے کی ہے جو ہر جگہ چسپاں ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "جب تم پر تنگ وقت پڑ جائے تو تم کو ملامت یا شکایت یا بحث یا شور نہ کرنا چاہیئے" اگر آپ لوگ اسکاوٹس (ہراول) ہیں تو آپ کو خواب غفلت سے بیدار رہنا چاہیئے اور بے خوف و خطر واقعات کو دریافت کرنا چاہیئے تاکہ جو فوج آپ کی پیچھے آرہی ہے اس کو پورا بھروسہ رہے کہ ہمارے کوچ سے پُر تاثیر اور کامل نتیجہ حاصل ہو جائیگا۔

عمل، خاص مقصود معین کر کے ہونا چاہیئے۔

تعلیم کو عمل کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ہراول فوج کو لڑنے والے سپاہیوں کے ساتھ ہے۔ ایک اچھے محکمہ مخبری کے بغیر ایک بہادر سے بہادر اور پورے طور پر مسلح فوج بیکار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے وہ عمل جس میں اچھے تعلیم یافتہ اشخاص کی رہنمائی نہ ہو بے ثمر رہ جاتا ہے یا در اصل مضر ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ خیال غلط ہے کہ تعلیم بذاتہا یعنی علم بے عمل، کوئی سحر نما قوت رکھتی ہے۔

علم، علم کے لئے ہی! جب ہم کو تحصیل علم کی محض علم کی غرض سے ترغیب دی جاتی ہی تو ہم فوراً اُس نصیحت کے یہ معنی لگانے لگتے ہیں کہ علم بجائے خود ایک مقصد ہے نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ اس قسم کی تحریکوں کا حشر انسانی عمل کے دوسرے شعبوں میں بھی دیکھتے ہیں۔ مثلاً ہنر کا حاصل کرنا محض ہنر کی غرض سے (نہ کہ اس کی اشاعت سے فوائد عام میں ترقی کرنے کے ارادہ سے) اور سائنس کا محض اس غرض سے تحصیل کرنا کہ اس کا نام سائنس ہی (نہ کہ اس غرض سے کہ ہنر اور پیشہ میں اس سے فائدہ حاصل کیا جائے اور اعلیٰ نتائج نکالے جائیں)، تیسری مثال لیجئے کہ مذہبی پیشوا کی محض اس وجہ سے تعظیم کرنا کہ انھوں نے تقدس کا دعویٰ کیا ہے (نہ کہ اس وجہ سے کہ اُنھوں نے حق کی ہدایت کی اور قوم کے رہنما ہوئے) ان سب باتوں سے محض خود غرضی ثابت ہوتی ہی اور تعصب اس کا نتیجہ ہوتا ہی لا رہبانیة فی الاسلام۔ اور ایسے خیالات کا یہ بھی نتیجہ ہوتا ہی کہ بعض الفاظ یا رسوم مروج ہو جاتے ہیں جس کو طوطے کی طرح کہنے والے معزز سمجھے جاتے ہیں نہ کوئی فائدہ عوام الناس کو حاصل ہوتا ہے اور نہ کوئی ترقی کی امید ہو سکتی ہی۔ ان بے سود فضائل کی مثال اُس بیل کی ہی جو اپنی غذا خود اپنی جڑوں کے ذریعہ سے نہیں حاصل کرتی ہی بلکہ دوسرے درختوں کے زندگی کا رس جذب کر لیتی ہی اور اُن درختوں کو خشک کر دیتی ہی۔ یہ امر نہایت ضروری ہی کہ حتی المقدور استقلال کے ساتھ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ علوم و فنون و تعلیم کو بے جا طور پر ذلیل و خود غرض مقاصد کے ساتھ مملو نہ کیا جائے اور صرف اس بات کے لئے ہی استعمال نہ کیا جائے کہ اس سے روپیہ پیسہ حاصل ہو اور یہ بھی خیال رکھنا ازحد ضروری ہی کہ وہ علوم و فنون و تعلیم سچی زندگی کے وسیع بساط پر مبنی ہوں اور تمام عالم کی تحقیقات اُسی حیثیت سے ہونا چاہئے جیسا خالق برحق نے اُسے بنایا ہی نہ کہ جیسا کسی مخلوق نے اپنے قیاس کے مطابق اُسے بیان کیا ہے۔

تعلیم کو زندگی کے اصلی واقعات پر مبنی ہونا چاہئے۔ تعلیم کا ذکر بطور ایک غیر محسوس شے کے کرنا غلطی ہی۔ اس کی بنیاد ہمیشہ زندگی کے محسوس واقعات پر ہونی چاہئے۔ اور یہی اصلی تعلیم کا معیار ہے۔ تعلیم میں ہر طرح کی دماغی اور تمدنی تغیرات و تبدیلات کا لحاظ ہونا چاہئے۔ انسانی دماغ میں جو جو خیالات ہوتے ہیں اُن سب کو اس طریقہ پر ڈھالنا چاہئے کہ وہ بہترین تمدنی خوبیوں کا ذریعہ بن سکیں۔ اُن تمام مشکلات کا جو کہ انسان کو اپنی زندگی میں روزمرہ پیش آتی ہیں اس طریقہ سے ملحوظ رکھنا چاہئے کہ مشکلات کے وقت تعلیم کے ذریعہ سے اُن کو حل کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے اور کسی طرح پر انسان کا دل مایوسی کی طرف مائل نہ ہو۔ ہر ایک واقعہ کا نہایت استقلال و مضبوطی کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی امر فروگزاشت ہو جائے اور

طالب علم کو بعد میں کوئی ایسا امر پیش آجائے کہ جس کے لئے اس کی تعلیم نے اس کو مضبوط نہ بنایا ہو۔ سچائی وخلوص کا ایک مستقل معیار نہایت استواری کے ساتھ قائم کیا جائے اور وہ نہ صرف سبق کے ذریعہ سے قائم کیا جائے بلکہ روزمرہ کی زندگی میں اس پر عمل بھی کیا جائے۔ صداقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا مذہبی ہمیشہ اور ہر زمانہ میں یکساں ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ جن واقعات کی نسبت اس کو تحقیق کرنا پڑتا ہے اور جن وقتوں کا ان کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ مختلف اوقات اور مختلف حالات کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کوئی اخلاقی ومذہبی قانون اور رسم جن کو انسانی اعمال سے تعلق ہے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک کہ اس میں مترادف اثرات اور خواہشات اور مختلف آراء کے اتحاد کا مادہ نہ ہو۔ اس قسم کے قانون ورسوم میں اس امر کی بھی سخت ضرورت ہے کہ مختلف انسانی ضروریات اور اُن نازک تحریکات کا بھی لحاظ رکھا جائے جو کہ بظاہر محسوس نہیں ہوتے لیکن انسانی زندگی کو ایک عظیم الشان قوت کے ساتھ متاثر کر سکتے ہیں۔

تعلیم میں اُن ضروریات کا لحاظ رکھنا لازمی ہے جو وقت اور موقع کے لحاظ سے ہوتی رہتی ہیں

کوئی تعلیمی دستور العمل جس میں کہ ہر زمانہ اور ہر حالت کے لوگوں کے لئے یکساں انتظام نہ کیا گیا ہو اور جن میں انسان کی ان ضروریات کا لحاظ رکھا نہ گیا ہو جو وقت اور موقع کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں کسی طرح مفید نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے جو یا تو بالکل خشک ہو گیا ہے یا خشک ہو رہا ہے۔ اور وہ درخت نہ پھلتا ہے نہ پھولتا ہے اور باوجود اس عارضی سایہ کے جو کہ وہ چند روزہ دیتا ہے یقیناً چند روز میں معدوم ہو جائے گا۔

نابینا لوگوں کی تعلیم سے ایک مثال

ضروریات اور مواقع کو ملحوظ رکھ کر جو انتظام مقرر کیا جاتا ہے اُس کی ایک خوشگوار مثال ہم کو اُن عجیب نتائج سے ملتی ہے جو کہ نابینا لوگوں کی تعلیم سے اخذ کئے گئے ہیں اگرچہ یہ تحریک بالکل جدید ہے تاہم انسانی ہمدردی اور قابلیت کو متفقہ صورت میں پیش کئے جانے کی یہ ایک ایسی عجیب مثال ہے کہ میں اس کا ذکر درمیان میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کے سچے واقعات کا بیان کیا جائے تو اس میں بہت سی باتیں ایسی ملیں گی جو زیادہ سے زیادہ دلچسپ ناول پر بھی فوقیت رکھتی ہوں گی۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کس قدر اعلیٰ درجہ کے دماغی خیالات کو انسانی کوشش کے ذریعہ سے عملی صورت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ آپ صاحبان میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جنھوں نے نابینا لوگوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی ٹوکریاں وغیرہ اور موتے اور دیگر دستکاری کے نمونے دیکھے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ میں سے بعضوں نے نابینا لوگوں کو ابھرے ہوئے حروف کی کتابیں

اپنے غیر معمولی قوت لامسہ سے پڑھتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ آپ لوگوں میں سے اکثر نے تو یہ نہ دیکھا ہوگا لیکن جن اصحاب نے یہ دیکھا ہے اُن کو غالباً یہ خیال نہ ہوا ہوگا کہ اس طریقہ کا پڑھنا محض تفریحاً ٹٹولنے کی ایک کوشش ہی نہیں ہے بلکہ بہترین دماغی علوم کی تعلیم پانے کا ایک نہایت سریع الاثر ذریعہ ہے۔ اندھوں کے لئے مختلف اخبار شائع ہوتے ہیں اور لندن کے قریب نارووڈ میں اندھوں کا ایک رائل نارمل کالج موجود ہے جہاں ان کو مدرسی سکھلائی جاتی ہے۔ اس میں علم موسیقی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ گزشتہ چالیس یا پچاس برس کے اس کے تجربے سے نہ صرف یہ ثابت ہوگیا ہے کہ نابینا ہونا کوئی ناقابلیت تعلیم کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ نابینا ہونا بعض ایسے پیشوں میں مخصوص مدد دیتا ہے جن میں اعلیٰ دماغ کی ضرورت ہے اور جن کی تنخواہیں اور اُجرتیں کثیر ہوتی ہیں۔

وہ پیشے جن میں نابینا ہونا کچھ باعثِ نقصان نہیں ہے

آلات موسیقی جو غایت درجہ کے نازک اور اعلیٰ قیمت کے ہوتے ہیں اُن میں سُر نکالنے کا کام بہت ہی دقیق ہے۔ اس کام کے لئے معمولی بینا آدمی کو یہ دقت پڑتی ہے کہ اس کی توجہ دیگر اشیا کی طرف جو وہ دیکھتا ہے تقسیم ہو جاتی ہے۔ مگر نابینا کا دماغ پورا پورا راگ کے پیدا کرنے کی آواز پر ایسا مکمل طور پر متوجہ ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ کامل ہوتا ہے۔ ایک دوسری اچھی مثال کا ذکر کرنا بھی موزوں ہوگا۔ پارلیمنٹ میں یا جلسوں میں بڑے بڑے اہل فصاحت تقریر فرماتے ہیں۔ زبانی تقریروں کا مختصر نویسی میں لفظ بلفظ رپورٹ کرنا مشکل امر ہے اور بہت قابلیت و ذہن کا محتاج ہے۔ اس پیشہ میں بھی بینا آدمی کی توجہ اور دماغی قوت مقرر یا حاضرین کی صورت یا لباس یا حرکات دیکھنے میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن نابینا مختصر نویس اپنی پوری توجہ تقریر کے الفاظ پر مبذول کرتا ہے جب ہم اس قسم کے نتائج کو دیکھتے ہیں تب ہماری آنکھیں کھلتی ہیں اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قدرتی یا اتفاقی ضعف یا نقص ایسا نہیں ہے جس کو کسی مفید کام میں استعمال نہ کیا جا سکے۔ بشرطیکہ تعلیمی دستور العمل مدبرانہ اور دانشمندانہ طریقہ سے بنایا گیا ہو

جماعت کی مجموعی قابلیت میں ترقی

بہترین تعلیمی جماعت کا یہ مقصد نہیں ہونا چاہئے کہ وہ لوگ جو معمولاً کام کرنے کے قابل سمجھے جاتے ہیں انھیں کو زیادہ قابل بنایا جاوے بلکہ اُن لوگوں کو بھی جو کہ کام کرنے کے قابل معمولاً نہیں سمجھے جاتے اس امر کا استحقاق اور موقع دیا جاوے کہ وہ ایک پیچیدہ اور شائستہ جماعت کے کام میں حصہ لے سکیں اور ترقی کر سکیں اور اس کے مختلف ضروریات اور فرائض پورے طور سے ادا کر سکیں۔

تعلیم مسلمانان کے خاص انتظام کی ضرورت

خاص ضروریات و حالات کا لحاظ کئے جانے کی بھی ضرورت مسلمانوں کی تعلیمی مسائل کی جانب جداگانہ توجہ کے لئے قوی ترین دلیل ہے علیگڑھ کالج کے ابتدائی زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس کا وجود مسلمانوں کو دوسری اقوام سے علیحدہ کرنے کا باعث ہوگا اور نیز یہ کہ اس کالج کے طلبہ کو اپنی آئندہ زندگی میں اکثر مشکلات اس وجہ سے پیش آئیں گی کہ وہ مسلمان ہوں گے۔اور بس۔ اب کالج کو شباب پر پہونچے ہوئے عرصہ ہوگیا اور اس قسم کے خطرات و خوف کا کامل طور پر بطلان ہوچکا۔ کالج کا اثر مسلمانوں کو اور قوموں سے علیحدہ کرنے کا نہیں ہوا بلکہ اور قوموں سے مل جل کر زیادہ قوت حاصل ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ آنریبل مسٹر **سید علی امام صاحب** علی گڑھ کالج اور اس کی تمام تحریکات سے پورے طور پر متفق نہیں ہیں۔ ان کا حال میں حضور والیسرائے کے ایگزکٹیو کونسل کے جلیل القدر ممبری پر فائز ہونا حضور **لارڈ منٹو صاحب** سابق وائسرائے ہند کے اعلیٰ صلح جو پالیسی کا بہترین نمونہ ہے۔ اب کیا کوئی شخص اُن پر تفرقہ اندازی کا الزام لگا سکتا ہے۔ علی گڑھ کالج کے پرانے طالب علم جو اس کثرت سے آج میرے گرد جمع ہیں کہ اُن کے درمیان میں میری موجودگی گویا مداخلت بیجا معلوم ہوتی ہے اور مجھ کو رشک آتا ہے کہ میں اُن میں سے کیوں نہ ہوا۔ اُن میں سے ہر ایک خودداری، دیانت، مستقل مزاجی اور اخلاق کا ایک مستند نمونہ ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس قسم کے لوگ اتحاد پیدا کریں گے اور بجائے اس کے کہ وہ تفرقہ اندازی کا ذریعہ ہوں اتفاق کے باعث ہوں گے۔ انھوں نے دنیا میں اپنے لئے ذرایع پیدا کر کے کافی ہمت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ لوگ نئے نئے دستور العمل اور اسکیموں کے موجد ہیں جن سے علی گڑھ کالج کا اثر مثل خمیر کے زندگی بھر مزہ دیتا رہیگا۔ ان میں سے بعض منچلے طلباء نے حال میں اخباری دنیا کے خار دار منزل میں جرأت کر کے قدم رکھا ہے اور ایک رسالہ جاری کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اولڈ بوائز میں جو کہ بوجہ فاصلہ کے ایک دوسرے سے بآسانی سے نہیں مل سکتے اس ذریعہ سے اتحاد رکھیں اور قلبی قربت حاصل کریں۔ انھوں نے دنیا میں داخل ہو کر انتظام اور دوسری جماعتوں کی جائز خواہشات و خیالات کے ساتھ تطابق کی اعلیٰ قابلیت کا اظہار کیا ہے۔ یہ سب باتیں دیکھتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فرقہ تنہائی میں رہ کر اپنی حالت کو تباہ کر رہا ہے۔

دیگر فرقوں کی مثالیں اور نظائر

ہندوستان میں اپنے لئے مخصوص تعلیم کی ضرورت کا بہترین ثبوت دیگر اقوام کی اس قسم کی تحریکات کے دیکھنے سے بھی ملتا ہے۔

ہندوستان میں عرصہ سے والیان ملک کے لڑکوں کی تعلیم کے لئے خاص کالج موجود ہیں۔ اور حضور

لارڈ کرزن صاحب کے زمانہ میں جو جدید انتظام ان کالجوں کے متعلق کیا گیا اس سے ہندوستان کی ریاستوں کے لئے بہت کچھ فوائد متصور رہیں۔ ڈیرہ دون کا فوجی اسکول (کیڈیٹ کور اسکول) اپنی نوعیت کا بہترین اسکول ہے۔ لکھنو کا کالون تعلقہ دار اسکول جس سے مجھے اکثر تعلق رہتا ہے۔ تعلقہ داران اودھ کے لئے نہایت اچھا کام کر رہا ہے۔ بنارس کا سنٹرل ہندو کالج۔ الہ آباد کا کالیستھ پاٹھ شالا اور مختلف چھتری مدارس جو کہ ملک کے متفرق حصوں میں قایم کئے جا رہے ہیں اس امر کی کافی شہادت ہے کہ لوگ یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ تعلیم کو اس فرقہ کی ضروریات کے موافق ہونا چاہئے جس کو کہ تعلیم دلانا مقصو ہے۔ ہندوستان میں جو متفرق یورپین گروہ ہیں انھوں نے بھی اپنے اپنے اسکول علٰحدہ قایم کئے ہیں اور نصاب تعلیم بھی علٰحدہ رکھے ہیں۔ ہندوستان کے اسکول اور کالجوں کے دستور العمل میں یہ اصول اس قدر پختگی سے قایم ہے کہ جو لوگ ہندوستان کی حالت سے خوب واقف ہیں وہ بلا عُذر اس اصول کو قبول کرلیں گے۔

مُسلم یونیورسٹی کی ضرورت

اگر یہ اصول کالجوں اور اسکولوں کے متعلق عمل میں لایا جاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ یونیورسٹیوں تک اس کو وسعت نہ دی جائے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ایک مسلم یونیورسٹی کا خوشگوار خواب علی گڑھ کئی سال سے دیکھ رہا ہے۔ اس یونیورسٹی کے بعض حامیوں نے اس کو "مختص القوم یونیورسٹی" کہا ہے۔ بلاشک اس خیال کی تائید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جس مُسلم یونیورسٹی کی بنا ہم لوگ ڈالنا چاہتے ہیں وہ اُس معنی میں فرقہ کی یونیورسٹی نہ ہوگی۔ جو معنی عام طور سے اس لفظ کے سمجھے جاتے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں شیعہ عقائد یا سنی اصول یا کسی ایک مقلد یا غیر مقلد فرقۂ اسلام کے اصول کی تعلیم نہ دی جائے گی۔ بلکہ آزادی وجدّت خیالات کو وسعت دینے کی کوشش کی جائے گی۔ اس یونیورسٹی کا دروازہ غیر مُسلم قوموں کے لئے اس طرح کھلا رہے گا جیسا کہ علی گڑھ کالج کا ہے۔ یہ یونیورسٹی محض اس معنی میں مسلم یونیورسٹی ہوگی کہ اُس میں مسلمانانِ ہند کے دو پشت کے تعلیمی تجربات اور خیالات کو عمل میں لایا جاوے گا۔

مُسلم خیالات وجذبات

یہ یونیورسٹی اُن طریقوں کو رواج دے گی جو اسلامی روح کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیں جو ہمیشہ آزاد خیالی کی حامی اور تنگ خیالی کے خلاف رہی ہے۔ اس یونیورسٹی میں علم و سائنس انسانی زندگی کی خدمت کریں گے اور انسانی زندگی کو اصلی واقعات کی کسوٹی پر کس کر جانچیں گے۔ اس کی تمام تعلیم قرآن شریف کی اس آیت کی پابندی میں کوشاں رہے گی۔ قولہ تعالیٰ فسیروفی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المتقین

ترجمہ - پس عالم بھر میں سیر کرو اور اُن لوگوں کے تجربات کا مشاہدہ کرو جنھوں نے خدا کے راستہ میں چلنے کی کوشش کی ہے - اس یونیورسٹی کی یہ تعلیم ہوگی کہ قومیت اور زبان و دولت کے اختلافات انسان کے باہمی تعلقات کے مانع نہیں بلکہ ایسے اختلافات کو انسانی خدمت میں خاص طور پر بطور آلہ کے استعمال کیا جائے گا - بلند نظری، اعتدال، صبر، مستقل مزاجی، استحکام خیالات یہی صفات ہیں جن کو تعلیم مرد و زن کی اصل بنیاد قرار دے گی - انسانی قوت امتیاز کو پیدا کرنا - نفس کو قابو میں رکھنے کی عادت پیدا کرنا اور قلب کے تمام اوصاف کو جن کو عموماً لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں پیش نظر رکھنا - یہ تینوں امور تعلیم کے پائے سمجھے جائیں گے - نہ صرف دماغی تعلیم اور صنعت و حرفت کی تعلیم

بلند نظری

اس کا دماغی افق کسی خاص فرقہ یا قوم یا مذہب کی تواریخ یا درس گاہوں تک محدود نہ ہوگا کیونکہ اسلام کو ہم اب بھی پورے طور پر ایک متحد مذہب کہہ سکتے ہیں - ہم نے ایسا خواب دیکھنے کی جرات کی ہے اور میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کسی معنی میں ہمارے اس خواب کو ایک فرقے کی یونیورسٹی کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں - کیا یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اپنے خواب کو عملی صورت میں لانے کی کوشش کریں - یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہمارے یہ مقاصد ہیں تو ہم کو ایک علیحدہ یونیورسٹی کی کیوں خواہش ہے -

موجودہ یونیورسٹیاں کافی نہیں ہیں

اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی موجودہ پانچ یونیورسٹیاں ان مقاصد کو پورا نہیں کرتی ہیں اور نہ کر سکتی ہیں وہ سیاسی اور تمدنی حالات سے اس قدر متاثر ہوتی ہیں کہ اُن کا اثر ایک محدود دائرہ سے باہر نہیں جا سکتا - ان کی بنا پڑنے کے بعد ہندوستان کی ضروریات بہت کچھ بڑھ گئی ہیں محض دماغی تعلیم کے مرکز ہونے کی حیثیت سے بھی وہ کافی ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے ان دماغی کمزوریوں کا علاج کرنے میں بھی ناکامیاب ہوئی ہیں جو کہ جدید خیالات کے تصادم کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دماغوں میں پائے گئے ہیں - بلاشبہ موجودہ یونیورسٹیوں میں روز بروز ترمیم ہو رہی ہے اور جدید ضروریات کے لحاظ سے اُن میں ترقی کی جا رہی ہے لیکن کوئی یونیورسٹی جو سیاست کے امورات سے محدود ہے انسانی دماغ کے تلوّن اور تمدنی جماعتوں کے تفرقہ اندازی کا مقابلہ اس قدر کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتی جیسا کہ ایک کامیاب پبلک درس گاہ کر سکتی ہے جو سیاست سے علیحدہ ہو مگر اُس کے پورے مقاصد سے متفق ہو اور اُن کے ادا کرنے پر آمادہ ہو یہ حُسن اتفاق ہے کہ اب ایک مخصوص یونیورسٹی کی خواہش ظاہر کرنے والے صرف مسلمان ہی نہیں ہیں - اُس جلیل القدر خاتون نے جو ہندو کالج کی

تقدیر کی رہ نما ہی۔ ایک خاص یونیورسٹی کی اسکیم (دستور العمل) اپنے خیالات کے موافق تیار کر کے شائع کی ہی۔ یہ دستور العمل کسی طرح سے ہمارے دستور العمل کا مخالف نہیں ہی بلکہ اکثر حصّوں میں وہ ہماری یونیورسٹی کو تکمیل دینے والی کہی جاسکتی ہی۔ لیکن ہمارا قطعی فرض ہی کہ ہم کو نہایت سرگرمی سے اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے اور ہم کو مان لینا چاہئے کہ جس وقت ہم ضروری کامیابی کے شرائط پورا کرنے کا ذمّہ لے سکیں گے۔ اُسی وقت ہم جدید محکمہ تعلیم کی ہمدردی اپنی طرف مبذول کرلیں گے۔ یہ امید اس وجہ سے قوی ہو سکتی ہی کہ جدید محکمۂ تعلیم آنریبل مسٹر بٹلر صاحب بہادر جیسے روشن ضمیر اور ہمدرد ممبر کے زیر انتظام ہی اور گورنمنٹ ہند کے فرماں روا لارڈ ہارڈنگ بہادر جیسے مشرقی معاملات کے تجربہ کار وائسرائے ہیں۔

حصول سرمایہ

یہ خیال کرلینا سخت غلطی ہوگی کہ صرف سرمایہ کا مہیا ہو جانا ہی اس اسکیم کی عملی صورت اختیار کرنے کی کافی شرط ہی۔ مالی ذرائع کا مہیا ہونا واقعی ایک اہم معاملہ ہی لیکن یہ سب سے زیادہ ضروری نہیں ہی۔ ہم کو اس امر کا بھی لحاظ رکھنا ہی کہ اس اسکیم کو عمل میں لانے کے واسطے ایسے اشخاص کی ضرورت ہوگی جو اس کام کو کر سکیں۔

کام کرنے والے اشخاص

ایک یا دو اعلیٰ خیالات اور عملی دماغ کے لوگ کافی نہیں ہیں آپ کو محض ایسے لوگوں کی ضرورت ہوگی جن میں تعلیمی مادّہ اور انتظامی قابلیت ہو جو اپنا تمام وقت اور قوت اس اسکیم کو عملی صورت میں لانے کے لئے صرف کرسکیں۔ کالج کی گزشتہ تاریخ کے تجربے نے ہم کو بتا دیا ہے کہ انتظامی کمیٹی کی ترتیب سب سے زیادہ ضروری ہی۔ علاوہ اُن معمولی صفات کے جو کہ ہر ایک کاروباری معاملہ میں ضروری ہوتی ہیں اس کا اثر پبلک میں اس قدر ہونا چاہئے کہ پبلک اُس پر بھروسہ کرسکے۔ اس میں اس امر کا کافی مادہ ہونا چاہئے کہ تعلیمی اسٹاف کے ساتھ کام کرسکے اور طالب علموں کی عادتوں اور ضروریات کے متعلق اس قدر معلومات ہونی چاہئے کہ انصاف کے ساتھ ان پر تنبیہ قایم رکھی جاسکے۔

جماعتِ معلّمان

علاوہ اس کے ہم لوگوں کو نہایت مکمّل اور اعلیٰ تربیت یافتہ معلّموں کی ضرورت ہوگی جو کہ وقت کی ضروریات کو پورا کرسکیں اور اُن میں وہ تمام صفات جو کہ اُن طالب علموں میں پیدا کئے جانا مقصود ہیں اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہوں اس وقت ادنے درجہ کی بھی کے لئے اُستادوں کی کمی کو وہ لوگ جو تعلیمی معاملات میں سرگرم ہیں محسوس کرتے ہیں اور جب ہم مسلمان اُستادوں کی طرف غور کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد میں بمقابلہ

کے نہایت شرمناک کمی ہے۔ اُن کی تعداد میں بقدر ضرورت جب کچھ زیادتی ہونے لگے گی تب بھی بہت وقت درکار ہوگا کہ قابلیت اس اعلیٰ پیمانے پر پہنچے جس کی ہم کو اپنے خیالات کے موافق نہایت شدید ضرورت ہے۔

ابتدائی تعلیم کی توسیع اعلیٰ تعلیم کی عمارت کے لئے ضرور ہے کہ ابتدائی تعلیم بہت وسیع ہو تاکہ عمارت کو تقویت رہے ورنہ بوجہ ضعف بنیاد کے بالاخانہ منہدم ہوجائیگا مجھ کو تعلیم کی چند نہایت سرگرم معاونوں کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اُن کے خیال میں ہماری ابتدائی تعلیم بے انتہا محدود ہے اور اُن کی خواہش ہے کہ ہم لوگوں کے ذرائع ہمارے ابتدائی اسکولوں کی تعداد میں ایک معتدبہ اضافہ کرنے میں صرف کئے جائیں۔ میں آپ لوگوں کے پاس آنریبل مسٹر جسٹس کرامت حسین صاحب کا ایک مطبوعہ پیغام لایا ہوں اُنھوں نے اس مسئلہ پر چند نہایت قابل تعریف تجاویز پیش کی ہیں جن میں اُن کا حسب دستور فلسفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

تعلیم نسواں علاوہ ابتدائی تعلیم کی توسیع پر زور دینے کے وہ تعلیم نسواں کی سخت ضرورت کا اظہار فرماتے ہیں۔ علی گڑھ میں اس مسئلہ کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ شعبہ تعلیم النسواں کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی گڑھ گرلس اسکول میں طالبات علم کی تعداد اس حد تک پہنچ چکی ہے جس کے کرکٹر (کرکیٹ کھیلنے والے) اس قدر آرزومند ہوتے ہیں (یعنی ایک سو) گو اسکے جاری ہوئے۔ صرف دو تین سال ہوئے مگر اس نے اپنا مرکز قائم کرلیا ہے۔

اور جیسا کہ مسٹر سید کرامت حسین صاحب منصفانہ طور سے فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کی ترقی کے متعلق کوئی دستورالعمل جس میں عورتوں کا لحاظ نہ کیا گیا ہو خلاف فطرت ہے اور اس لئے وہ ضرور ناکامیاب ہوگا۔ محض یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ ؎

جنت کہ سرائے جاودانی است

زیر کفِ پائے مادران است

اگر صرف مردوں کا فائدہ بھی سمجھا جاوے تو ذکور اور اناث کی مساوات تمدنی ترقی کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔ ہمارے بھائیوں کی اور ہماری آئندہ نسلوں کی بہبودی اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری مائیں بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں علم اور اجتماعی تجربے میں اگر ہم سے زیادہ نہوں تو مساوی ضرور ہوں کسی شادی میں زن و شو کے درمیان اگر عمر کا تفاوت بہت نمایاں ہوتا ہے تو وہ نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے اور اس کا معیوب سمجھا جانا حق بجانب بھی ہے تو کیا پبلک کو اس سے زیادہ اظہار تنفر اس حالت میں

نہ کرنا چاہیئے۔ جب کہ ایک ہی جماعت کے ذکور اور اناث میں جسمانی دماغی اور تمدنی تعلیم کے مواقع کا فرق ایک مضحکہ آمیز درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔

سائنس کی تحقیقات

کوئی جدید یونیورسٹی، یونیورسٹی کہنے کے قابل نہ ہوگی جب تک کہ اس میں پورا انتظام علمی اور عملی صیغہ جات سائنس کی تحقیق کا نہو۔ ہندوستانی کالجوں کا اب تک یہ ایک کمزور شعبہ رہا ہے اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے دائرے میں یہی کالج تعلیمی درسگاہیں ہیں لیکن یہاں جہاں ممکن ہے۔ اس کمی کو پورا کیا جا رہا ہے۔ اگر دراصل آپ ایک تعلیم دینے والی یونیورسٹی چاہتے ہیں جس کے مقاصد میں سائنس کے ایجاد اور اختراع بھی شامل ہوں تو اس امر کی ضرورت ہے کہ سائنس اور فنون مخصوصہ کی ابتدائی تعلیم ایک بہت وسیع پیمانے پر کی جائے جس کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبا مہیا ہوں۔ فنون دستکاری میں کوئی جدت پیدا کرنا یا موجودہ طریقوں کو کسی نئی صورت میں استعمال کرنا بالکل فضول اور بے کار ہو جائے گا۔ تاوقتیکہ سمجھدار اور قابل دستکاروں کی ایک بڑی جماعت اور سائنس کے کمروں میں بیٹھ کر پیدا کئے ہوئے نتائج کو ورکشاپ (یعنی کارخانہ) کے اندر عملی صورت میں لانے کے لئے موجود نہ ہو۔

یہاں ابھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ کسی چیز کی چوٹی تک پہنچنے کے لئے بنیاد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بہت سے فنون اور دستکاریاں مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں اور ہمارے بہت سے دستکاری کے فنوں کا زائل ہو جانا ہمارے لئے خاص طور سے اندوہ ناک نتائج رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے دستکاری کی مشاقی اپنی محنت کے پھل سے فوراً محروم ہو جاتی ہے اور اس کے ماہروں کو ناتجربہ کار کاریگروں سے بیجا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے دست کاری کا معیار برابر گھٹتا چلا جاتا ہے اور اسی حد تک عام پبلک کا مذاق بھی رکیک ہوتا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے کاریگروں کو ایسا ذلیل کر دیں کہ ان کو کم اجرت ملے اور بایں ہمہ تکلیف کے ساتھ روزمرہ یکساں کام کرنا پڑے تو وہ ان اعلیٰ تعلیم یافتہ کاریگروں کی مناسبت اور جدت آمیز قابلیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو کہ اس سوسائٹی سے علاقہ رکھتے ہیں جس کا انتظام نہایت عمدہ ہے اور جس میں تعلیم نہایت عام ہے۔ دست کاری میں اور نیز واقعات زندگی میں دماغی خیالات اور دلی جذبات کو ہاتھوں کے کام کی صورت میں تبدیل ہونا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ وہ خوبصورت یا موثر ہو سکیں اپنی ذات اور دیگر اشیا کا جو ہمارے چاروں طرف ہے خوبصورت اور موثر بنانے کی کوشش کرنا کوئی لغو خیال نہیں ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ ان کو عملی صورت میں لانے کی طرف پہلا قدم رکھیں آپ کو لازم ہے کہ آپ اپنے دستکاروں اور کاریگروں میں اس بات

کی خواہش پیدا کریں کہ وہ اس فرقہ کی ترقی میں جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں اپنی حیثیت کے موافق اعلیٰ یا ادنیٰ حصہ لیں۔

صنعتی اسکول

اسی وجہ سے اس امر کی نہایت سخت ضرورت ہے کہ دست کاری کی تعلیم کے ساتھ عام تعلیم بھی ہونی چاہیئے تاکہ ایک قسم کی تعلیم دوسری قسم کی تعلیم پر اثر ڈال سکے اور پھیل سکے۔ ہز ہائنس جناب سر آغا خاں صاحب بہادر اور دیگر رہنمایان قوم کی یہ تجویز کہ ایک صنعتی اسکول علی گڑھ میں قایم کیا جائے اور جناب لارڈ منٹو صاحب کے نام سے منسوب کیا جائے تعلیم مسلمانان کے جملہ بہی خواہوں کے نہایت دل سوزانہ غور کی مستحق ہے۔

افلاس

ہندوستان کے مسلمانوں کا افلاس اکثر ان کی تعلیم اور ترقی کے راستہ میں ایک ناقابل گزر مرحلہ بیان کیا جاتا ہے۔ میں اس دلیل کی کچھ بہت زیادہ وقعت نہیں کرتا بلاشبہ افلاس باعث نقصان ہے۔ لیکن اُن لوگوں کی حالت میں جو صحیح جذبات اور مصمم ارادہ رکھتے ہیں وہ ایک قوی دوا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کسی پس ماندہ قوم میں سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ متموّل طبقے ہی اصلی تعلیم کے خیال سے سب سے زیادہ دور ہوتے ہیں۔ غربا اپنی مفلسی کی وجہ سے بہترین کوشش جو اُن کے امکان میں ہے کرتے ہیں اور مشکلات کے دفعیہ میں اُن کو اُس سے بہتر سے بہتر درس گاہ میں (یعنی تجربے کی درس گاہ میں) تعلیم ملتی ہے بہترین فلسفہ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ دولت کا (جو کہ لفظ خوشباشی کی ایک دوسری صورت ہے) زیادہ تر یہی منشا نہیں ہے کہ اسباب معاشرت مجتمع ہو جائیں۔ بلکہ اصل منشا یہ ہے کہ خوش باشی کے حصول کا مادہ پیدا کیا جائے اور اس کو بہترین طریقہ سے کام میں لایا جائے۔ ہم کو یہ سبق سیکھنا چاہیئے اور میں اس کو آپ کے سامنے بطور ایک اہم مسئلہ کے پیش کرتا ہوں۔

اوقاف

ہر شخص کے لئے اپنی ذاتی آمدنی اور خرچ کا انتظام کرنا مقابلۃً ایک آسان کام ہے لیکن قوم کے روپیہ کا جو کسی خیراتی کام کے لئے یا عام مقاصد کے لئے وقف کر دیا گیا ہو بہترین طریقہ سے صرف کرنا ایک ایسا اہم فرض ہے کہ اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی ہماری قومی کام کرنے والوں کی نظر سے جدا نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کے قانون وقف کی تعریف جو عدالتوں میں ہوئی ہے اُس پر کچھ عرصہ سے پبلک کی توجہ بہت کچھ مبذول ہو رہی ہے اور اوقاف علی الاولاد کے متعلق ایک مسودہ قانون تیار کیا جا رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ جس قدر پُر زور آواز میں آپ لوگوں سے ممکن ہو آپ اس امر کو ظاہر کیجیئے کہ کوئی اسکیم اس وقت تک آپ کے لئے پورے طور سے

قابل اطمینان نہیں ہو سکتی جب تک اس میں قوم کی موجودہ تعلیمی اور خیراتی اوقاف کے لئے پورا انتظام نہ رکھا جائے کیوں کہ حال کے واقعات شاہد ہیں کہ ایسے اوقاف کا سرمایہ اکثر بدنظمی یا خود غرضی کی وجہ سے ضائع ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کی قوت حیات اس معاملہ پر منحصر ہو۔ اور یہ بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ متفرق چھوٹے بڑے اوقاف جو مختلف مقامات پر برباد ہو رہے ہیں اُن کے سرمائے ایک مرکزی یونیورسٹی کے کام میں اس طرح لائے جائیں جس طرح کہ آفتاب کی منتشر شعاعوں کو شیشے کے ذریعہ سے ایک مرکز پر مجتمع کیا جاتا ہے۔

نوزادگیٔ علم

تعلیم کو جو تعلق جملہ سائنس صنعت وحرفت اور تمدنی اخلاقی مذہبی اور سیاسی خیالات سے ہے اور جملہ اختلاف حالات اور مشاہدات جو کہ انسانی زندگی میں واقع ہوتے ہیں۔ ان چیزوں پر میں نے استدلال کیا ہے جو لوگ کہ اپنے افق کو تنگ کر دیتے ہیں گو اُن کو جزوی معاملات میں چند معمولی فوائد حاصل ہو جائیں تاہم وہ آئندہ مشکلات کا بیج بوتے ہیں۔ جملہ تواریخ سے ہم کو یہی سبق ملتا ہے " نوزادگی علم " کا لفظ آج کل بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیشہ یہ یاد نہیں رکھا جاتا کہ اُس کے معنی یہ ہیں کہ نہایت تجربہ اور تدبر کے ساتھ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کو دوبارہ از سر نو آراستہ کیا جاوے۔ چند پریشان خیالات سے اور وہ بھی اس قدر خامی کے ساتھ مجتمع ہو گئے کہ خود اُن کے معاون علاوہ منطقی دلائل سے اُن کو ثابت کرنے کے اپنی تمدنی زندگی پر اُن کو عمداً استعمال کرنا پسند نہ کریں گے " نوزادگی علم " نہیں ہو سکتی۔ نوزادگی علم کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ گزشتہ قوتیں زائل ہو جائیں بلکہ اُس سے یہ بھی مطلب ہے کہ جدید حیات اور جدید قوتیں پیدا ہوں۔

نوزادگی لاطینی یورپ میں

پندرھویں اور سولھویں عیسوی صدیوں میں یورپ میں لاطینی یورپ کی نوزادگی کو دیکھنے سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جدید تحریک کے بڑے بڑے معاونوں میں دماغی قوت اور مختلف اقسام کی قابلیت اس درجہ موجود تھی کہ ہم کو حیرت ہوتی ہے۔ لیونارڈو ڈاونچی ملک اطالیہ میں ایک وکیل کا لڑکا تھا لیکن تیس برس کی عمر میں وہ علوم و فنون مصوری سنگ تراشی، تعمیرات، موسیقی، انجنیری اور جرثقیل پر حاوی ہو گیا تھا۔ اُس نے علم نباتات، ریاضی اور نجوم کو بھی حاصل کیا تھا۔ اور اُس نے علم تشریح جسم حیوانی میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے اس درجہ استعداد حاصل کی تھی کہ اُس کے وقیق مصوری کے نمونوں کو دیکھنے سے جو کہ اب ونڈسر کاسل میں محفوظ ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے بہت سی موجودہ زمانہ کی ایجادات کو اُسی وقت معلوم کر لیا تھا " نوزادگی علم " کی روح کا دوسرا زندہ نمونہ مایکل انجیلو جس نے سینٹ پیٹر کے گنبد کو تعمیر کرایا اور جو کہ مصور سنگتراش

سپاہی، معمار اور شاعر تھا کسی طرح کسب علوم میں لیونارڈو ڈاونچی سے کم نہ تھا۔

نوزادگی تاریخ مشرقی میں مشرقی تاریخ میں بھی آپ کو ایسے ہی واقعات کی بہت سی مثالیں ملیں گی زمانہ میجی سے جدید جاپانی تہذیب کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس میں دیکھئے کہ کس قدر مثالیں اوصاف ذیل یعنی مختلف طبقوں کی بے غرضی اور ایثار، اعلیٰ انتظامی قابلیت، استحکام مقاصد، قوت فنون اور عقلمندانہ اور مدبرانہ تدابیر، ترقی قوم کی پائی جاتی ہیں۔ تاریخ چین کے زمانۂ ہن کو آپ نہایت باعظمت اور پرجلال پائیں گے لیکن وہ زمانہ چوں کہ خاص طور سے سپاہی اور فوجی کارناموں تک محدود تھا اس واسطے اُس کی حیات بھی قلیل رہی جس وقت تک کہ خاندان منگ کے عہد میں دستکاری کی ترقی کے واسطے نئے نئے راستے نہیں کھلے تھے اس وقت تک اُس دماغی ترقی اور ان قومی خصلتوں کی بنا نہیں پڑی تھی جن کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جاپان کی جدید ترقی کا باعث ہوئیں اور جیسا کہ بعض مدبروں کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں چینی رنیسنس کی امید کی جاتی ہے لیکن یقیناً وہ چینیوں کی ایمانداری اور مضبوطی خیالات سے اور اُس جدید اثر سے جو کہ آج کل چینیوں کی خانگی اور تمدنی زندگی کو موثر کررہا ہے پیدا ہوگی۔

ہسپانیہ کے مسلمانوں کی ترقی ہسپانیہ میں مسلمانوں کی ترقی کا باعث کسب علوم وفنون کا بدرجۂ کمال ہونا اور ان کی بے تعصبی اور رواداری کہا جاسکتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ ایسی باتوں کو جو صلح کن اور باہمی تہذیب کی ترقی کی ذریعہ ہوتی تھیں حاصل کرنے اور اُن میں ایجاد و اختراع کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ مسیو رنیا صاحب کی قابل فخر کتاب یعنی "ابن رُشد کی سوانح عمری، جو فلسفی، حکیم، منجم، مصنف اور عالم تھا" اس سلسلے میں کمال دل چسپی سے بھری ہوئی ہے۔

ابن رُشد ابن رُشد اور اُس کی زندگی اور اصول کو عام مسلمان جیسا کہ چاہیئے اُس سے بہت کم واقف ہیں۔ ہز ہائنس حضور نظام حیدر آباد کی فرمائش عالی سے ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیا اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے انگریزی میں کررہے ہیں۔ اور میں اس کتاب سے دو جملے آپ کے سامنے بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا جس میں ہسپانیہ کے مسلمانوں کی حالت کا خلاصہ ہے۔ وہ یہ ہیں: "عیسائی یہودی اور مسلمان ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ایک ہی قسم کے گیت گاتے تھے اور ایک ہی طرح کے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ تمام باتیں جس سے لوگوں کے درمیان امتیاز اور فرق پیدا کیا جاتا ہے معدوم ہوگئی تھیں۔ سب لوگ مل کر ایک مشترک

تہذیب کا کام پھیلانے میں مصروف تھے۔"

مشترک تہذیب کا پھیلانا یہ مشترک تہذیب کے پھیلانے کا کام ہندوستان کی موجودہ حالت کی کنجی ہے۔ انگریزی تہذیب ہمارے لئے اتحاد کا مشترک ذریعہ ہے اس کی ابتدا بہت سے گزشتہ تہذیبوں سے اخذ ہوئی جن میں ہماری تہذیب بھی شامل ہے۔ لیکن مثل ایک درخت کے جو کہ ایک تخم سے نشوونما پاکر اس کا فیاضانہ معاوضہ سیکڑوں درجہ دیتا ہے انگریزی تہذیب بھی ہم کو ہمارا فرض نثو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ادا کرنے کے لئے طیار ہے۔ وہ ہمیشہ آزادی ترقی۔ صلح۔ ترتیب۔ قوت اور انتظام کی حامی رہی ہے اور اگر ہم عقلمند ہیں تو ہم ان جلیل القدر اصول کو قبول کریں اور ضروریات کے موافق ترمیم اور ترتیب کرلیں۔ ہم ہمیشہ اپنے دوستوں سے صدق دل سے دوست رہیں گے اور ان لوگوں کے ساتھ جنھیں ہم سے اختلاف ہے انصافاً برتاؤ کریں گے ہم اپنے سامنے نہایت اعلیٰ تمثیلیں اور خیالات رکھیں گے مگر ہم نہیں چاہتے ہیں کہ اُن کے حصول میں اپنی کامیابی کو اس وجہ سے خطرہ میں ڈالیں کہ واقعی دقتوں کو نظرانداز کردیا جائے برخلاف اس کے ہم چاہتے ہیں کہ ان مشکلات پر غور کریں اور اُن کے متعلق مکمل تحقیقات کریں اور اُن کو زیر کریں۔ اسی وجہ سے میں نے حضرت حافظ کی تقلید کی ہے اور اگر صرف ایک لفظ کی تحریک کی اجازت دی جائے تو میں چاہتا ہوں کہ جس قول سے اُنھوں نے اپنے دیوان کی ابتدا کی ہے اُسی قول پر اپنے کلام کو ختم کروں ؎

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ علم آساں نمود اول و لے افتاد مشکلہا



هز هائی نس آغا خاں
صدر اجلاس بست و پنجم (دهلی سنه ۱۹۱۱ ع)

اجلاس بست و پنجم

منعقدہ دہلی ۱۹۱۱ء

صدر ہز ہائنس سر سلطان محمد شاہ آغا خان بہادر بالقابہ

حالاتِ صدر

اجلاس شانزدہم منعقدہ دہلی ۱۹۰۲ء کے ضمن میں صفحہ ۔۔۔ پر آچکے ہیں۔

خطبۂ صدارت

حضرات! نو سال گزرے آپ نے مجھ کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا صدر منتخب فرمانے سے اعزاز بخشا تھا، جو اسی شاہی شہر دہلی میں اُس تاریخی موقعہ پر منعقد ہوا تھا۔ جب کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ معظم ایڈورڈ ہفتم آں جہانی کی رسم تاج پوشی کا دربار بحیثیت سب سے پہلے شہنشاہ ہند ہونے کے کیا گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک نہایت اہم واقعات ملک کی تاریخ میں ظاہر ہو چکے ہیں لیکن کوئی واقعہ شہنشاہ عالم پناہ جارج پنجم اور ملکہ معظمہ میری کی تشریف آوری ہند سے زیادہ مہتم بالشان نہیں ہے۔ اور یہ تشریف آوری محض اس لئے ہے کہ اپنی ہندوستانی رعایا کے سامنے بہ نفس نفیس اپنی رسم تاج پوشی کی تقریب سعید کو ادا کریں۔

ہم آج کا اجلاس نہایت مبارک اور خوش آیند وقت میں منعقد کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے اجلاس کی تاریخیں شہنشاہ معظم کی تشریف آوری کی تاریخوں سے مطابق ہیں۔

حضرات! میں اس اعزاز کے لئے بدل ممنون ہوں کہ آپ نے دوبارہ مجھ کو اپنا صدر منتخب فرمایا۔ سب سے اوّل میں **شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ** کے اس ملک ہند کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے معزز فرمانے پر اپنی وفادارانہ عقیدت کیشی کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہم سب نہایت احسانمندی کے ساتھ بندگانِ عالی کی **علی گڑھ** کی تشریف آوری کو یاد کرتے ہیں جو مارچ ۱۹۰۶ء میں وقوع پذیر ہوئی تھی، اور مجھے یقین ہے کہ یہ نہایت مبارک ومسعود تشریف آوری تمام مختلف اقوام و مذہب میں اتحاد و اتفاق پیدا کرکے اُن کو ایک قوم بنائے گی۔

یونیورسٹی کی ماہیت

حضور شہنشاہ معظم کی تشریف آوری ملک ہند کے جیسے پُرعظمت واقعہ سے اب میں یونیورسٹی کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جس کے لئے ہم بدل آرزومند ہیں۔ حضور شہنشاہ معظم نے تخت سلطنت پر جلوس فرماتے وقت اکسفورڈ یونیورسٹی کے وفد کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "یہ میری آرزو ہے کہ اپنے نامور پدر بزرگوار اور ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے قدم بقدم چل کر اس دارالعلوم کو برقرار رکھوں اور تقویت پہنچاؤں جن پر ہماری تہذیب وتمدن کی شہرت عظمت اور سرسبزی کا زیادہ تر انحصار ہے۔" اس بامعنی فقرہ سے ہم کو یونیورسٹی کی اصلی ماہیت معلوم ہوتی ہے، یونیورسٹی ایک ایسی درس گاہ ہے جس کا مقصد اُس علم سے زیادہ سکھلانا ہوتا ہے جو لیکچر روم میں سکھایا جاتا ہے، اور اگر یونیورسٹی اس مقصد کو پورا نہ کرے تو ایک بڑی خصوصیت جو اُس سے وابستہ ہی جاتی رہے گی، کسی قوم کی خوش حالی یا اُس کا کیرکٹر محض کتابی علم پر مبنی نہیں ہوتا۔ ان خصوصیات کے لئے زیادہ مستحکم بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس یونیورسٹی کے قایم کرنے میں ہمارا صرف یہ مقصد نہ ہونا چاہیئے کہ صرف کثیر سے ایک ایسی درس گاہ قایم کریں جہاں علوم مشرقی اور مغربی سائنس اور فنون حاصل ہوسکتے ہوں اور کامیاب طلبہ کو اسناد دی جاتی ہوں۔ بلکہ ہمارا مقصد ایک ایسی درسگاہ کا قایم کرنا ہے جو مسلمانان ہندوستان کی زندگی میں وہی حصّہ لے جیسے کہ یورپ کی یونیورسٹیاں ممالک یورپ کے باشندوں کی زندگی میں لیتی ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محض نمونہ کی نقالی آخر کار ناکامی ثابت کرتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک درس گاہ اُس قوم و ملک کی روایات اور تاریخی حالات کے مطابق ہونی چاہیئے جن کی خدمت کے لئے وہ قایم کی جاتی ہے۔ ہم کو دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں کے سب سے عمدہ خط وخال اور خصوصیات کو پیدا کرنے اور حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور باوجود اس کے کہ ہم یورپ اور امریکہ کی درس گاہوں اور یونیورسٹیوں کے بہترین اور شریفانہ روایات کو جاری کریں ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہم **اسلامی روح** کو زندہ اور تروتازہ رکھیں۔ ہم کو ہمیشہ اپنے اسلاف

کی پاک مثالوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اسلام کا سچا اور اصلی جوہر، اس کی پاک تعلیمات، عمل کی سچائی اور روحانی تعلیم ہے۔ افسوس ہے کہ آخری نسلیں غلط فہمی سے اس پاک تعلیم کو فراموش کر رہی ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس غلطی کی اصلاح کریں۔ اور یہ ثابت کر دیں کہ ہم کم از کم اپنے محبوب مذہب کی سچی ماہیت سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ ہم کو زمانہ گزشتہ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور اسلام کی اخلاقی اور ذہنی قوتوں میں روح پھونکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

مجوزہ مسلم یونیورسٹی یہ امر میرے لئے باعث مسرت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی یہ مہتم بالشان تحریک شبہات اور مشکلات کے مرحلے سے نکل آئی ہے اور اب اس بڑے کام کی ابتدائی منزل شروع ہو گئی ہے۔ لیکن مجھے صاف طور پر کہہ دینا چاہیئے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنی کوششوں میں پوری کامیابی حاصل ہو تو ہمیں انتہائی، بلکہ قریب قریب فوق العادۃ قربانی اور کوشش سے کام لینا چاہیئے۔ ہماری محنت کا صلہ ہماری قربانی کی نسبت سے ہوگا۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ ہماری قوم میں ایسے آدمی ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہیں اور میں آپ صاحبوں کو مسرت کے ساتھ یونیورسٹی اسکیم کی ابتدائی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں جس کے متعلقہ انتظامی فرائض کو میرے قابل دوست راجہ صاحب محمود آباد نے اس قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے (چیرز) سب سے پہلے ہمیں یونیورسٹی اسکیم کے فوری عملی پہلوؤں پر بحث کرنی چاہیئے۔ اگر ہم نے موجودہ حالات کی مساعدت سے پورا فائدہ نہ اٹھایا تو ہماری کوششیں بارآور نہیں ہوں گی اور یہ ناکامی تمام محبان اسلام کی سخت دل شکنی کا باعث ہو گی۔ پہلے تو ہمیں مشکلات کا سامنا ہے اور میں بڑے بڑے رئیسوں عام لوگوں اور اسلام کے تمام ہوا خواہوں سے جنھوں نے مسلم یونیورسٹی فنڈ میں فیاضی کے ساتھ چندہ دینے کا وعدہ کیا ہے التجا کرتا ہوں کہ وہ براہ کرم اپنا وعدہ فوراً ایفا کریں۔ اب ہمارے پاس وقت ضائع کرنے کے لئے نہیں ہے ہماری موجودہ حالت اور امیدیں نہایت نازک حالت میں ہیں۔ اُن کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہمارے پاس کافی سرمایہ ہو اور ہم میں قربانی کرنے کی ہمت ہو۔ لیکن مجھے یہ امید ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان اُس اہم کام کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور بغیر کسی توقف کے جمع ہو کر اس بڑے کام کے سرانجام دینے میں مدد دیں گے۔ قلیل سے قلیل رقم بھی فوراً وصول کر لینی چاہیئے۔ مجھے اپنے ہم مذہبوں پر اعتبار رہا اور میں یقین کرتا ہوں کہ جو شاندار موقع ان کے ہاتھ میں ہے وہ اس سے پورا فائدہ اُٹھائیں گے۔

یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن میں اپنے دوست راجہ محمود آباد اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی مساعی جمیلہ کا پورے طور پر اعتراف کرتا ہوں، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں

کہ مجھے کانسٹی ٹیوشن کے نظام اور اُس کے اصول سے پورا اتفاق ہے مجھے بیباکی کے ساتھ اس امر کا اظہار کر دینا چاہئے کہ میری ناچیز رائے میں ہمیں چانسلر کو کسی قدر زیادہ نگرانی کے اختیارات دینے میں غیر ضروری بخل سے کام لینا نہیں چاہئے، کیونکہ ایک بات جس کا مجھے پورا یقین ہے یہ ہے کہ گورنمنٹ کے حاکم اعلیٰ کا رسوخ بلاشبہ تعلیم کے معیار کی ترقی کے لئے کام میں آئے گا۔ اور یہی شاید یونیورسٹی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ وہ یہ مسائل ہیں جن پر ہمیں فوری توجہ کرنی چاہیئے۔ میں آپ صاحبوں سے بہ منت التجا کرتا ہوں کہ آپ اس نادر موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں بلکہ اس قومی کام کی تکمیل کے لئے مستقل، متفقہ اور دلی کوشش عمل میں لائیں۔ فوری اور ضروری مسئلہ یہ ہے کہ یونیورسٹی اسکیم کو قوت سے فعل میں لایا جاوے۔

پراونشیل کالج لیکن اس کے علاوہ کچھ اور اہم اور ضروری مسائل بھی ہیں جو ہماری مرکزی تعلیم سے وابستہ ہیں اور جو ہمارے غور و فکر کے محتاج ہیں۔ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو کامیاب بنانے اور تسلی بخش اور دیرپا نتائج حاصل کرنے کے لئے علمی عمارت کو ایک ٹھوس بنیاد پر کھڑا کرنا چاہیئے تاکہ اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے ہماری علمی عمارت گر نہ پڑے۔ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ علاوہ یونیورسٹی کے ہمیں اوّل درجے کے پراونشل کالج قائم کرنے چاہئیں جو مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کئے جائیں اور ایسے آدمی تیار کریں جو رفتہ رفتہ یونیورسٹی میں قابل استادوں کے درجہ تک پہنچ جائیں۔

جبری مفت ابتدائی تعلیم میں نے آپ کے سامنے اعلیٰ تعلیم کے اصول کی حمایت کی ہے۔ لیکن مجھے آپ کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرنی چاہیئے کہ ابتدائی تعلیم کے عمدہ نظام کا مسئلہ اشد ضروری ہے، کوئی سنگین عمارت نرم مٹی کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس غرض کے لئے کہ ہم اپنی قوم کو طاقت رسوخ اور قابلیت کے جائز حصہ سے بہرہ اندوز ہونے کے قابل بنائیں۔ ہمیں عوام کے فائدہ کے لئے تعلیم کا ایک عملی اور وسیع نظام قائم کرنا چاہیئے۔ یہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ عوام کے لئے پرائمری تعلیم کا انتظام کرے، جو مہذب ممالک میں بھی شخصی کوششوں کی طاقت سے باہر ہے۔ میں اس امر کا خوشی سے اظہار کرتا ہوں کہ گورنمنٹ نے مفت ابتدائی تعلیم کی حمایت کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ جہاں تک اس کے امکان میں ہوگا ابتدائی تعلیم کا دائرہ وسیع کرے گی۔ ہمیں ہمیشہ ابتدائی تعلیم کے مدعا کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ عوام کی یہی عالمگیر جہالت ہے جو مسلمانوں کو اس روحانی اتحاد اور اخوت کے سلسلہ میں منسلک ہونے سے روکتی ہے جو ہمارا اصل مقصد اور آرزو ہونی چاہیئے۔ میرا اس بات پر پورا یقین ہے کہ ابتدائی تعلیم مفت اور جبری ہونی چاہیئے۔ اور یہ ایسے طریقہ سے دی جائے کہ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی قلیل سے قلیل اور بڑی سے بڑی جماعتیں اس سے یکساں طور پر مستفید ہوں۔ پرائمری تعلیم کا کوئی نظام

تسلی بخش نہیں کیا جا سکتا، تاوقتیکہ عملی پہلو سے چھوٹی اور بڑی جماعتیں یکساں فائدہ نہ اٹھائیں۔ مجھے اس تحریک کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرنا چاہیئے کہ عوام کو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مجبور کیا جائے؛ اور اگر یہ نتیجہ خیز ہو اور اُس اعلیٰ مقصد کو پورا کرے جس کے لئے یہ اختیار کی جاتی ہے، تو پھر یہ افلاس کے زہریلے امتیاز سے بالکل پاک وصاف ہونی چاہیئے۔

حضرات! اس سے زیادہ مہلک بات اور کوئی نہیں ہوگی کہ والدین کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی پر جبر کرکے فائدہ حاصل کریں۔ اور یہ حالت خصوصیت کے ساتھ اُن والدین کی ہوگی جو قلیل جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اگر ان کے ساتھ پورا منصفانہ سلوک بھی کیا جائے گا تب بھی وہ ہمیشہ یہی خیال کریں گے کہ اُنھوں نے تعلیم سے ویسا فائدہ نہیں اٹھایا جیسا دوسروں نے اُٹھایا ہے۔ کسی صورت میں بھی یہ خیال پیدا نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ اگر اس معاملہ میں کوئی حد مقرر کرنی ہے تو پھر سو روپے ماہوار کی حد ہونی چاہیئے میرے خیال میں کسی حد کا مقرر کرنا بربادی بخش ہوگا۔ اگر آپ حد مقرر کرنا چاہتے ہیں تو یہ صرف اس غرض سے ہونی چاہیئے کہ جو صاحب دولت ہیں وہ ابتدائی تعلیم سے مفت فائدہ اٹھانے نہ پائیں لیکن اس بات کا بڑا خیال رکھنا چاہیئے کہ تعلیم کا ٹیکس صرف انھی لوگوں سے وصول کیا جاوے جو حقیقت میں صاحب مقدور ہیں، میں دیہاتی آبادی کی حالت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لئے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حد کی تعین بہت زیادہ آمدنی پر ہوگی تو اس صورت میں اسے ابتدائی تعلیم کے متعلق اطمینان حاصل ہوگا۔ اگر والدین کی آمدنی کی حد میں زیادہ رعایت کی گنجائش نہ رکھی گئی تو ابتدائی تعلیم کا نظام ظلم اور بے چینی کا آلہ بن جائیگا۔ اس لئے آمدنی کی حد مقرر کرنے میں پوری احتیاط کرنی چاہیئے۔

دیسی زبانوں کی حفاظت کا مسئلہ

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن زبانوں کی تعلیم کا مناسب بندوبست کیا جائے جو ہندوستان کی قلیل جماعتوں کی ہیں جن کے ساتھ اس ضروری معاملہ میں منصفانہ اور یکساں سلوک ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک زبان میں تو مفت تعلیم دی جائے اور وہ لوگ جو دوسری زبان بولتے ہوں جاہل اور بے علم رہیں، بہ پھر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ پرائمری تعلیم کا نظام تاوقتیکہ مفت اور جبریہ نہ ہو اس میں آپ کی دیسی زبان کی تعلیم کا انتظام نہ ہو آپ کی قوم کے لئے زیادہ مضر ہوگا۔ اس کے علاوہ اس قسم کا نظام لازمی طور پر ناکام ثابت ہوگا۔ اگر آنریبل مسٹر گوکھلے کے مسودہ کا اصول پاس ہو جائے تو ہندوستان کے کسی اور فرقے کے مقابلہ میں آپ کو زیادہ فائدہ اُٹھانے کا موقع حاصل ہے۔ بشرطیکہ مسودہ میں مناسب ترمیمات کی جائیں۔ میں محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہی اس تحریک کی دلی تائید نہیں کرتا

کہ پرائمری تعلیم مفت اور جبریہ ہونی چاہیئے۔ آپ کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم ہندوستانی ہیں اور میں اس تحریک کی اس دلی یقین کے ساتھ کہ یہ ہندوستان کے لئے سودمند ثابت ہوگی، بحیثیت ایک ہندوستانی اور مسلمان ہونے کے تائید کرتا ہوں۔ (چیرز)

صنعتی اور تجارتی تعلیم

میں نے اکثر صنعتی اور تجارتی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا ہے اور میں نے یونیورسٹی کی نسبت بڑی بڑی امیدوں کو اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔ یونیورسٹی سائنٹفک تعلیم کے ایک بڑے مرکز کی شکل اختیار کر سکتی ہے جس میں اخلاقی تربیت اور انسانی ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔ اگر ہماری قوم کے افراد حقیقی معنوں میں سائنٹفک تعلیم حاصل کریں تو ہماری قوم کے صنعتی اور اقتصادی مستقبل پر سے شک کا پردہ اُٹھ جائے گا۔

انحصار قربانی پر ہے

لیکن ان تمام باتوں کا انحصار ہماری قربانیوں پر ہے جو اس وقت ہم کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بارہ میں جاپان سے سبق لینا چاہیئے۔ اگر ہم ایثار نفس میں وہی روش اختیار کریں جو جاپان نے اپنی ترقی کے لئے اختیار کی تھی۔ یا اس قربانی کی تقلید کریں جس کی مثال اہل پرشیا (جرمنی) نے جینا کے بعد اس وقت قائم کی جب کہ وہ ذلت کے انتہائی درجہ کو پہنچ گئے تھے، تو ہمیں یقینی طور پر اپنی قوم کے اُبھرنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسی قسم کی قربانیوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے جیسی اُن مہذب اقوام کی ہیں۔ جو روپیہ، وقت دماغ، بلکہ بہت سے دلی جذبات کی عظیم الشان قربانیاں کرتی رہتی ہیں۔ اگر ہم اپنے خیال اور آرزو کی منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمیں جہد للبقا اور قومی ترقی کی خاطر بہت سی قربانیاں کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ (چیرز)

مارکوئیس کمودا آن یہانی نے جو جاپانی مدبرین اعظم میں سے تھے، مجھ سے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ جاپان کا ہر ایک فرد اپنی ترقی کے زمانہ میں سنہ ۱۸۶۱ء سے لے کر سنہ ۱۸۹۰ء تک ہر ایک شکل میں اپنی کل آمدنی کا ایک تہائی حصہ یعنی (۳۰) فی صدی سے زیادہ قومی کاموں اور قومی زندگی کی سرسبزی اور تحریکوں میں ادا کرتا تھا جس کا یہ نتیجہ ہے کہ جاپان اب وہ جاپان ہے جو دنیا کے سامنے اپنی مثال آپ ہے۔

حضرات! وہ کیا ایثار علی النفس تھا جو صحابہ رسول اللہ صلعم نے اپنی ذات پر کیا؟ اور وہ کیا ایثار اور قربانی کی مثالیں تھیں جو حضرت فاروق اعظم علیہ السلام کی خلافت کے بعد تک ظاہر ہوتی رہیں ہم سب نہایت فخر سے اندلس، بغداد کے شان دار کارناموں کو یاد کرتے ہیں۔ ہم کو ایثار اور قربانی کی اُس روح کو اور اُس جوش کو ہرگز نظر انداز نہ کر دینا چاہیئے جس کی بدولت پہلی صدی کے مسلمانوں کو تاریخ میں بقائے دوام حاصل ہوئی۔ ہم کو ان زندہ جاوید مثالوں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اور اسلام کی



نواب عماد الملک مولوی سید حسن بلگرامی بہادر

اس شان وشکوہ کے نور کو جو اب ماندہ پڑتا جاتا ہے برقرار رکھنے اور اس میں جلا اور روشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا چاہیئے۔ میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر ہم نے اپنے دولت، اپنی آمدنی، اپنے وقت، اور اپنے جوش اور خیالات کی ضروری قربانی نہ کی تو وہ دن دور نہیں ہے جب کہ ہم کو نہایت شرمناک اور ناقابل علاج ناکامی اور تباہی کا سامنا ہوگا۔

اے میرے ہم قوم دوستو! کیا اب آپ اس قربانی اور ایثار کے لئے تیار نہیں ہیں؟ اس لئے اب آپ کے الفاظ پر نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کے کام اور کوشش پر اسلام کے مستقبل کا دارومدار ہے!!

ترجمہ پریسیڈنشل ایڈریس

عالی جناب نواب عماد الدولہ عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی

علی یار خاں بہادر موتمن جنگ بہادر، سی آئی ای

حضرات! میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر آج میں آپ کے روبرو اپنی ناچیز تقریر کچھ ذاتی واقعات سے شروع کروں۔ میں حال میں علی گڑھ اس نیت سے آیا تھا کہ دہلی جانے سے قبل کچھ آرام کروں مجھے امید تھی کہ میں کانفرنس کے اجلاسوں کے مباحثہ میں حصہ لئے بغیر کچھ امداد کر سکوں گا اور ان تقریروں اور بحثوں سے مستفید ہو سکوں گا جو آپ لوگوں کی کارروائیوں میں عمل حصہ لینگی۔ آپ میری اُس حیرت و استعجاب کا اندازہ کر سکتے ہیں جب میرے بعض محترم احباب نے مجھ سے اصرار کیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں ممتاز لوگوں کی جگہ لوں اور اس کانفرنس کی صدارت کی ذمہ داری کو قبول کروں۔

حضرات! آپ یقین کیجئے کہ ان اعلیٰ ترقوتوں کے مقابلہ میں میں بالکل مجبور ہو گیا اور میرے لئے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔ مجھے ہتھیار رکھ دینے پڑے اور اس وقت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور اپنا ایڈریس جیسا کچھ ہے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ صاف بات یہ ہے کہ میں آپ کے ممتاز لوگوں کی جگہ لینے کے لئے موجود نہ ہوں۔ صرف اس امید پر کہ آپ اپنی معمولی مہربانی سے میرے ساتھ سلوک کریں گے۔ یہ ضرور ہے کہ میری طرح آپ بھی ہم سب کے عظیم الشان لیڈر ہز ہائینس آغا خاں کی عدم شرکت کو محسوس کرتے ہیں

آپ جانتے ہیں کہ ان کی ذات سے ہمیں کیسی تقویت ہے اور ہماری قومی بہبودی کے جملہ امور میں وہ ہماری کس قدر امداد کرتے ہیں۔

جب حالت یہ ہے تو آپ نے جو برا سودا کرلیا ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے گا آپ کو اسی سے اپنا کام نکالنا پڑے گا۔

حضرات! آج ہم یہاں ایک عظیم الشان موقع پر جمع ہوئے ہیں۔ جو عظمت و برکت کے لحاظ سے دوسو سال کے اندر ہماری قومی تاریخ کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔ ایک ہی دور وزیں ہمارا محبوب بادشاہ معہ اپنی بادشاہ بیگم کے ہمارے درمیان ہوگا۔ اس کو اپنے ہندوستانی رعایا کے ساتھ جو انس ہے اُس کا وہ عملی ثبوت دے رہے ہیں وہ اپنی پہلی سیاحت سے کینیڈا کو عزت بخش سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جنوبی افریقہ میں رونق افروز ہوتے۔ ان ممالک میں بھی ان کا خیر مقدم نہایت گرم جوشی کے ساتھ ہوتا اور وہاں وہ خود اپنی قوموں کے درمیان ہوتے۔ لیکن اُنھوں نے ازراہ الطاف بیکراں اول یہاں تشریف لانا پسند فرمایا اس کے بعد وہ اپنے وسیع قلمرو ماورائے بحر میں جہاں قدم رنجہ فرمائیں فرمائیں۔ اُنھوں نے اس پہلی عزت کے لئے ہمیں اس وجہ سے انتخاب کیا کہ ہندوستان ان کے تاج کا سب سے زیادہ تابناک ہیرا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کی وفاداری ایسی بے لوث مخلصانہ ہے کہ دلوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے نہ کسی شرط و معاہدہ کی بنا پر ہے نہ اُس میں قومیت یا مذہب کا رنگ شامل ہے یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ان کی فطرت میں مرکوز ہے۔ نہ وہ کسی کی نقل ہے اور نہ محض جھوٹے جذبات کے اثر سے ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ شاہانہ الطاف جو اس قسم کے خطرات سے خالی تھا جیسے کہ ہمارے مشہور شاعر نے بیان کیا ہے کہ ؎

بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت برکنار است

خود ہز امپیریل مجسٹی کی تجربہ سے تھا اور جو نتیجہ تھا اُس محبت اور ہمدردی کا جو ملک معظم کو اپنے ہندوستانی رعایا کے ساتھ ہے۔ آپ یقیناً دہلی میں بلا شبہ اُن کی تاج پوشی کی رسم کو دیکھیں گے اور محسوس کریں گے جہاں زمانہ ماضی میں ہمارے اپنے حکمران تاج پوش ہوئے ہیں۔ لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اس قدر قوت اور ثروت رکھتا ہو جو دراغۂ ہمارے ملک معظم کو حاصل ہوا ہے یا جس کے تاج کے گرد صداقت کا ایسا نورانی ہالہ ہو۔

حضرات! آج ہم یہاں اس عظیم الشان کانفرنس کی پچیسویں سال گرہ منانے کے لئے جمع ہوئے

ہیں جس کو اُس دانش مند اور دوبین مدبر اور مصلح سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے قایم کیا تھا جس کی عمر بھر کی جان کاہیوں نے سات کروڑ مسلمانان ہند میں ایک نئی روح اور ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے اور بالفاظ دیگر ہم آج یہاں اُس کام کے چلانے کے لئے جمع ہوتے ہیں جس کی بنیاد اُس مرحوم نے ڈالی تھی اور جس کو اُس کے پیروؤں نے اس کی رحلت کے بعد سے سال بسال ایک ایسے جوش اور سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا ہے جو اس زبردست قوت کی دلیل ہے جو اس تحریک میں مرحوم نے پیدا کر دی تھی۔

اس عرصہ میں جو کچھ کانفرنس کے مقاصد میں کامیابی ہوئی ہے اس کا حال مطبوعہ رپورٹوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔ مجھ کو اس کے متعلق یہاں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب توقعات پوری طرح بر نہیں آتے تو نیک دل اشخاص ہمیشہ شکایت کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کانفرنس کے لیڈر اور منتظمین بھی ہمیشہ حرف شکایت زبان پر لاتے رہتے ہیں۔ لیکن ذرا نظر اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو جائیگا کہ اسی کانفرنس کی بدولت اسلامی ہندوستان میں کس قدر انقلاب وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کانفرنس نے ہماری قوم کے سوائے دیگر اقوام کی کوششوں میں ایک نمایاں تحریک پیدا کی ہے۔ جس وقت تک کہ اس کانفرنس کے لیڈروں نے صوبہ سندھ میں کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے منعقد کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، کیا اُس وقت صوبہ سندھ پر ایک بے حسی کا عالم طاری نہ تھا؟ کیا اسی کانفرنس کے مساعی جمیلہ سے مشرقی بنگال اور برہما اُس خواب گراں سے جو بظاہر لاانتہا معلوم ہوتا تھا، بیدار نہیں ہوئے؟ مدراس، بمبئی اور سنٹرل انڈیا کے مسلمان یکے بادیگرے سب کے سب اس سے فیض حاصل کر چکے ہیں اور متاثر ہو چکے ہیں اور اُن دونوں صوبوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جن کو اس تحریک کے جائے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے یا نہیں تاہم میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میری رائے میں مسلم لیگ جو اس وقت اُس شعبہ کے متعلق جس کا اس کانفرنس سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا ہے، بہت اچھا کام سرانجام دے رہی ہے۔ اسی تحریک کے نتائج میں سے ہے اور بالآخر میں اتنا اور عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ یہ زیادہ تر اسی کانفرنس کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا خیال جو مدرستہ العلوم کے قایم ہونے کے وقت ہی سے پیشوایان قوم کے دلوں میں آرزوئے دیرینہ کی مانند جاگزیں تھا۔ اب عملی صورت میں نمودار ہو گیا ہے حتیٰ کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک تمام مسلمانان ہند کی قومی آرزوؤں اور خواہشوں میں سب سے بڑی یہی خواہش اور آرزو ہے۔

اس کانفرنس اور لیگ کی بدولت ہمارے ہم مذہب برادران ہند کا رشتہ اتحاد و اتفاق

روز بروز زیادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے اور یہ اتحاد جس کی بنا مذہبی یگانگت اور ملکی اور تعلیمی ضروریات کی یک رنگی اور ہم آہنگی پر ہے۔ اس احساس سے اور بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوگیا ہے کہ اس دنیا میں ہماری آئندہ ترقی اور بہبود کا انحصار کلیتاً حضرت ملک المعظم کی سلطنت کے بقا اور سرسبزی پر ہے۔

ہم مسلمان اس امر کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ اگر ہماری موجودہ نسل کو عقل سے بہرہ وافر ہے۔ اور اگر ہم کو آئندہ نسلوں کی بہبودی اس وسیع مملکت میں مدنظر ہے تو ہم کو ہر حالت میں چاہے کوئی بُرا کہے یا بھلا سلطنت برطانیہ کی حمایت کرنی چاہیئے اور اگر کوئی وقت آن پڑے تو اپنی جانوں سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ اور اس خیال کو اپنے دماغ میں بھی نہ آنے دینا چاہیئے کہ کسی دوسری سلطنت کی ماتحتی میں ہم کو کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ پس ایسی حالت میں اُس امن اور انتظام کی حفاظت کے لئے جس کے سایہ میں ہم رہتے ہیں اور نشو و نما پاتے ہیں ہم کو ہمیشہ ایک باقاعدہ فوج کی مانند تیار رہنا چاہیئے اور جب کبھی اس میں کسی طرف سے خلل پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو تو ہم کو گورنمنٹ کے دشمنوں کے مقابلہ میں گورنمنٹ کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ لیکن میں آپ کو ہرگز یہ رائے نہیں دونگا کہ گورنمنٹ کے انتظام میں جو کچھ نقائص ہوں اُن کی طرف سے آپ دیدہ و دانستہ چشم پوشی کریں اور مثل ریاکار اور منافقین کے ہر سرکاری کارروائی کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوں۔ ایسا طرز عمل اصلی معنوں میں وفاداری نہیں ہے بلکہ بزدلی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی جماعتوں کے کام عیوب اور نقائص سے خالی نہیں ہو سکتے اور خود ترقی کا ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس قسم کی توقعات لغو و فضول ہیں۔ لہذا بحیثیت ایک ایمان دار اور وفادار رعایا ہونے کے یہ ہمارا نہایت ضروری اور اہم فرض ہے کہ اپنی شکایتوں اور تکالیف پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اپنی شکایتوں کا اظہار ایک ایسے طرز عمل کے ساتھ کریں جو ہمدردانہ ہو اور جو ایک غیور اور شجیع رعایا کے شایانِ شان ہو اور نہ ایسا جس سے بوئے منافرت اور مخاصمت آتی ہو۔ میں اس بات پر زیادہ زور اس لئے دیتا ہوں کہ ہماری آئندہ بہبودی کا دارومدار اور انحصار اس پر ہے۔ ہم کو اپنے اُن حقوق کا صحیح احساس ہو جو ہم کو اس سلطنت کے آزاد رعایا ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں اور اُن فرائض کو بھی پہنچانیں جو ہم پر اُس گورنمنٹ کی طرف سے عائد ہیں جو ہم پر حکمراں ہے۔

حضرات! کانفرنس کے اغراض و مقاصد کا آج اس وقت بیان کرنا بالکل لاحاصل ہے کیونکہ اس بحث پر پہلی کانفرنس کے پریسیڈنشل ایڈریسوں میں بارہا بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور گزشتہ اجلاسوں کی مطبوعہ رپورٹوں سے اس کام کی کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں جو اب تک ہو چکا ہے اور اس سال جو کچھ ہوا ہے اور جو ہونے کو باقی ہے اس کے متعلق ہمارے قابل سکرٹری صاحبان آپ کو مطلع کریں گے۔ صرف

ایک آدھ امر ایسی اہمیت رکھتا ہے کہ جس کی بابت بحیثیت صدر جلسہ ہونے کے میں آپ کی توجہ منعطف کرانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک ابتدائی تعلیم کا سوال ہے۔ اس کے متعلق نج کی کوششوں سے بھی تھوڑا بہت کام لیا گیا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ میری ناچیز رائے میں یہ ایک سخت غلطی ہوگی اگر ابتدائی تعلیم کو اپنے ہاتھوں سے کلیتہً نکال کر گورنمنٹ کے ہاتھ میں جانے دیں گے۔ مجھ کو اس بات کے جتلانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق کافی اور موزوں انتظام نہ کیا گیا تو ہر طبقہ کے مسلمان بچوں کی تعلیم میں رکاوٹیں اور مشکلات حائل ہو جائیں گی۔ ہم کو ایسے مدارس کی ضرورت ہے جو ہمارے بچوں کی مخصوص ضروریات کو نظر انداز نہ کر سکیں اور اس قسم کے مدرسے ایک حد تک ہماری ہی نگرانی میں رہیں، اگر ابتدائی تعلیم سے غفلت کی گئی تو سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے لئے (جس کی طرف اس وقت تک تقریباً آپ کی پوری توجہ محدود و مصروف رہی ہے) طالب علم کہاں سے آئیں گے۔ میں یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس کانفرنس کے کام کرنے والے ممبروں کو ہر چھوٹے بڑے شہر کے مسلمانوں کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے پرائیویٹ مدرسوں کے جاری کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے اپنی کوششوں کو اور زیادہ تیز کرنا چاہئے۔ پرائیوٹ اسکول کھولنے کی لاگت زیادہ نہیں ہوگی اور بہر حالت میں یہ بار اس بار سے کم ہوگا جو ابتدائی تعلیم کو ترقی دینے کی غرض سے ایک ٹیکس کی صورت میں ان پر پڑیگا۔ اور باوجود اس کے پھر بھی اس کا امکان ہے کہ اس طرح سے جو مدرسے وجود میں لائے جائیں وہ مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوں۔ میں اسی ذیل میں مفت اور جبری تعلیم کی اس تجویز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت گورنمنٹ کے سامنے پیش ہے۔ ابتدائی تعلیم کے مفت اور لازمی ہونے سے قبل یہ بات لازم آتی ہے کہ عمدہ ٹرینڈ اُستادوں کی، جو کافی تنخواہ پاتے ہوں، ایک بہت بڑی جماعت پہلے سے موجود ہو۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کام کے لئے ۲۴ کروڑ سے ۳۰ کروڑ روپیہ سالانہ کی ضرورت ہے، اور علاوہ اس کے تقریباً اسی کروڑ روپیہ کی ایک دم سے ضرورت ہے تاکہ عمارات وغیرہ طیار کی جاویں۔ اس رقم کو ہم پہونچانے کے لئے ایک تازہ ٹکس کی ضرورت ہے۔ بعد ازیں "ورناکلر" کی تفریق کا مسئلہ پیش آئے گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہب کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جائیگا اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے مسلمان بچوں کو سخت مشکلات کا سامنا ہوگا کیوں کہ نہ تو وہ اُردو چھوڑ سکتے ہیں۔ اور نہ مذہبی تعلیم سے دست بردار ہو سکتے ہیں جن لوگوں کو دیہاتی مدرسوں سے کام پڑا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ "جبر" جو بذات خود ایک بہت بھاری بوجھ ہے۔ گاؤں والوں کے لئے خصوصیت

کے ساتھ بھاری ثابت ہوگا۔ علاوہ اس کے والدین کی یہ کوشش کہ ٹکس سے بچ جائیں سخت حیراتی اور تشدد کے ظہور میں آنے کا موجب ہوگی۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ہم "مفت اور جبری تعلیم" کے شاندار نام سے دھوکا کھائیں۔ ہم کو چاہئے کہ اوّل ان بچوں کو تعلیم دیں جن کو ابتدائی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اور جن کے متعلق ہم یہ کام بغیر کسی جبر اور ٹکس کے انجام دے سکتے ہیں۔ یورپ کے کسی ملک میں بھی جہاں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی کردی گئی ہے۔ یہ کام اُس وقت سے پہلے شروع نہیں ہوا جب تک کہ اس ملک میں تعلیم نے پوری پوری ترقی نہ کرلی ہو اور جب کہ صرف ایک ہی حصہ ایسا رہ گیا ہو کہ جس پر ذاتی کوششوں کا اثر نہ پڑا ہو۔ ہم ابھی تک اس منزل سے بہت دور ہیں۔ اس لئے ہم کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیئے جب تک کہ ہم ترقی کی اس بڑی منزل تک نہ پہونچ جائیں اور اس عرصہ میں ہم کو ان کاموں کے متعلق جو ہمارے بس کے ہیں اپنی کوششوں میں اضافہ کرنا چاہیئے۔

اس وقت ہمارے تمام خیالات بادشاہ سلامت کی آمد آمد کی طرف لگے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے جو کچھ ہم بچا سکتے ہیں وہ اس چیز کی طرف متوجہ ہیں جس کے متعلق میں اس وقت چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال اس وقت مسلم یونیورسٹی کی طرف ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بادشاہ سلامت کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک شاندار یادگار قائم کرنا ہمارا نہایت ضروری فرض ہے اور اس سے زیادہ کیا شاندار یادگار ہوسکتی ہے کہ ہم آکسفورڈ یا کیمبرج کے نمونے پر ایک قومی یونیورسٹی قائم کریں، جس کی بدولت ہم تھوڑے زمانے میں اس قابل ہو جائیں کہ ہم کو اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے دور دراز ملکوں میں بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس بڑے کام کو انجام دینے کے لئے سب مصالحہ طیار ہے۔ صرف اتنی کسر ہے کہ کچھ آپ بھی مدد کر کے اس کی کامیابی کو یقین کے درجے تک پہونچاویں جہاں دس پانچ لاکھ روپئے اور ہوئے اور بس یہ کام بھی پورا ہوا۔ یہ سچ ہے کہ کام شروع کرنے کے لئے ہم نے کافی روپیہ جمع کر لیا ہے، لیکن اس قسم کے کاموں میں عقلمندی اسی کا نام ہے کہ محض اتنے ہی پر قناعت نہ کرنی چاہیئے جتنا کہ کافی معلوم ہو۔ ہز ہائینس آغا خاں آپ کو پہلے ہی اطلاع دے چکے ہیں کہ پوری رقم کتنی ہونی چاہیئے۔ ان کا اندازہ ہے کہ جب ایک کروڑ روپیہ جمع ہو جائے تو ہم کو اپنی کشکول ہاتھ سے رکھ دینی چاہیئے۔ ہمارے پاس اس وقت اس رقم کا صرف چوتھائی حصہ آیا ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ اے معزز حاضرین! قومی عزت بچانے کے لئے آپ کیا کرتے ہیں؟ جو کچھ آپ دے سکتے ہیں دلوائیے مگر خدا کے واسطے کوئی صاحب اتنی بڑی رقم کا وعدہ نہ فرمادیں جس کی ادائیگی میں وقت کے صرف ہونے کا احتمال ہو۔ یہ نمائش آمیز فیاضی کا وقت نہیں ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے

کہ جو کچھ آپ دیں گے وہ سود در سود منافع کے ساتھ آپ ہی کی جیبوں میں واپس آ جائے گا۔ اگر اسی نسل میں نہ آیا تو آئندہ نسل میں آ جائے گا۔ آپ یہ روپیہ اپنے لئے اور بچوں کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو کچھ آپ کو دینا ہے دیجئے۔ مگر جلد دیجئے تاکہ اس عالی شان مہم کے بانی روپیہ گن سکیں اور دنیا کو دکھلا سکیں۔ ہمارے ہاں ایک روایت چلی آتی ہے اور ہمارے پیارے نبی صلعم کا یہ ارشاد گہر بار رہا ہے کہ "جو کچھ دینا ہے اس طرح دو گویا کل کے دن مرنا ہے، اور جو کچھ علم حاصل کرنا ہے اس طرح حاصل کرو گویا ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔" اے میرے دوستو! دینے میں دیر مت کرو۔ خدا جانے "ہماری آخری ساعت کس وقت آ گھڑی ہو اور اپنے ہم مذہب بھائیوں کو دوامی فائدہ پہونچانے کا وقت ہاتھ سے نکل جائے ؎

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

ہماری یونیورسٹی کے متعلق، جو اب قایم ہونے والی ہے، میں اس وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا مجھ سے زیادہ قابل لوگوں کی تحریروں اور تقریروں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس تجویز کی بنیاد کن خیالات پر رکھی گئی ہے۔ جو کچھ میری رائے ہے میں آج سے برسوں پیشتر آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں اور قدرے ردّو بدل کے ساتھ آج بھی میری وہی رائے ہے۔ ہماری یونیورسٹی کی مجوزہ اسکیم میں ایک خاص عنصر یہ ہے کہ یونیورسٹی کو آکسفورڈ یا کیمبرج کے نمونے پر ڈھالا جائے۔ یہ یونیورسٹی ایک درس گاہ ہو گی اور چال چلن کے متعلق تربیت دینا اس کا خاص مقصد ہو گا۔ اعلیٰ درجہ کی دنیاوی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی اور مذہبی تعلیم بھی دی جائے گی۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر آپ کے سامنے اُن پرجوش الفاظ کو دہرا دوں جو نو برس پہلے کانفرنس کے اجلاس میں جو اسی شہر میں منعقد ہوا تھا، بہترین مدبر اور برطانیہ کی کیبنٹ کے وزیر کی زبان سے نکلے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ انگلستان میں دو یونیورسٹیاں ہیں ایک آکسفورڈ اور دوسری کیمبرج۔ ان دونوں کی بنیاد فیاض اور مذہبی لوگوں نے ڈالی تھی۔ ان کا گورنمنٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ان کی روایات میں کسی اور کا دخل نہیں ہے۔ ہندوستان میں بھی اسی بات کی ضرورت ہے۔ آپ کو ایسی یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے جو اپنا انتظام خود کرے اور جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اگر آپ اس کام کو پورا کرنے کی کوشش کریں تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کی یونیورسٹیاں تعلیم اور تربیت میں انگلستان کی یونیورسٹیوں سے برابری اور ہمسری نہ کرنے لگیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انگلستان کی یونیورسٹیوں سے نمبر لے جائیں

جیساکہ مسلمانوں کی یونیورسٹیاں ایک زمانہ میں کرکے دکھا چکی ہیں۔ میں آپ سے اور آپ کی آرزوؤں سے پوری ہمدردی کرتا ہوں۔ مجھ کو پوری امید ہے کہ آپ جلد ایک ایسی یونیورسٹی قایم کرلیں گے۔ جو درحقیقت ایک یونیورسٹی کے نام کے شایاں ہوگی۔ اس یونیورسٹی میں صرف امتحان ہی نہیں لئے جائیں گے بلکہ مجھ کو پوری امید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں آپ ایک ایسی یونیورسٹی قایم کرسکیں گے جو حقیقت میں یونیورسٹی کہلائے جانے کے قابل ہو۔ محض امتحان لینا اس کا کام نہیں ہوگا بلکہ اس میں مذہبی تعلیم کا انتظام و انصرام ہوگا، اور وہاں درستی اخلاق کا بھی سبق ملے گا۔ اور یہ یونیورسٹی اس وسیع سلطنت میں اشاعت علوم کا ایک آلہ ثابت ہوگی۔ اے معزز حاضرین! میں آکسفورڈ جیسے مہتم بالشان دارالعلوم کا نام لے کر دست بدعا ہوں کہ آپ اپنی کوششوں میں فائز المرام ہوں۔"

حضرات! جس وقت وہ زمانہ آئے گا کہ جب ہم اپنی علحدہ یونیورسٹی قایم کرسکیں گے اور جب ہماری یہ دیرینہ آرزو پوری ہوجائے گی تو مجھ کو امید ہے کہ آپ مذکورہ بالا الفاظ کو فراموش نہ کرینگے جس وقت وہ زمانہ آئے گا (اور مجھ کو پورا یقین ہے کہ وہ زمانہ جلد آئے گا) اس وقت ہمارے لئے یہ مناسب ہوگا کہ ہمارا نقطہ نظر بلند رہے اور ہم دنیا کو دکھلا دیں کہ جس طرح ایک زمانہ میں ہمارے آبا و اجداد نے قرطبہ اور بغداد کو سراج الہدایت بنا رکھا تھا جس کی منور شعاعیں چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھیں اسی طرح ہم بھی اپنی باری میں اس چراغ کو از سر نو روشن کرنے کے لئے اور اپنے آبا و اجداد کی گزشتہ شان و شوکت کو زندہ کرنے کے لئے کمربستہ حاضر ہیں۔

کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے جو تجویز طیار کی ہے اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ ان کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے۔ اس ایڈریس میں، جو بالکل سرسری ہے میں صرف ان دو باتوں کا ذکر کروں گا جو بہت زیادہ ضروری ہیں۔ پہلا سوال "تقرر" کے متعلق ہے۔ میری ناچیز رائے میں مختلف شعبوں کے لئے قابل آدمیوں کا انتخاب اُن ذی فہم اصحاب کے ہاتھوں میں رہنا چاہیئے جو انگلستان میں رہتے ہیں اور دائرۂ انتخاب اُن آدمیوں تک محدود رہنا چاہیئے جو علم کی ان شاخوں کے متعلق جن کے لئے ان کا انتخاب کئے جانے کی ضرورت واقع ہو۔ کچھ شہرت حاصل کرچکے ہوں قبل اس کے کہ اس کا انتخاب واقعی طور پر عمل میں آئے۔ پروفیسروں کو اٹکل پچّو یا کسی ذاتی مفاد کی بنیاد پر منتخب کرنے سے یونیورسٹی کے نام پر حرف آئے گا۔ اور یہ بات اس کے مقاصد کے حق میں مہلک ثابت ہوگی۔

دوسرا سوال "ایفیلی ایشن (الحاق) کے متعلق ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کیمبرج اور آکسفورڈ میں جو ہماری یونیورسٹی کے لئے منتخب نمونہ ہیں، تمام کالج ایک مقامی مرکز کے تحت میں ہوتے ہیں۔ اور

اس مرکز کا ان کالجوں سے براہ راست تعلق ہوتا ہے اگر آپ مذکورہ بالا اصول سے بال برابر بھی اختلاف کر جائیں تو آپ کے ہاتھوں سے وہ چیز جاتی رہے گی جو اس یونیورسٹی کے لئے مابہ الامتیاز ہے اور اس کی عدم موجودگی میں ہمارا وہ منشا ہی فوت ہوا جاتا ہے جس کے لئے ہم کو علیحدہ یونیورسٹی کی ضرورت ہے اگر مسلمانوں کی موجودہ مخصوص حالت اور ان کی سکونت کی وسعت کی وجہ سے اس اصول میں کسی قسم کا تغیّر و تبدّل لازمی ثابت ہو جائے تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس صورت میں ایسے قواعد کا منضبط ہو جانا نہایت ضروری ہے جن کی رو سے ان دوسرے کالجوں کو شرکت کا حق اور اختیار حاصل نہ ہو سکے جن میں وہ انتظام جو علی گڑھ میں ہے موجود نہ ہو ایسے اسکولوں پر جو اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ان کے طلباء علی گڑھ کالج میں داخل ہو سکا کریں ہم کو کسی نہ کسی قسم کی نگرانی رکھنی چاہیئے۔

علی گڑھ کا نام آجانے سے مجھے ایک اور بات یاد آگئی جس کا یونیورسٹی کے انتظام سے گہرا تعلق ہے۔ میرے خیال میں اس وقت علی گڑھ کالج میں چھ سَو طالب علم ہیں۔ اس بات کے کہنے کی مجھ کو ضرورت نہیں ہے کہ اتنی بڑی تعداد سے انتظام میں دقت ہوا کرتی ہے اور اس سے پڑھائی کے انتظام میں بھی خلل واقع ہوتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں جتنا وقت ایک پروفیسر کو لیکچر کے لئے دیا جاتا ہے اس میں ایک اُستاد کم سے کم پچاس لڑکوں کا انتظام کر سکتا ہے۔ اس ملک میں کالج کی چھوٹی جماعتوں کے طالب علموں کے متعلق وہی انتظام مناسب معلوم ہوتا ہے جو اسکول کی جماعتوں کے متعلق کیا جاتا ہے۔ اور اگر مقصد یہ ہے کہ محض رٹائی سے کام نہ لیا جائے تو اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اُستاد ذاتی توجہ کو پوری طرح سے کام میں لائیں۔ اگر آپ کافی سرمایہ بہم پہونچانے میں ناکامیاب نہ ہوئے تو خوش قسمتی سے علی گڑھ کالج کی اس وقت ایسی حالت ہے درستی انتظام کے خیال سے اگر اس کالج کے تین حصّے نہیں ہو سکتے تو دو حصّے کر دینے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوگی اس کام میں زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔ ساری دقت روپیہ کی ہے۔

یونیورسٹی کے متعلّق جو کچھ مجھ کو کہنا تھا۔ میں کہہ چکا مجھ کو اجازت دیجئے کہ ایک ایسے مسئلہ پر کچھ عرض کروں جو اہمیت میں مضمون مذکورہ بالا سے کچھ کم نہیں ہے جس بات کی طرف میرا اشارہ ہے وہ بات روشن خیال مسلمانوں کے دل سے لگی ہوئی ہے، میرا مطلب تعلیم نسواں سے ہے تعلیم نسواں کے متعلق جو عملی مشکلات ہمارے راستہ میں حائل ہیں ان کا میں ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اے حضرات دنیا میں ایسی کوئی مشکل نہیں ہے جو ہمت اور متحدہ کوشش کے سامنے سر نہ جھکا دے۔ میں فرض

کئے لیتا ہوں کہ بڑے شہروں میں لڑکیوں کے لئے معمولی مدرسوں کی بنیاد ڈال دینا مشکل نہیں ہے۔ مگر مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ اپنی لڑکیوں کی ایسے مدرسوں میں جو اُن کے پڑوس سے دور ہوں آمدورفت شروع ہونے سے قبل والدین کو اس بات کی ضرورت ہوگی کہ وہ اس پر خوب اچھی طرح غور کرلیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ اس بات کو جلد قبول کرلیں گے کہ اپنی لڑکیوں کو کسی ایسے بورڈنگ ہاؤس میں بھیجدیں جہاں رہنے سہنے کا، پردے کا اور ذاتی نگرانی کا قابل اعتماد انتظام موجود ہو۔ ایسی صورت میں مشورۃً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم ہر مقام کے لئے دو چار اُستانیاں تیار کردیں اور یہ اُستانیاں گھروں پر جاکر مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دیا کریں تعلیم کا وقت حالات کے مطابق زیادہ یا کم مقرر کیا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ کا (زنانہ) اسکول بہت جلد ایسی اُستانیاں طیار کردے گا اور یہ اُستانیاں اپنے کام میں ایسی ہوشیار ہونگی کہ اس زمانہ میں ہم کو نہیں مل سکتیں۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کام کے لئے مشنری لیڈیاں ملازم رکھی جائیں چاہے وہ کتنی ہی قابل ہوں۔ مگر ان کے مذہبی جوش سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے گھروں سے محبت رخصت ہوجائے اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوجائیں۔

اس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم چاہے کچھ ہی تدبیر اختیار کریں مگر اے حضرات! ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک ہم اس مسئلہ کو حل نہ کرسکیں گے ہم صحیح معنوں میں کوئی ترقی نہ کرسکیں گے۔ ہماری حالت رو باصلاح نہ ہوسکے گی اور ہماری قوم کو اخلاق کے متعلق کوئی دامی اور مستقل فروغ نہ حاصل ہوسکے گا۔ اگر ہم اپنے فرض کے اس حصہ سے غفلت کریں گے تو دوسرے کاموں کے متعلق ہماری کوششیں یا تو بے سود ثابت ہونگی یا اگر کوئی فائدہ ہوا بھی تو محض برائے نام۔ مجھ کو ایک زمانہ میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم سے کام پڑا ہے اور مجھ کو ہمیشہ یہی نتیجہ نکالنا پڑا کہ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیاں زیادہ تربیت پذیر ہوتی ہیں اور مجموعی حیثیت سے مقابلۃً زیادہ زود فہم اور محنت شعار ہوتی ہیں اور اپنے استادوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا اور کام کو عمدہ طریقہ سے انجام دینے کا لڑکیوں کو زیادہ شوق ہوتا ہے۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ایسا عمدہ سرمایہ اور یوں برباد ہوجائے!!۔

اب صرف ایک بات اور رہ گئی ہے جس کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرلینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے لڑکوں میں سے تین کو انگلستان میں تعلیم دلوائی ہے۔ علاوہ اس کے مجھ کو ان لڑکوں کا بھی انتخاب کرنا پڑا ہے جو سرکاری وظیفہ لے کر انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں

تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ میں نے انگلستان میں اپنے دو سالہ قیام کے زمانہ میں ان سیکڑوں طالب علموں کی حالت پر غور کیا ہے جو سالانہ اس ملک میں جاتے ہیں اور میں اپنے تجربہ کو جا ہے وہ کسی قابل نہ ہو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر ہندوستانی والدین کو عموماً اور مسلمان والدین کو خصوصاً یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ لڑکوں کو غیر ممالک میں بھیجنا مناسب نہیں۔ سوائے اس کے کہ جب کسی خاص علم کا حاصل کرنا مدنظر ہو اور ایسا بھی اس وقت کرنا چاہیئے جب اس ملک میں لڑکے نے اپنی تعلیم ختم کر لی ہو تاکہ اپنے وقت کو انگلستان میں فضول باتوں میں برباد کرنے کے بجائے وہ اس کو مفید کاموں میں صرف کر سکے۔ یہ ان کے لئے اور بھی مناسب ہوگا اگر انگلستان بھیجے جانے سے قبل ان کی شادی کر دیجائے۔ اپنے ملک میں ہمارے بچے گھر کی تربیت کے زیر سایہ پلتے ہیں اور والدین کی ان پر نگرانی رہتی ہے۔ علاوہ اس کے ان پر مذہب کا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا عنصر ہے کہ اس کا اثر ہرگز اتنا کمزور نہیں ہوتا ہے جیسا کہ بعض حضرات خیال کئے ہوئے ہیں۔ علاوہ اس کے زبان خلق کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے اور چاہے اس کا حلقۂ اثر وسیع ہو یا محدود مگر اخلاق پر اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ ایک ناتجربہ کار نوجوان نے جس کو دنیا کا اور اس کی نشیب و فراز کا ہنوز کوئی تجربہ نہیں ہوا ہے اور جس کو قدم قدم پر ہزاروں مشکلات بیجا ترغیبوں کا بھیس بدلے ہوئے ملتی ہیں، اگر ایسی حالت میں کہ جب اس کو کوئی کہنے سننے والا نہیں ہوتا راہِ راست سے گمراہ ہو جاتا ہے تو کوئی تعجب کا مقام نہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ بیسیوں پاک صاف واپس آئے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہوا تو ایک آدھ دھبا لگ گیا اور یہ دھبے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کو کیسا خوفناک مرحلہ طے کرنا پڑا ہے۔

اب میں اپنے نوجوانان قوم کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ خلق اور عمدہ برتاؤ ہماری قوم کی پسندیدہ خصوصیات میں سے ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا نے یہ باتیں ہمیں سے سیکھی ہیں۔ لہذا ان چیزوں کو برباد نہ کرنا چاہیئے۔ اس خیال میں نہ پڑنا چاہیئے کہ جس کا نام عمدہ برتاؤ ہے۔ وہ غلامی کا نشان ہے اور یہ کہ جوانی اور آزادی کا ایسی باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھئے کہ خودداری اور خودنمائی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جو اپنی عزت کرتا ہے وہ اوروں کی بھی عزت کرتا ہے۔ واجب التعظیم چیزوں کی عزت کرنے میں ایک خوددار آدمی کو خوشی حاصل ہوتی ہے، اور وہ ایسا نہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے خاص کر ان لوگوں کی عزت کرنا جو عمر یا مرتبے یا علم میں فوقیت رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی عزت کرنے سے اپنی عزت میں بال برابر فرق نہیں آتا۔ ادب کے

قواعد جو ایک زمانہ میں مسلمانوں میں رائج تھے ہماری نہایت بیش بہا ملکیت میں سے تھے کیا بلحاظ آداب معاشرت اور کیا بلحاظ اس خوبصورتی کے جس میں وہ نمودار ہوتے تھے۔ لہذا ہم کو کوشش کرنی چاہیئے کہ جو کچھ ان میں سے قایم رہ سکتا ہے اس کو قایم رکھیں۔ مبادا یہ بھی مثل اور بیش بہا چیزوں کے جو ہم کو میراث میں ملی ہیں برباد نہ ہوجائیں۔

حضرات! اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور اب وقت ہے کہ آپ اُن بہت سی اہم قراردادوں کے متعلق مباحث میں مصروف ہوں جو منتظمین کانفرنس اور دیگر پُرجوش ممبرصاحبان آپ کے سامنے پیش کریں گے اور اگرچہ مجھ کو یہ فخر حاصل نہ ہوسکے کہ میں بھی آپ کے ساتھ ان امور میں اپنا ناچیز حصّہ لے سکوں۔ لیکن آپ کے کاموں کی کامیابی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ دم واپسیں تک میری تمنائیں اور آرزوئیں آپ کے ساتھ ہوں گی۔

اجلاس بست وششم

(منعقدہ لکھنؤ سنہ ۱۹۱۲ء)

صدر عالی جناب میجر سید حسن صاحب بلگرامی ایم ڈی ڈی ایچ پی آئی ایم ایس

حالاتِ صدر

میجر صاحب، نواب عماد الملک اور علامہ سید علی کے چھوٹے بھائی تھے۔

عماد الملک سید حسین، سید علی، اور سید حسن نے قدیم اور مشہور بلگرامی خاندان کی تاریخ میں ایسے چار چاند لگائے اور اس خاندان نے ان جلیل القدر مایۂ ناز ہستیوں کی بدولت دورحاضرہ میں اپنی گزشتہ ناموری اور شہرت کی تجدید اس طور پر کی۔ جو زمانہ دراز تک مایۂ ناز رفتگان کے نقش قدم کا



میجر سید حسن بلگرامی
صدر اجلاس بست و ششم (لکھنٔو سنہ ۱۹۱۱ ع)

پتہ دیتی رہے گی۔ اور جس طرح پر کہ عہد عباسیہ میں برمکی خاندان نے اپنے علمی شغف اور فیاضیوں کی بدولت برامکہ کے خاندان کو شہرت عام کے منظر پر لا کھڑا کر دیا تھا اور سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی ان کی یاد دلوں میں اور ان کی بقاء دوام کے کارنامے تاریخوں میں محفوظ ملتے ہیں اسی طرح پر خاندان بلگرام کی علمی اور اخلاقی زندگی کا چرچا ان فاضلان قوم کی بدولت صدیوں تک زبانوں پر جاری رہے گا۔

میجر سید حسن کی تعلیم و تربیت بھی انھیں علمی و عملی اصولوں پر ہوئی جس طرح پر کہ ان کے دو نامور بڑے بھائیوں عماد الملک اور سید علی کی ہوئی تھی اور انھوں نے عربی فارسی کے علاوہ انگریزی اور مرہٹی زبانوں میں کافی طور سے قابلیت پیدا کر کے فن طب کے اصول جدیدہ پر ڈاکٹری اور سرجری کی تعلیم پا کر نظری اور عملی طریقہ سے کامیابی حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ تک وہ ہندوستان کی انگریزی فوج میں بہ حیثیت میجر ڈاکٹر مامور رہے بعد ازاں وہ اس خدمت سے کنارہ کر کے انگلستان چلے گئے اور یک تحت دس بارہ برس تک انگلستان میں رہے۔ جہاں انھوں نے اپنے پیشۂ ڈاکٹری کی پریکٹس کو جاری رکھ کر اپنی جنرل معلومات میں مطالعہ کتب کے ذریعہ سے گہری واقفیت حاصل کر کے خصوصیت کے ساتھ انگریزی پالٹکس اور مسئلہ تعلیم پر بہت کچھ غور کیا۔ تقریباً ۱۹۱۰ء میں وہ ہندوستان میں واپس آئے۔ اور تھوڑا زمانہ حیدرآباد، لکھنؤ وغیرہ میں قیام کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ کی سکونت کو اپنے واسطے مناسب سمجھ کر علی گڑھ میں اقامت اختیار کر لی۔

جب مسلمانوں کی تعلیم یافتہ جماعت نے ان کو دیکھا اور وہ ان سے ملی اور باہم تبادلۂ خیالات ہو کر تعلقات میں وسعت ہوئی تو اس کو معلوم ہوا کہ ان کی ذات نسبی شرافت کے ساتھ مجموعۂ خوبی ہے۔ وہ متانت، سنجیدگی، پختہ کاری، اصابت رائے کے لحاظ سے فرد فرید تھے وہ آزاد خیال تھے اور ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا وہ جدید تعلیم اور قدیم تربیت کا بہترین نمونہ تھے۔ خودداری اور خاکساری نے ان میں نہایت متانت آمیز وقار کی شان پیدا کر دی تھی اور جن کے دل میں اپنی قوم کی محبت، اس کی ترقی کی دھن کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ان دنوں مسلم لیگ کی نشو و نما کا نیا زمانہ تھا۔ مولوی عزیز مرزا صاحب آنریری سکرٹری لیگ کی بے وقت موت نے ایک ایسے صاحب تدبیر اور مضبوط شخص کی جگہ خالی کی تھی جن کے انتقال سے مسلمانوں کی سیاسی جماعت کو بڑا دھکا لگا تھا۔ ان کی جانشینی کے لئے میجر صاحب کا انتخاب سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کے عہدہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں وہ اجلاس کانفرنس

منعقدہ لکھنؤ کے پریسیڈنٹ بنائے گئے۔ اس زمانہ میں حصول مسلم یونیورسٹی کے لئے قوم میں خاص قسم کا جوش اور ہیجان تھا اور حقوق و اختیارات یونیورسٹی کے بارہ میں قوم اور گورنمنٹ کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ انھوں نے جو خطبہ اس اجلاس میں پڑھا اس میں کافی طور پر مسائل زیر بحث یونیورسٹی پر روشنی ڈالتے ہوئے مسئلہ تعلیم پر جیسی پُر زور بحث کی ہے وہ ان کے مسئلہ تعلیم سے گہری واقفیت کی بہترین سند ہے اس خطبہ کی تعریف میں قیصر باغ کی بارہ دری گونج اٹھی تھی اور جس کا ذکر ان دنوں ہر تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم کی زبان پر تھا۔

وہ نمود و نمایش کے آدمی نہ تھے اصول اور قاعدہ کی زندگی نے قومی خدمت اور جوش کے ولولے نے ان کو حقیقی معنوں میں جنٹلمین ثابت کر دیا تھا۔ مالی حیثیت کے لحاظ سے وہ ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے اور کچھ ایسی لمبی چوڑی آمدنی نہ رکھتے تھے۔ لیکن کیرکٹر کی مضبوطی خیالات کی پختگی نے ان کی لائف کو بارعب اور باوقار بنا دیا تھا۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں جس میں ہمیشہ انھوں نے تجرد کی زندگی کمال ضبط نفس کے ساتھ بسر کی اس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز ان کے اصول حیات کے ضابطہ کا پتہ دیتی تھی اور اس کا چھوٹا سا کتب خانہ اپنی معنوی وہمہ گیری اوصاف کے لحاظ سے بحر بیکراں تھا۔ حق پسندی، حق گوئی، میانہ روی، شرافت نفس ان کی زندگی کے مہمات اصول میں سے تھے علی گڑھ میں ایک اسکول سینیر کیمبرج اگزامنیشن کا انھوں نے جاری کیا تھا۔ اسکول کی نگرانی بچوں کی تربیت اپنے ذمہ انھوں نے رکھی تھی۔

آخر ۱۹۱۴ء میں ہم نے دیکھا کہ وہ اچھے خاصے کانفرنس کی میٹنگ میں دن کے آٹھ نو بجے سلطان جہاں منزل میں آئے۔ گاڑی پر سامان سفر لگا ہوا تھا۔ شملہ جا رہے تھے۔ سر راہ کمیٹی کی شرکت کے لئے کانفرنس آفس میں اُتر پڑے۔ شملہ پہونچ کر سر سید علی امام ممبر قانون اگزیکٹیو کونسل وائسرائے کے مہمان ہوئے۔ پہونچنے سے دو دن بعد حسب معمول شب کو آرام کے واسطے لیٹے اور پھر ایسے لیٹے کر خواب گاہ کے کمرہ سے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ان کی موت ان کے احباب اور شناساؤں کے لئے ایک مدت تک افسانۂ غم بن کر بے ثباتی عالم کا نقشہ دکھاتی رہی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

خطبۂ صدارت

حضرات! آج ہم لوگ ایک ایسے بزدلانہ اور قابل تنفر جرم کی تاریکی میں مجتمع ہوئے ہیں کہ جس کی توجہ سے نہ صرف ہماری کارروائی پر بلکہ تمام ملک پر ایک اداسی سی چھا گئی ہے۔ جناب والیسرائے صاحب بہادر جن کو ہماری یونیورسٹی کی تحریک سے ایک خاص قسم کی گہری دلچسپی تھی اس وقت مجروح اور ذی فراش ہو رہے ہیں اور ہم سب کے دل مؤدبانہ اور مخلصانہ ہمدردی سے لبریز اُن ہی کی جانب رجوع کر رہے ہیں۔ ہماری یہ دلی دعا ہے کہ ان کو جلد شفائے کامل اور طاقت عاجلہ حاصل ہو جائے اور ایسی عمر طولانی نصیب ہو کہ سالہائے دراز تک وہ اس عہدۂ جلیل پر جو اس وقت ان کو حاصل ہے اور ایسے ہی دیگر مہتم بالشان اور باوقعت عہدوں پر اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کی خدمت میں سرفراز رہیں۔ ان خجستہ خصائل لیڈی صاحبہ کو اس صدمہ ناگہانی اور رنج و پریشانی نے پژمردہ حال کر دیا ہے لیکن بفضل الٰہی اور ہر طرح سے اُن کو کوئی آسیب نہیں پہنچا۔ ان کی خدمت میں بھی ہم اپنی نہایت مؤدبانہ ہمدردی پیشکش کرتے ہیں۔ ہم اُن بہادروں کے یتیموں اور بیواؤں کے ماتم میں بھی شریک حال ہیں جنھوں نے اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں اپنی جانیں نثار کر دیں۔ دہلی کے سفاکانہ واقعہ کے چند ہی گھنٹوں کے فاصلہ سے بعید المسافت ملک اسپین میں سینور کاتالیخا کا ایک قاتل کے ہاتھ سے ہلاک ہونا اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اس قسم کے حربوں کی جرائم ایک بڑے وسیع طبقہ زمین پر رائج ہیں۔ بدقسمتی سے یہ بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ایسے جرائم کا کلیتہً انسداد نہیں ہو سکتا اور یہ امر اُسی قدر وسیع ہے کہ جتنا طبعی ہے کہ ان کو ہر ایک ملک میں ہر ایک سلیم الطبع انسان نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اس لئے کہ اس قسم کے سفاکانہ جرائم سوسائٹی کی بنیاد کو ہلا دیتے ہیں اور درحالیکہ ان سے کسی متنفس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ قوم کو بے حد نقصان پہونچتا ہے۔ ہر متوطن ملک کا یہ فرض ہے کہ اپنے مقدور بھر حکام متعین کو ایسے قاہرانہ افعال کے فرو کرنے میں مدد دیوے کیونکہ ان سے تمام دنیا کے امن کو سخت صدمہ پہونچتا ہے۔ میرا فرض منصبی ہوگا کہ میں آپ کے سامنے اس مضمون پر ایک رزولیوشن پیش کروں۔ اس لئے بالفعل اور کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔

حضرات! یہ خیال بالکل درست ہے کہ ہماری سالانہ تعلیمی کانفرنس کے صدرنشین بنائے جانے کی عزت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کم کوئی عزت ہماری قوم اپنے کسی فرد کو عطا کر سکتی ہے۔ اور یہ کچھ تعجب کی بات

نہیں۔ اگر ہم اس کا لحاظ کریں کہ یہ مجمعے کس قسم کے ہوا کرتے ہیں، اور وہ غور و خوض کس قدر اہمیت رکھتے ہیں جس میں اُن کے شرکا ہر سال کئی روز تک اپنے اوپر نہایت جفاکشی اور زحمت گوارا کرکے محض خالص اور بے لوث قومی خدمت کی غرض سے مصروف رہتے ہیں۔ یہ مجمعے صرف آپس میں ملنے جلنے کے لئے نہیں ہوا کرتے کہ لوگ یہاں ایک دوسری کی خاطر مدارات کیا کریں۔ بلکہ علی الرغم ان میں ہر ایک پیشہ اور ہر ایک طبقہ کے لوگوں کے دل دادہ اور سرگرم قایم مقام ہندوستان کے ہر سمت سے آکر اس غرض سے اکٹھا ہوتے ہیں کہ اپنی قومی فلاح کے متعلق اہم تریں مسائل پر آپس میں تبادلۂ خیالات کریں۔ ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ ان مسائل پر بحث کریں۔ اور حتی الامکان مباحثہ کے ذریعہ سے ان کے اندرونی نکات کو حل کریں ایسی جماعت کا صدر نشین منتخب کیا جانا اور اس کرسی صدارت پر بیٹھنا ایسی عزت ہے جس کا مجھ کو پورا اعتراف ہے اور جس کے لئے میں خلوص دل سے مشکور رہوں۔ خصوصاً جب کہ میں ان جلیل القدر بزرگوں کے اسمائے گرامی کو یاد کرتا ہوں جو گزشتہ سنوں میں اس کرسی صدارت کو زینت بخش چکے ہیں۔ جب میں اُن سے اپنا مقابلہ کرتا ہوں تو اپنے کو ایک ذرۂ ناچیز پاتا ہوں۔ اور اسی وجہ سے اس اعزاز پر زیادہ تر نازاں ہوں۔ اس کے ساتھ مجھ پر یہ بات بھی روشن ہے کہ اگر اعزاز زیادہ ہے تو ذمہ داری بھی ویسی ہی اہم ہے۔ کیوں کہ قوم جس شخص کو وہ اعلیٰ درجہ عطا کرتی ہے جو آج مجھے حاصل ہے تو یہ بھی توقع رکھتی ہے کہ اپنے غور و خوض میں اُس سے کسی قدر رہ نمائی حاصل کرے اور لازمی طور پر اس قسم کی رہ نمائی ہر حالت میں ایک اہم ذمہ داری ہوا کرتی ہے لیکن ایسی نازک حالت میں جو اس وقت میں اسلامی دنیا کی تقدیر پر طاری ہے اور جس سے ہماری اکلوتی اعلیٰ تعلیم کی قسمت بھی وابستہ ہے اور ایسے وقت میں کہ اس جلسہ کے شرکا کے خیالات ایسے مسائل میں غرق ہیں جو معمولی طور پر اہم اور سنگین ہیں یہ ذمہ داری صدگونہ ہو جاتی ہے اور اس کا پورا احساس کرتا ہوا اس وقت آپ کے سامنے لب کھولتا ہوں۔

جو التماس کہ میں اس وقت آپ لوگوں کے سامنے کرنے والا ہوں اس کے لئے فرمان مندرجۂ ذیل سے انسب کوئی تمہید میرے ذہن میں نہیں آتی۔

"آج ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم سے اپنی گہری اور سچی دلچسپی کے اظہار کا موقع پانے سے ہم کو بڑی مسرت ہوئی۔ ما بدولت ہندوستان کی یونیورسٹیوں ہی سے امید کرسکتے ہیں کہ اُن کے ذریعہ سے بتدریج یوروپین لوگوں اور ہندوستانیوں کے استبادات (Culture) اور تعلیمی حوصلوں میں

وہ اتحاد اور خلط پیدا کردیں جس پر کہ ہندوستان کی آئندہ بہبودی کا اس قدر دارومدار ہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے معیار تعلیم کے بڑھانے اور دائرۂ تعلیم کو وسعت دینے کے لئے جو تدبیریں اختیار کی ہیں اُن کو ہم نے پوری ہمدردی کے ساتھ زیر نظر رکھا ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کو باقی ہے اس زمانہ میں کوئی یونیورسٹی مکمل نہیں قرار دی جاسکتی تا وقتیکہ اُس میں نئی تحقیقاتیں کرنے کا پورا موقع نہ دیا جائے۔ آپ کو علوم قدیمہ کا ابقا بھی ضرور ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مغربی علوم کی ترقی میں سعی وافر کرنا ہے۔ آپکا یہ فرض ہو کہ طلبہ میں اخلاقِ حمیدہ (کرکٹر) پیدا کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر تعلیم بالکل بے سود ہوتی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ کو اپنی بھاری ذمہ داریوں کا اعتراف ہے۔ جو کام آپ کے درپیش ہو اُس کی کامیابی کے ہم خواستگار ہیں۔ اپنے حوصلوں کے تخیل (آیڈیل) کو بلند رکھئے اور اُن کے حصول میں بلا وقفہ کوشش جاری رکھئے خدا کے فضل سے آپ کامیاب ہوجاوینگے چھ برس ہوئے ہیں کہ انگلستان سے ہندوستان کو اپنی ہمدردی کا پیام بھیجا تھا۔ آج ہم ہندوستان میں یہ چاہتے ہیں کہ لفظ امید آپ کے زبان زد ہوجائے۔ مابدولت کو ہر سمت نئی زندگی کی ہلچل اور آثار نظر آتے ہیں۔ تعلیم نے آپ کی امیدیں پیدا کی ہیں اور اعلیٰ تعلیم پر آپ اعلیٰ امیدوں کی بنیاد ڈال سکتے ہیں ہمارے حکم سے دہلی میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ہمارے گورنر جنرل باجلاس کونسل بڑی بڑی رقمیں ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت اور اصلاح کے لئے مخصوص کردیں۔ مابدولت کا منشاء ہے کہ یہ خطۂ زمین ایسے اسکولوں اور کالجوں کی کثرت سے مشبک ہوجائے جن سے وفادار مردانہ مزاج اور کارآمد متوطنان ملک طیار ہو کر نکلیں جو حرفت علم کاشتکاری اور زندگی کے تمام مشغلوں میں کسی سے کم نہ ہوں۔ اور ہماری یہ خواہش ہے کہ علم کی اشاعت اور اس کے دیگر نتائج یعنی اعلےٰ پایہ کی دماغی قوت اور آسودگی اور تندرستی ہماری ہندوستانی رعایا کے گھروں سے تاریکی دور کریں اور اُن کی محنت و مشقت کو خوشگوار کردیں۔ ہماری خواہش تعلیم ہی کے

ذریعہ سے بر آئے گی اور ہندوستان کی تعلیم کی حمایت ہمارے دل میں ہمیشہ متمکن رہے گی۔ اس بات کے تیقن سے ہم کو بہت فرحت حاصل ہوئی کہ آپ ہمارے اور ہمارے دودمان شاہی کے جاں نثار ہیں اور آپ کی یہ خواہش ہے کہ آپ برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے رشتہائے اتحاد کو استوار کریں اور نیز اُن نعمتوں کی قدر کرنے میں جو حکومت برطانیہ کے زیر سایہ آپ کو حاصل ہیں ما بدولت آپ کی وفادارانہ اور عقیدتمندانہ عرضداشت کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

یقیناً آپ حضرات نے پہچان لیا ہو گا کہ یہ ہمارے شاہنشاہِ معظم کا تلطف آمیز کلام ہے۔ اس کے الفاظ ایسے پُر درد ہیں اور دریا دلی اور نیک نیتی کی ہوا سے ایسے معطر ہیں کہ اُن سے بڑھ کر کسی انسان کی زبان سے نہ نکلے ہوں گے۔ درحقیقت ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کے پوتے کے لئے ایسے الفاظ زیبا تھے کیوں کہ ان کا التفات مشفقانہ اور الفت لازوال اپنی ہندوستانی رعایا کے حق میں ایسی تھی کہ جس کی بدولت ہم نے گزشتہ زمانہ میں بھی بہت کچھ فیض اُٹھایا ہے اور اب بھی اُٹھا رہے ہیں۔ علاوہ بریں یہ الفاظ ایسے ہیں کہ جن سے اعلیٰ درجہ کی فراست، خردمندی اور مدبّری مترشح ہے اور جو اس ملک کی تعلیمی مستقبل کے حق میں میگنا چارٹا کا حکم رکھتے ہیں۔ جس کسی کو کوئی بھی تعلق ہندوستان کی پالیسی یا ترقی کے ساتھ ہو اُس کو ہرگز ان الفاظ کو چشم انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ الفاظ اس قابل ہیں کہ ہندوستان کے سخت ترین سنگ خارا پر سنہری حرفوں میں کندہ کرا کے ہر ایک یونیورسٹی کالج یا دیگر درس گاہوں کی عمارتوں کے مدخل پر ایسے مقام پر نصب کئے جاویں جہاں ہر شخص ان کو پڑھ سکے۔

تاریخ کے لحاظ سے ملک معظم جارج پنجم کے اس اعلان کی ایک ہی مثال میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ وہ پالیسی ہے جس کی بنیاد روس میں الگزنڈر دوم نے جنگ کریمیا کے بعد ڈالی تھی۔ مگر فرق اتنا ہے کہ زار روس کے فرمان کی تعمیل عملی طور پر فوراً کی گئی۔ حالاں کہ ہمارے شاہنشاہ معظم کا اعلان گویا سُبک دلی کے ساتھ بالائے طاق رکھ دیا گیا اور نسیاً منسیا بھی ہو گیا۔ الگزنڈر دوم کے زمانہ سے قبل روس میں تعلیم کی حالت ابتذال اور تنزل کے قعر کو پہنچ گئی تھی زبردستی سے روکنے کی پالیسی نے قومی زندگی کے کسی صیغہ کو ایسا مسمار نہیں کیا تھا جیسا کہ تعلیم کو ہر ایک قسم کی تعلیم اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم شکنجہ میں کسی جاتی تھی۔ قانوناً محدود کی جاتی تھی۔ اور عام تمسخر اور حقارت کا

نشانہ بنائی جاتی تھی۔ یونیورسٹیوں میں فوج کے کرنیل اور کونٹ کے درجہ کے عمایدو اکابر پروفیسر کے عہدہ پر مقرر کئے جاتے تھے اور پولیس کے حکام فلسفہ پر لکچر دیا کرتے تھے۔ الگزنڈر دوم کی پالیسی نے اُس ابتری کو روک دیا اور اس پالیسی کو اُس کے وفادار افسروں نے فوراً جاری کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ تعلیم میں فی الفور بے حد اصلاحیں ہوگئیں۔ یہ اصلاحیں دوبس اور محکم تھیں اور اُن کی وجہ سے یونیورسٹیاں اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوگئیں (پریزیڈنٹ چارلس فرانکلن تھنگ)

ہم کو امید یہ ہے کہ ہندوستان کی تعلیمی حالت اس قدر ابتر نہیں ہے جیسی کہ اس خاکہ سے ظاہر ہوئی ہے جو میں نے اوپر کھینچا ہے۔ پھر بھی تصویر بالکل ناآشنا نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے چہرہ کے بعض خط و خال ہم کو مایوس سے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی جس وقت ہمارے شہنشاہ معظم کی پالیسی پورے طور سے جاری ہو جاوے گی اُس وقت ہم کو کوئی شکایت کی جگہ نہیں رہے گی۔ مگر سردست تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے آخری فیصلہ نے جو سر ہارکورٹ بٹلر کی تحریر بنام پریزیڈنٹ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی مورخہ ۹ اگست گزشتہ میں مندرج ہے۔ ہماری یونیورسٹی کی تحریک کا کم از کم چند سال کے لئے خاتمہ بالخیر کر دیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بھی ابھی تک نصیب نہیں جاگے ہیں۔ حالانکہ اب دنیا کی ہر ایک اقلیم میں خواہ وہ مغرب میں ہو خواہ مشرق میں ابتدائی تعلیم ایک مقدس فرض کا پایہ رکھتی ہے۔

اگر سر ہارکورٹ بٹلر کے خط کا یہ منشا تھا کہ اُس کارروائی کی تائید میں دلائل پیش کریں جس کا مشورہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے مشیر کاروں نے ان کو ہماری یونیورسٹی کی تحریک کے بارہ میں دیا ہے تو کوئی سلیم الطبع انسان اس کو تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ دلائل کسی کو قائل کر سکتے ہیں۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور خط کے لہجہ اور انداز بیان سے یہ نتیجہ نکالنا جائز ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ مزید بحث و مباحثہ کو قطعاً بند کر دیا جائے۔

اس کے بعد مجھ کو جو کچھ عرض کرنا ہے اس میں میرا یہ بھی فرض ہوگا کہ میں اساسی (کانسٹی ٹیوشن) کمیٹی کی کارروائی پر اعتراض کروں لیکن اس سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کمیٹی کے کسی ممبر کی ذات یا نیک نیتی پر دھبا لگایا جائے۔ یا اس بات میں کوئی شک کیا جائے کہ اُنھوں نے نہایت گرمجوشی اور جانفشانی سے اس مشکل خدمت کو ادا نہ کیا جو ان کے سپرد کی گئی تھی۔ کمیٹی کے ممبروں کو اس کی دُھن ہوگئی تھی کہ یہ معاملہ جلد ہو جائے گویا ان کے دل آئینہ وار مسلمانوں کے قومی دل کا عکسی نقشہ دکھا رہے تھے جس میں اُس وقت وفاداری کے شعلے بھڑک رہے تھے اور جس میں عالی حوصلہ اور تمنا کی آگ دہک رہی تھی کہ

مسلم یونیورسٹی کا سنگ بنیاد خود ملک معظم جن کی اس زمانہ میں آمد آمد تھی اپنے دست مبارک سے نصب کریں۔ نہ تو کمیٹی کو اور نہ قوم کو اس بات کی اصلیت کا احساس ہوا کہ اساس (کانسٹی ٹیوشن) راتوں رات پریوں کے محلوں کی طرح نہیں طیار ہوا کرتے ہیں اب تو سب پر ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ بھی لاسود تھا۔ لیکن واقعہ کے حدوث کے بعد دانشمند بننا آسان ہے جس وقت میں کہ کمیٹی نے اساس (کانسٹی ٹیوشن) کے اندر اس کثرت سے حق تردید داخل کرنا منظور کیا تھا اس وقت کس کا یہ خیال تھا کہ یہ حقوق خود ہمارے ہی چانسلر کو حاصل ہوں گے۔ اس حالت میں بھی اس کے اختیارات شاید حد سے زیادہ وسیع تھے جن کی وجہ سے یونیورسٹی ایک شخص واحد کی حلقہ بگوش ہوئی جاتی تھی۔ مگر سکرٹری آف اسٹیٹ کے آخری فیصلہ کی روسے جس سے چانسلر کے اختیارات گورنمنٹ ہند کو منتقل کرائے گئے ہیں حالت بالکل بدتر ہو گئی ہے اور یونیورسٹی بعوض ایک قومی تاسیس (اب گورنمنٹ آف انڈیا) اپنے عہدہ کے لحاظ سے یونیورسٹی کا افسر اعلیٰ ہوگا" چانسلر (اب گورنمنٹ آف انڈیا) اپنے ہر ایک معاملہ کے متعلق جس کا تعلق یونیورسٹی سے ہو تحقیقات کرنے کا مجاز ہوگا۔ اور یونیورسٹی کی ترقی اور انتظام اور فلاح کے لئے جو کچھ بھی وہ مناسب تصور کرے کورٹ (جماعت ٹرسٹیان) کو مشورہ دے گا۔ کورٹ کو اب اختیار ہے کہ خواہ ایسے مشورہ پر عمل کرے یا چانسلر کے غور کے لئے اپنی رائے ارسال کرے اگر ایسی رپورٹ کے موصول ہونے پر چانسلر اس ضرورت کو محسوس کرے کہ اس کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیئے تو کورٹ کو ضرور کرنا پڑے گا۔" آپ ملاحظہ فرماویں گے کہ یہ قاعدہ کالج کے ایک موجودہ قاعدہ کی خفیف سی ترمیم کرنے کے بعد بنا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے کانسٹی ٹیوشن کی "اعلیٰ حکمراں جماعت" اعلیٰ درجہ کی خفت میں پڑ گئی اور محض بے مصرف ہو گئی ہے۔ اس لاجواب کانسٹی ٹیوشن کے دیگر تفصیلات کے ذکر سے آپ کی تصدیع خاطر نہیں چاہتا جو اقتباسات میں پیش کر چکا ہوں اُن سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ مجوزہ یونیورسٹی میں ہماری قوم کے قائم مقاموں کو بہت قلیل اختیارات باقی رہ جاویں گے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے انکار نہیں کرتا کہ جو یونیورسٹی ہمارے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی تجویز کے مطابق بنے گی۔ وہ ایک عمدہ تاسیس (کانسٹی ٹیوشن) ہوگی۔

یہ سچ ہے کہ وہ عملی طور پر ایک بالکل سرکاری چیز ہو جاوے گی جس کو سررشتہ تعلیم کے ماہران فن چلایا کریں گے اور واقعہ یہ ہے کہ اب تک خود اپنے اقرار کے بموجب اور سر انٹانیو میڈل جیسے اشخاص کی شہادت کی بنا پر تعلیم کے میدان میں گورنمنٹ کی کوششیں ناکامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ آئے دن وہ یہ دکھڑا رویا کرتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں حمیدہ خصائل (کریکٹر والے) نوجوان یعنی ایسے

ایسے لوگ جو اخلاق کی عمدگی میں ثابت قدم ہوں نہ پیدا کر سکیں۔ ان سے اسی قدر ہو سکا کہ تھوڑے سے ایسے ایم۔ اے۔ بی۔ اے پیدا کر دیں جنہوں نے کتابیں بے سمجھے ازبر کر لی ہیں۔ بالفرض ہم یہ مان لیں کہ گورنمنٹ پرانی لکیر کو چھوڑ کر نئی راہ پر چلنا شروع کرے اور آئندہ اس کو زیادہ کامیابی حاصل ہو تو سوال یہ ہے کہ اس قسم کی درس گاہ میں خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو مسلمانوں سے کیوں یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس میں خاص طور سے دلچسپی لیں اور پھر ایسی گہری دلچسپی کہ جو کچھ تعلیمی سرمایہ ان کو اس وقت حاصل ہے اس پر قربان کرنے کو آمادہ ہو جاویں اور تعلیمی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو دیوالیہ بنا لیں۔ کیا درحقیقت ہم کو کچھ بھی سا ن گمان اس کا ہے کہ ہم سے اس عملاً سرکاری درس گاہ کے لئے کیا کیا قربانیاں مانگی جا رہی ہیں۔ کیا ہم اس کے اصلی معنی کو بھی سمجھے ہیں۔ دیکھئے تو سہی سب سے اول تو اس کے یہ معنی ہیں کہ چند لاکھ روپیہ جو ہم نے حال میں اپنی افلاس زدہ قوم سے جمع کئے ہیں اٹھا کر ایک گورنمنٹ کے سررشتہ کے حوالہ کر دیں۔ تاکہ وہ اپنے حسب خواہ اس کا ادارہ تیار کر دے۔ اور یہ وہ روپیہ ہے جو قوم نے جوش میں آکر ایسی حالت میں عطا کیا تھا کہ جس وقت اس پر وفاداری کی حرارت طاری تھی۔ اور وہ گویا وجد کی حالت میں تھی اور اس روپیہ میں غربا اور متوسط الحال لوگوں کی محنت اور جفاکشی کی کمائی کا پیسہ بھی شامل تھا جو انھوں نے پیٹ کاٹ کر اور بمشکل پس انداز کیا تھا اور متموّل لوگوں کی اشرفیاں بھی جو انھوں نے اپنی دولت عظمیٰ کی پس ماندہ کے طور پر عطا کی تھیں اور جس سے بہت زیادہ دینے کا ان کو مقدور حاصل تھا۔ مگر یہ نظر بھی بالکل حقیر اور بے قدر معلوم ہوتی ہے جب ہم اس کا مقابلہ خود علی گڑھ کالج کی قربانی سے کرتے ہیں جو ہم کو فقط ایک نام پر شیفتہ ہو کر دینا لازم آتا ہے۔ یعنی یونیورسٹی کے نام پر۔ ذرا قانون کی اس عبارت کو ملاحظہ فرمایئے اور اس کا یہ اخیر اقتباس ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ "یونیورسٹی قائم ہونے کی تاریخ سے مدرسۃ العلوم مسلمانان بحیثیت ایک جداگانہ تجسم (کارپوریشن) کے مفقود ہو جائے گا اور وہ یونیورسٹی میں مدغم ہو جائے گا۔" جی ہاں! حضرات! اس کے وجود کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور ایسی یونیورسٹی کے عوض جس کا نقشہ میں نے اوپر آپ کی اطلاع کے لئے کھینچا ہے۔ ایک ایسی یونیورسٹی کو کالج کی ہر ایک قسم کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ اور اس کے تمام حقوق اور اختیارات منتقل کر دیئے جاوینگے سرسید کی عمر بھر کی کارروائیاں یہ چہل سالہ اور نازک پودا جس کی پرورش مسلمانوں کی تمام قوم نے کی ہے اور جس کو قوم کے معتبر ترین رہنماؤں نے اپنے ہاتھوں سے سینچ کر نشوونما دیا ہے۔ وہ تیس لاکھ کی رقم جو ایک اوّل درجہ کی یونیورسٹی کی ضروریات کے مقابلہ میں بے شک ویسی ہے جیسے

سمندر میں قطرہ لیکن پھر بھی ایک ایسی قوم کی اعلیٰ ہمتوں کا نمونہ ہے جو بمقابلہ ہندوستان کی اور قوموں کے افلاس میں گرفتار ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمام ورثہ جو ہمارے ہاتھوں میں اس وقت بطور ایک مقدس امانت کے ہے اس کو ہم فروخت کردیں اور اس کے معاوضہ میں ہم کو کیا ملے کہ ایک ملغوبہ ایک ایسی یونیورسٹی جو آدھی مرغی اور آدھی بٹیر اور جس کو ہم کسی معنی میں اپنا نہیں کہہ سکتے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان ایسی یونیورسٹی کو اُن تمام امیدوں اور امنگوں کے بر آنے کی برابر تصور کریں جو ان کے دلوں میں مدت سے ہیں۔ اور جن کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ایک ایسی خود مختار تاسیس (انسٹی ٹیوشن) قایم کریں جس میں کہ وہ اس کام کو جو انھوں نے علی گڑھ میں شروع کیا ہے زیادہ قابلیت اور مستعدی کے ساتھ اور زیادہ استوار بنیاد اور اعلیٰ پیمانہ پر بناتے رہیں۔ اور اس تاسیس کو اقلاً اس قدر خود مختاری حاصل ہو جس قدر علی گڑھ کالج کو حاصل رہی ہے اور اس کے انتظام میں سرکاری عہدہ دار دخل دینے کے مجاز نہ ہوں۔ سر سید یا سید محمود اور قوم کی رہنمائی میں آپ کے تمام جانشینوں کے حوصلوں کا تخیل (آئیڈیل) یہی تھا۔ اور آج تک تمام مسلمانوں کے حوصلوں کا تخیل (آئیڈیل) یہی ہے ہم نے مانگی تو تھی روٹی اور ہم کو دیئے جاتے ہیں پتھر۔

اتنا کہنا ضرور ہے کہ جو تجویز اب ہمارے سامنے پیش ہے اس کی پوری ذمہ داری کمیٹی کی گردن پر نہیں ہے۔ کمیٹی کو یہ بھی دیکھنا تھا کہ گورنمنٹ کہاں تک دینے کو راضی ہے۔ شاید یہ معاملہ ہو کہ گورنمنٹ نے کہہ دیا ہو کہ اس قدر لینا ہو تو لو ورنہ رخصت۔ اس معاملہ میں جو حصہ گورنمنٹ کا ہے اس سے ہمارے لوگوں کی نسبت اس قدر بدظنی مترشح ہوتی ہے کہ جس کے لئے کوئی عادلانہ وجہ نہ تو قیاس (تھیوری) کی بنا پر معلوم ہوتی ہے اور نہ تجربہ کی۔ اور جو میری رائے ناقص میں ایک ایسی مرکزی گورنمنٹ کے لئے نازیبا ہے جو مثل گورنمنٹ ہند کے ہر چیز پر قادر ہے۔ اس گورنمنٹ کو تمام ہندوستان پر اعلیٰ انتظامیہ اختیار حاصل ہے اور جب وہ چاہتی ہے اور جہاں چاہتی ہے اس اختیار کو برتتی ہے۔ ایسی صورت میں خواہ کوئی اساسی قانون (کانسٹی ٹیوشن) ہو یا نہ ہو اگر کسی یونیورسٹی کو گورنمنٹ اپنے اندرونی انتظام میں اس شرط پر خود مختاری عطا کرے کہ اُس کو ہر حالت میں ضرورت کے وقت اور اُسی حالت میں کہ جب واقعی ضرورت ہو اُس کو تسلط کا پورا اختیار حاصل ہوگا اور اُس یونیورسٹی میں کوئی مذموم یا مضر رجحان پیدا ہو جائے تو کیا ایک لمحہ کے لئے بھی یہ دعوےٰ کیا جاسکتا ہے کہ گورنمنٹ اس کو فوراً روک نہیں دے سکتی؟ یہاں تک تو قیاسی دلیلیں تھیں۔ اب باقی رہے تجربہ کی طرف رجوع فرمایئے۔ چالیس برس سے اسلامی جماعت کے

پیشواؤں نے علی گڑھ کالج کا انتظام اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ مبصّرین جو خاص کر کے گورنمنٹ کے حکام اعلیٰ مثل ویسرائے لفٹننٹ گورنر یا دیگر مشخص اصحاب کے تھے اُن کی حق بجانب ستائش کرتے آئے ہیں۔ لارڈ کرزن کی تعلیمی کمیشن نے باوجودیکہ مخصوص فرقہ کے نام سے مسمیٰ (ڈنامی نیشنل) یونیورسٹی کے خلاف لکھا کالج اور اُس کے نظم و انتظام کی بہت تعریف کی۔ کالج کو ہر قسم کی تعلیمی اصلاح میں پیش روی کا رتبہ حاصل رہا ہے۔ مثلاً باشندگی کا دستور (رزیڈنشل سسٹم) اور اتالیقی (ٹیوٹوریل) طریقۂ نگرانی اور یہ وہ اصلاحیں ہیں جن کی ضرورت کا سرکاری عہدہ داروں کی دنیا میں اب اعتراف شروع ہوا ہے اور جن کی نقل ابھی تک سرکاری تاسیسوں (انسٹی ٹیوشن) میں کامیابی کے ساتھ نہیں ہو سکی۔ ایسے سرکاری افسروں نے جو اعلیٰ درجہ کی ذمہ داری کے عہدوں پر مامور رہتے علی گڑھ کے پڑھے ہوئے نوجوانوں کو خواہ فارغ التحصیل ہوں یا اُن سے نیچے درجوں کے طالب علم نہایت ہی اعلیٰ تعریف کا صلہ عنایت کیا گیا ہے۔ ان میں سے دو ایک کے اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ سر آکلنڈ کالون لفٹننٹ گورنر صوبجات متحدہ یہ فرماتے ہیں "کالج نے جو عام پسندی حاصل کی ہے اور جو نوجوان اس نے طیار کئے ہیں وہ ثبوت ہیں اُس دانشمندی کا جو کالج کی بنا میں صرف کی گئی ہے۔ اگرچہ ہر شخص کا یہ کام نہیں ہے کہ مشرق اور مغرب کے خیالات کا موازنہ اُس سنجیدگی کے ساتھ کرے جو سید احمد کو اپنے ذہن رسا اور اپنی ہنرمند شخصیت کی وجہ سے حاصل تھا۔ تاہم یہ قرین قیاس ہے کہ وہ لوگ جن کو اُن نوجوانوں سے شناسائی حاصل ہے جو اس کالج سے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ ہم سے اتفاق کرینگے کہ اُن میں اپنی تعلیمی تربیت کے امتیازی نشانات اُسی درجہ میں منقش ہوتے ہیں جیسے ہماری اعلیٰ درجہ کے اسکولوں کے طالب علموں میں یا ہماری یونیورسٹی کے فارغ التحصیل شاگردوں میں علی گڑھ کالج کا پڑھا ہوا مرادف ہو گیا ہے روشن خیال اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مستغنی المزاج انسان کا۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس قسم کے ہندوستانیوں کا نمونہ بن گیا ہے جو انگریزوں کی خواہشوں کی اس قدر دادویں۔

وہی صاحب والا ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ "میں نے بارہا دیکھا ہے کہ علی گڑھ کا پڑھا ہوا آدمی ہونا گویا ایک پروانۂ راہداری ہے جس کی وجہ سے انگریز اور ہندوستانی دونوں اس کی عزت اور اُس پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ لوگ جہاں کہیں جاتے ہیں وہاں اُن کے اوپر اُن کی تعلیم گاہ کی چھاپ موجود ہوتی ہے۔ یعنی اس شخص کی مہر جس کی زیر نگرانی ان کی تربیت عمل میں آتی ہے۔"

اس صوبہ کے ایک اور لفٹننٹ گورنر سر چارلس کراسٹھویٹ صاحب نے رئیسوں کے ایک

اڈریس کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا "آپ کے طالب علم کس بات میں ناموری ہیں؟ ان کی خصلت یہ ہے کہ یہ راستبازاور مردانہ مزاج اور جس گورنمنٹ کے زیرسایہ رہتے ہیں اُس کے خیرخواہ ہیں۔ یہ خلیق اور مودب اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ غلامانہ رویہ سے مبرا ہیں اور اپنی تربیت کی وجہ سے زندگی کے عملی کاموں کی پوری قابلیت رکھتے ہیں"۔

پس واضح ہو کہ جس بات کا ان اعلیٰ افسروں نے اور دیگر اشخاص نے خاص کرکے اعتراف کیا ہے وہ یہ ہے کہ علی گڑھ کو حمیدہ خصائل پیدا کرنے میں (کریکٹر) بنانے میں بے شک کامیابی حاصل ہوئی۔ اور یہ کہ اس کے شاگردوں میں دیانت، ذہانت اور عملی انتظامیہ مادہ پایا جاتا ہے۔

پس آپ ملاحظہ فرماویں گے کہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کا زمانہ ایسا نہیں ہے کہ وہ اُس بدظنی کے سزاوار ہوں جس کی روح اس تجویز میں سرایت کرگئی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے اُس ترمیم کے بعد پیش ہے جو سکرٹری آف اسٹیٹ کے اخیر فیصلہ سے لازم آئی ہے خود اپنے منھ سے گورنمنٹ ہند نے اقرار کیا ہے کہ جس امر میں کالج کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے اُس میں وہ ناکامیاب رہے اس پر بھی اب وہ یہ چاہتی ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور ٹرسٹیوں کی وہ حالت بنا دے جس میں ذمہ داری تو ہوتی ہے مگر اختیار کچھ نہیں اور اس حالت کی جو مثالیں اس ملک میں نظر سے گزری ہیں اُن سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہوں۔

علاوہ بریں اگر آپ اس تجویز کو منظور کرلیں تو یہ ممکن ہے کہ آپ ہی کے اسٹاف کا کوئی فرد تمام حقوق تردید کو خود برتے اور کالج کی پالیسی کو بالکل اپنے قبضہ میں کرلے بشرطیکہ حکومت کے اعلےٰ طبقوں میں اس کو رسوخ ہو یا اس کا کوئی دوست سررشتہ تعلیم کے کسی بڑے عہدہ پر متعین ہو۔ جو لوگ کہ ہندوستان میں نیم سرکاری اور خانگی چھوٹی کے پُرزور اثر کا کچھ علم رکھتے ہیں وہ اس خطر کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

برخلاف اس کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں ہمارا وتیرہ ایسا ہے کہ اس سے گورنمنٹ کے اوپر ہماری ایسی بے اعتباری پائی جاتی ہے کہ جس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اور یہ کہ اگرچہ حقوق تردید اور استثنا، احتیاطاً تجویز کے اندر داخل کئے گئے ہیں وہ یا تو شاذونادر موقع پر برتے جاویں گے یا کبھی نہیں الا اس صورت میں کہ جب ان کا برتنا لابد ہوجائے۔ مگر یہ قول ہمارے عذر کا درست مطلب ادا نہیں کرتا ہے کیوں کہ اس میں گورنمنٹ کے اوپر بے اعتباری نہیں ہے بلکہ اس انتظام پر جس کی وجہ سے ہردم اور ہر آن افسروں کے تبادلہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے جو کم و بیش تعلیمی معاملات

بر حاوی ہوتے ہیں جن میں سے بعض تو ہماری تعلیمی ضروریات سے ناواقف ہوتے ہیں یا اُن سے اُن کو مطلق ہمدردی نہیں ہوتی۔ بعض ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جن کو کسی خاص چیز کی وسعت یا کسی خاص بات کا خبط ہوتا ہے اور بعض کے دماغ اُن خیالات سے بھرے ہوتے ہیں جن کا آج کل رواج ہے یعنی یہ کہ تعلیم سوائے مغربی قوموں کے اور سب کے لئے ایک مضر چیز ہے۔ مورخین نے کہا ہے کہ اس طریق حکومت کا جس کو "بینو ولنٹ ڈسپوٹزم" یعنی استبداد شفقت آمیز کہتے ہیں۔ ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں پالیسی یا انتظام کو ثبات نہیں ہوتا۔ اس نظم کے ساتھ یہ ضعف مدغم ہوتا ہے کہ اس کی بحث میں کسی اصلاح کے دوام کا تیقن نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں کا یہ قول ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسی ضعف کی حکومت ہے۔ بہرکیف یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کی حکومت کا یہ مخصوص نقص ہم کو اس ملک میں بہت ستاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے اوائل کے دہ سالہ دوروں میں جو حکومت استبداد شفقت آمیز پر مبنی تھی۔ ان میں تدبیر اور انتظام میں تغیر و تبدّل یا تو بادشاہ کی وفات کے بعد ہوا کرتا تھا یا کسی ایسے وزیر کے عہدہ سے علیحدگی کے بعد جس کو اس وقت بادشاہ بہت مانتا ہو۔ ہندوستان میں حکومت پانچ پانچ برس میں بدلتی ہے اور بر منتظم افسروں کے عہدوں کی پابندی کا اوسط زمانہ بہت ہی قلیل ہوتا ہے اور ایسے تاسیسوں (انسٹیٹیوشن) کے انتظام میں جیسے کہ کالج یا یونیورسٹیاں ہوا کرتی ہیں یہ ایک نہایت ہی اہم عنصر ہے۔

میری رائے میں بحیثیت تعلیمی تاسیس ہونے کے علی گڑھ کی کامیابی ایسے اصول پر مبنی ہے کہ وہاں اس قسم کے تبدلات و تغیرات نہیں ہوئے۔ یہاں اپنی ضروریات سے پوری واقفیت کے ساتھ ساتھ عمل میں دوام کا سلسلہ جاری رہا اور اس قدر خود مختاری بھی حاصل رہی کہ جس سے سرکاری عہدہ داروں کی ہر آن کی مداخلت سے محفوظ رہنا میسر ہوا۔ قوم کے زکی ترین خردمندوں نے اپنا وقت اور اپنی مشقت اس تاسیس کی خدمت میں صرف کی۔ نظم و نسق مشفقانہ رہا گیا طلبا کلدار کھلونا نہیں سمجھے گئے کہ کسی گھنڈی کے دبانے سے یا کسی کمانی کے کوک دینے سے مرضی کے موافق کوئی نشست و برخاست کی وضع اختیار کرلیں۔ یا کوئی کام کرنے لگیں۔ بلکہ ان کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو انسان کے ساتھ کرنا چاہئے جس میں احساسات جذبات، ہوائے نفسانی خوشی غم، نیکی، بدی، خوبی اور عیب سب کا مادہ ہے۔ جو ہم چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ اسی قسم کا نظم و نسق ہم ایک ایسی یونیورسٹی میں جاری کرسکیں جس کو ہم اپنا کہہ سکتے ہوں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کے آخری فیصلے نے اس کو ایک امر محال کر دیا ہے۔ فقط اس وجہ سے کہ جو وہ دینے پر راضی تھے وہ

ہم کو منظور نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اس وجہ سے کہ آئندہ کے واسطے قانون اساسی کانسٹی ٹیوشن کے تمام تفصیلات میں تغیر وتبدل کرنے کا حق اُنھوں نے محفوظ رکھا ہے۔ پس ہم کو لازم ہے کہ جو خیالی پلاؤ ہم اتنے دنوں سے پکا رہے تھے اور شیخ چلی کے سے منصوبے باندھ رہے تھے کہ ہم کو یہ ملے گا اور وہ ملے گا۔ ان سب کو خواب پریشان سمجھ کر اپنے دلوں سے محو کردیں اور وفد (ڈپوٹیشن) لے کر جانے کی حرص کو ذرا لگام دیں۔ اور مودبانہ گورنمنٹ میں عرض کریں کہ جس قسم کی یونیورسٹی ہم کو عنایت ہو رہی ہے وہ ہمارے کسی مصرف کی نہیں۔ جو ہمارا معظم اور معتمد اور رہنما اور حبیب تھا اور جو ہماری من حیث قوم ترقی کی امدادوں کا بانی تھا، اس کے یعنی جلیل القدر اور لاثانی سر سید احمد کے گزر جانے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہم کو ایک بڑا سبق جو وہ پڑھا گئے تھے یعنی اپنی مدد آپ کرنے کا سبق بھول نہیں جانا چاہیئے۔ ایسے نازک وقت میں جو آج ہماری قسمتوں پر آرہا ہے۔ یہی ایک خصلت ہے جو ہم کو قوتِ بازو دے سکتی ہے اور جس ضغطہ میں ہم گرفتار ہیں اس سے رہا کر سکتی ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ قبل اس کے کہ میں الحاق کے مسئلہ کے قرب وجوار میں بھی پہونچوں میں نے موجودہ تجویز یونیورسٹی کے برخلاف فتوے دے دیا ہے۔ درحقیقت میں قطعی طور پر اس کے خلاف ہوں۔ اگر گورنمنٹ ہم کو فوراً یہ حق دیدے کہ ہم تمام ہندوستان کے کالجوں کو ملحق کرلیں پھر بھی میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ موجودہ تجویز کو نامنظور کیجیئے۔ جس حالت میں کہ ہم کو اپنی نظم ونسق پر، اپنے اسٹاف پر، اپنے نصاب تعلیم پر اور سب معاملات پر اختیار نہ رہا تو ہمارے لیئے حق الحاق کا ملنا نہ ملنا یکساں ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ابتدا ہی سے اس مسئلۂ الحاق نے ہم کو راہِ راست سے بہکا دیا ہے اور لوگوں کی توجہ کو اس تجویز کے اصلی اور حقیقی عیوب کی طرف سے پھیر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ اعلیٰ اختیار نظم ونسق کا اور اس کی ہر جزوی تفصیل کا ہمارے قائم مقاموں کے ہاتھوں میں ہونے کے عوض گورنمنٹ آف انڈیا کے ہاتھ میں ہوگا۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں نے گورنمنٹ کی تجویز کو تو اصولاً مان لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اُن کی قوم میں نہایت ذکی اور معاملہ فہم لوگ موجود ہیں اور ہم کو اس کا اقرار ضرور ہے کہ خود ہی اپنی ضروریات کو خوب سمجھتے ہیں۔ اس لیئے ہم کو سردست صبر کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کو کیا ملتا ہے اور وہ کیا قبول کرتے ہیں۔ کسی بات کو اصولاً تسلیم کرلینا اور چیز ہے اور ایک قطع وبرید کیئے ہوئے دستور العمل کو قبول کرلینا اور بات ہے۔ علاوہ بریں سب سے بڑی بات تو ہم کو یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ ہندوؤں کے پاس کوئی علی گڑھ کالج نہیں ہے جو اُن کو گنوانا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرہارکورٹ بٹلر کا حکم مسلمانوں پر ایسا

نازل ہوا جیسے کہ صاف آسمان سے کوئی سل گرے۔ لیکن اپنے خیالات کی رو سے میں اس کو ایک ایسی نعمت سمجھتا ہوں جو مصیبت کے بھیس میں نازل ہوئی ہو۔ اُس نے قوم کی آنکھیں کھول دیں اور حقیقت حال اُن کو دکھا دی ہے۔ اگرچہ اُن وجوہات کی بنا پر نہیں جن پر میں نے زور دیا ہے۔ بڑا کام تو اس نے یہ کیا ہے کہ مزید غور و تامل کا وقت دیا ہے۔ اس سوال کا جواب کہ آیا یونیورسٹی کی اصلی تحریک بار آور ہو گی اور وہ سچ مچ کی یونیورسٹی جو ہم چاہتے ہیں ہم کو ملے گی یا نہیں۔ زمانہ مستقبل ہی دے سکتا ہے خود مجھ کو تو اس سے ناامیدی نہیں ہے۔

میری دانست میں اس مقام سے زیادہ کوئی موقع مجھ کو اس کا نہیں ملے گا کہ میں ان خیالات پر ایک عام نظر ڈالوں جو تعلیم کے بارہ میں جہاں تک ہندوستان سے اس سے تعلق ہے بہت سے ذی اثر لوگوں کے دلوں میں یہاں بھی اور انگلستان میں بھی ذہن نشین ہیں۔ پہلے تو آپ یہ دیکھیں گے کہ تعلیم سے ان کا مطلب انگریزی تعلیم اور "تعلیم یافتہ" نیٹو کا لفظ جو اُن کی زبان زد ہے اُس سے وہی لوگ مراد ہیں جن کی تعلیم انگریزی زبان میں ہوئی ہے۔ جن خیالات کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں ان میں سے اکثر ایسی صریح مغالطہ پر مبنی ہیں کہ شاید اس مضمون پر بحث کرنے سے وہ واضح ہو جاویں اور بعض غلط فہمیاں جو اس اشد ضروری مضمون کی نسبت اب پائی جاتی ہیں وہ رفع ہو جاویں اور بعض ضروری اس وجہ سے ہے کہ انھیں مغالطوں اور غلط فہمیوں کی بنا پر تدبیر (پالیسی) اور نظم و نسق (اڈمنسٹریشن) قائم کئے جاتے ہیں

پہلا عام عقیدہ جو مذکورہ بالا ذی اثر حلقوں میں پایا جاتا ہے اور جس سے میں اختلاف کرنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ بدوں انگریزی تعلیم کے ہم کو جدید خیالات سے اور جدید تحقیقات کی لہروں سے خواہ وہ سیاسی یا تمدنی علوم میں ہوں خواہ ادبیہ اور ریاضیہ علوم میں واقفیت ناممکن ہے اور جو لوگ انگریزی یا کوئی اور یورپین زبان نہیں جانتے اُن کو ضرور ایسے خیالات سے لاعلمی رہے گی۔ اسی غلطی کی بنا پر یہ نتیجہ بھی نکالا جاتا ہے کہ یہی تعلیم یافتہ فرقہ (اس محدود معنی میں جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں) بانی مبانی ہے۔ تمام باغیانہ تحریکوں، تمام آزادی کے خیالات اور استغنائے طبع کا، اور اس خواہش کا کہ کسی بعید اور مجہول مستقبل میں اُن کے ملک کو اب سے بڑے پیمانہ پر خود مختاری حاصل ہو۔ حالاں کہ ایسی خواہش بعض لوگوں کے خیال میں بغاوت کے ہم پلہ ہے۔ ان عقائد میں بہت سے بھوسی کے اندر چھپا ہوا، اور دبا ہوا اصلیت کا ایک ہی دانہ ہے وہ یہ کہ آج کل اس کی ضرورت ہے کہ چند اشخاص ایسے موجود ہوں جن کو انگریزی یا فرنچ یا جرمنی جیسی کہ حالت ہو) اس قدر

معلوم ہو کہ وہ جدید خیالات کا اپنے ملک کی زبان میں خواہ وہ ایشیائی ہو خواہ یورپین ترجمہ کرسکیں جس طور پر انگلستان یا امریکہ میں فرنچ یا جرمن قوموں کا کوئی جدید انکشاف مثلاً ایکس ریز (یعنی شعاہائے مخفی) دوسرے ہی روز ہر ایک فرد بشر کی ملکیت ہوجاتی ہے ایسے ہی وہ دوسرے ہفتے یا دوسرے مہینے میں ہندوستان یا چین کے باشندوں کی ملکیت ہو جاتا ہے۔

خیالات کا پھیلانا کسی خاص زبان کا کام نہیں ہوتا۔ ہر ایک ملک میں اس کی اشاعت کا ذریعہ اُسی ملک کی دیسی زبان ہوا کرتی ہے نہ کہ غیر ملک کی زبان جس پر فقط معدودے چند حاوی ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک سے زیادہ زبانیں ایسی ہیں جن کو اس کی صلاحیت ہے کہ انسان کے غور و خوض اور جد و جہد کے ہر ایک صیغہ کے خیالات کو ادا کرسکیں۔ اور جن کو وہ روزانہ کتابوں اور رسالوں اور ہر قسم کے اخباروں میں ادا کر رہے ہیں۔ حد درجہ فصیح اور بلیغ تقریریں ان تمام مضامین پر جن کا گمان بھی کیا جاسکتا ہے ہر روز ہندوستانی، بنگالی، مرہٹی اور دیگر مقامی زبانوں میں کی جاتی ہیں۔ آج کے مجمعوں میں ہم کو بھی اس قسم کی بعض تقریروں کا سننا نصیب ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ہر قسم کے اخباروں اور روزنامچوں میں مختلف زبانوں میں ایسے مضامین نکلا کرتے ہیں جن میں ان سب موضوعوں پر بحث ہوا کرتی ہے۔ جو روزانہ تمام دنیا کو آشفتہ کردیتے ہیں۔

یہی وہ مختلف صوبے ہیں جن کے ذریعہ سے ہر قسم کے خیال کی خواہ وہ بُرا بھلا یا بین بین ہو اشاعت ہوا کرتی ہے نہ کہ ایک غیر زبان کے ذریعہ سے حقیقت حال یہ ہے کہ بہت اعلیٰ درجہ کا اور بہت عملی قسم کا علم اور تیز تبحر اور ادب بغیر انگریزی یا کسی اور یورپین زبان کی مدد کے حاصل کرنا ممکن ہے اپنی خوش نصیبی سے مجھ کو تین چار ایسے بزرگواروں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ادب و تہذیب اور لیاقت دونوں میں لاثانی ہیں۔ ان میں سے کوئی انگریزی نہیں جانتا تھا سوائے ایک کے جس نے آخری عمر میں کسی قدر اس کی تحصیل کی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ اس قسم کی کلیتہً جدید انگریزی تعلیم کے زیر سایہ جو ہم کو اس ملک میں میسر ہے ادب اور تہذیب و تمدن نظر نہیں آتے۔ یہ بات قابل یادداشت ہے کہ علی گڑھ کالج کا بانی انگریزی داں نہ تھا اور عہدۂ سکریٹری پر اس کے "بہت ممتاز جانشین" بھی اس زبان سے ناواقف تھے۔ اُن کو اپنے منصب میں وقت فقط اُن تعلقات میں پڑی جو غیر اُردو داں انگریزی پروفیسروں کے ساتھ تھے۔ ورنہ اُنھوں نے علیگڑھ کالج کے معاملات کا نظم ونسق نہایت لیاقت سے کیا۔ اور قومی اور ملکی سیاست (پالٹیکس) میں بھی اُسی لیاقت سے حصہ لیا۔ اگر اس بات کا مزید ثبوت درکار ہو کہ ہندوستان کی زبانیں علاوہ علم و لیاقت پیدا کرنے کے زندگی کے عملی کاروبار کے لئے بھی کافی ہیں تو ہم کو فقط

اس کی ضرورت ہے کہ ہم ہندوستانی ریاستوں کے انتظام پر ایک نظر ڈالیں جو بالکل دیسی زبان میں ہوا کرتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ مغلوں کے زمانہ کے باقی ماندہ بہت سے عربی اور فارسی کے الفاظ ہو بہو برٹش انڈیا کے سررشتہ مالگزاری کے انگریزی لغات میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ بات کہ انگریزی زبان باغیانہ خیالات کو اس ملک میں پھیلانے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ایسی ہی کہ عقل سلیم اور عملی تجربہ دونوں اس کے تسلیم کئے جانے کے خلاف ہیں۔ کسی قسم کا خیال کیوں نہ ہو اگر وہ لوگوں کی اپنی زبان میں ظاہر کیا گیا ہو تو اُس کو بے انتہا بڑا گروہ سمجھ سکے گا۔ اور باغیانہ خیالات خواہ وہ تحریری ہوں یا تقریری اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں کئے جا سکتے۔ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے میری غرض یہ ہے کہ میں دکھادوں کہ یہ خیال کہ اس ملک کے لوگوں کے لئے انگریزی پڑھنا سیاسی (پولٹیکل) وجوہات سے برا ہے ایسے اوہام پر مبنی ہے جو غلط ہیں۔

دوسرا غلط خیال جو اس قدر رائج ہے اور جس کا رفع کرنا لازم ہے یہ ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو بلا کسی جبر کے اور بالکل اپنی خوشی سے بے انتہا شوق انگریزی سیکھنے کا ہے۔ شاید صرف اس نیت سے کہ ہم اس زبان کا خون کریں یا خاص یہ ارادہ کر کے کہ ہم اینگلو انڈینس کی دل آزاری کریں کیونکہ وہ تعلیم یافتہ فرقے سے جلتے بہت ہیں حقیقت حال تو سب جانتے نہیں اور وہ یہ ہے کہ انگریزی عملداری اور انتظام سے جو حالت پیدا ہوگئی ہے اس کی ضرورتوں نے انگریزی کا سیکھنا ہم پر لازم کر دیا ہے جن وجوہات سے ہم کو انگریزی کا سیکھنا ضرور ہو گیا ہے۔ اُن میں سے بعض کا یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک تو یہ وجہ ہے کہ جناب وائسرائے صاحب بہادر کی قانون ساز اور انتظامیہ کونسلوں میں سب مباحثے انگریزی میں ہوا کرتے ہیں۔ اور قانون کا مسودہ اور اجرا بھی اُسی زبان میں ہوتا ہے۔ اگر جناب وائسرائے یا ممبران کونسل یا مختلف صیغوں کے سکریٹری صاحبوں سے کوئی زبانی عرض معروض کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے لئے بھی انگریزی لازم ہے۔ عدالتوں میں بھی ہائی کورٹ سے لیکر تقریباً سب سے نیچی عدالت تک اور کبھی سب سے نیچی عدالت میں بھی مباحثے اور فیصلے انگریزی میں ہوا کرتے ہیں اور ان عدالتوں میں جج یا بارسٹر یا وکیل یا محرّر بننے کے لئے انگریزی دانی لابدی ہے مختلف سرکاری فوجی اور ملکی محکموں کے اعلیٰ عمال کے لئے بھی اس کی ضرورت ہے۔ مثلاً محکمہ حسابات پوسٹ آفس۔ ٹیلیگراف، ریلوے تعلیم۔ انجنیری۔ کامسریٹ، ٹرانسپورٹ وغیرہ۔ انھیں محکموں کے ادنےٰ سے ادنےٰ نویسندہ عملے کے لئے بھی انگریزی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اُن کو چھپے ہوئے انگریزی نقشوں اور کتابوں کی خانہ پُری کے سوائے اور بہت کم کچھ کرنا پڑتا ہے۔

علاوہ بریں بڑے بڑے تجارتی کارخانوں کو لیجیئے۔ مثلاً بنک یا دوسری شرکتیں جن کو انگلستان اور دیگر ہندوستان کے کارخانوں سے تجارتی تعلق رہتے ہیں۔ ان سب میں خط و کتابت اور حساب انگریزی میں ہوا کرتا ہے۔ اور ان کو ایسے عملے کی ضرورت ہوتی ہے جو دونوں زبانوں سے آشنا ہوں۔ پس ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی طرح انگریزی کا علم بہت اعلیٰ درجہ سے لے کر جس سے زیادہ کسی غیر ملکی آدمی کے لئے سیکھنا ممکن نہیں ہے۔ بالکل ادنے درجہ تک جس میں خانہ پری کے حرف جان لینا پڑتا ہے۔ برطانیہ کی ہندوستانی حکومت کے ساتھ ملحق ہوگیا ہے۔ بیچارے محرروں پر جن کے بغیر کام نہیں چل سکتا طعنہ زنی یا بابو انگلش یعنی بابو کی لکھی ہوئی انگریزی پر خندہ زنی آسان بات ہے۔ ان لوگوں کے بغیر اس ملک میں انگریزی حکومت کس کشمکش میں پڑ جاوے گی۔ خواہ بی اے ہو یا بی اے فیل - ایف اے یا ایف اے فیل۔ انٹرنس پاس شدہ یا فیل حتیٰ کہ مڈل اسکول والے کو اس سلسلہ عمال میں ایک معین جگہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس پہیئے کے اوپر ایک کھی کا حکم رکھتی ہے یعنی اس کے چلانے میں ہر ایک کی مدد شامل ہے۔ گو وہ کتنی ہی کم کیوں نہو۔ ان لوگوں پر خندہ زنی کرنا یا ان کی تعلیم کو بہت مشکل کر دینا سب سے کم ان لوگوں کو زیبا ہے۔ جو اس طرق کارروائی کے موجد ہونے کی ذمہ داری رکھتے ہیں۔ اگر یہ سب محکمے یا ان میں سے بعض ہندوستان کی کسی جامع زبان میں چلائے جا سکتے تو اس ملک کے نوجوان کس قدر عظیم اذیتوں اور سردردیوں، پراگندگی دماغ، ضعف عضلات، اور ضعف قوائے جسمانی سے محفوظ رہتے۔ مگر بہت سے اسباب ایسے جمع ہوگئے ہیں کہ جن سے یہ انصرام ناممکن ہوگیا ہے اور ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ خود انگریزوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ ہماری زبان نہ سیکھیں گے حتیٰ کہ سررشتہ تعلیم میں بھی یہی حالت ہے جس کے نتائج ہمارے بچوں کی انگریزی زبان سیکھنے کے نہایت مضر ہیں۔ غیر زبان کے حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ درست ہے یعنی ترجمے اور مشق کے ذریعہ سے اور اس ملک میں یہ طریقہ بڑی حد تک ہمارے لئے مسدود ہے۔

گو یہ تو بطور جملہ معترضہ کے تھا جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس کا منشا یہ ہے کہ معمولی انگریز قبل اس کے کہ انگریزی کی تحصیل کو یکقلم گنہگار ٹھہرائیں یا ایسے لوگوں سے جس کو انھوں نے خود اپنی زبان سیکھنے پر مجبور کیا ہے اپنی گہری نفرت کا برتاؤ کریں۔ ذرا غور و تامل سے کام لیں۔ ان کو اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ خود شناسی اور غیرت وحمیت اور رپبلک جماعتوں اور گورنمنٹ کی کارروائیوں کی اور ان کارروائیوں کے ذمہ دار حکام کی نکتہ چینی کی جدید روح کی جڑ انگریزی تعلیم یا صرف انگریزی تعلیم ہی میں ہے اور اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ مغویانہ تحریر یا تقریر کے لئے ویسی ہی زبان زیادہ زرخیز زمین پائی جاتی ہے۔

اور اس کا کہ در حقیقت کوئی معقول وجہ اس کی نہیں ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہندوستانی کو ہندوستان کے طریق حکومت کا عفریت سمجھیں یا اس کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ گویا وہی ایک شخص ہے جو انگریزی حکومت کے ہمدردی پناہ کا مستحق نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اس بات کو حقیقت امر سمجھیں کہ جو تغیرات و تبدلات ہندوستان میں ہمارے اردگرد دکھائی دے رہے ہیں وہ فقط اس تدریج (ڈولپمنٹ) کا نتیجہ ہیں جو مرور ایام کا ایک لازمہ ہے۔ اور نیز دنیا کے مختلف ملکوں کے اُس قربت کا نتیجہ جس نے جدید تبلیغ و ابلاغ کی ذرائع سرعت سے گویا ان کو ایک ہی ملک کے مختلف محلے بنا دیئے ہیں۔ اور اس کا بھی اعتراف کریں کہ صرف ہندوستان مشرقی دنیا کا ایسا حصہ نہیں ہے جس میں یہ تغیرات و تبدلات نمایاں نہیں۔

اگر ہم کو وہ ضرورتیں پیش نہ ہوتیں جو خود انگریزی حکومت نے پیدا کی ہیں تو ہم اپنی تعلیم کو جس میں اعلیٰ ترین تعلیم بھی شامل ہوتی اپنی ہی زبان میں بآسانی و بارزانی حکمی طور سے حاصل کر لیتے۔ اور اس بار گراں سے بھی محفوظ رہتے جو اب ہمارے بہت سے نوجوانوں کے قوائے جسمانی و دماغی کے اوپر مضر اثر پیدا کر رہا ہے اس کے علاوہ جو مضامین کہ وہ خود اپنی زبان میں سیکھتے وہ ان کے لئے ایسے معنی خیز اور کامل اور متین ثابت ہوتے کہ جیسے آج کل ہرگز نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ان کا انگریزی زبان کا علم بھی جس کو وہ اس طرز تعلیم میں بحیثیت زبان دوم (سکنڈ لنگوج) کے سیکھتے زیادہ کامل ہوتا اور اُس میں اتنا انوکھا پن نہ ہوتا جتنا کہ اب کبھی کبھی ہوا کرتا ہے۔

جو کچھ کہ اوپر بیان ہوا وہ میں نے اس امید سے کہا ہے کہ وہ لوگ جن کی رائیں ہمارے حق میں بہت ہی مفید یا مضر ثابت ہو سکتی ہیں اُن کوششوں کو زیادہ کشادہ دلی کی نظر سے دیکھیں جو ہم اس ترقی میں اپنا واجبی حصہ لینے کے لئے کر رہے ہیں جو ہمارے اردگرد ساری دنیا میں ہو رہی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جس مشرق کو لوگ سمجھتے ہیں کہ تبدل پذیر نہیں ہے اس میں سب کچھ بدل رہا ہے سوائے اس نقطۂ خیال اور اُن آراء کے جو اینگلو انڈین لوگوں کی مسائل اور معاملات کے بارہ میں ہے۔ اس رائے سے مجھ کو اتفاق نہیں ہے۔ میں اس امید کرنے کی جرأت کرتا ہوں جس وقت ان کو ان غلطیوں کا اعتراف ہو جائے گا جن پر ان کی موجودہ رائیں اور خیالات تعلیم کے بارہ میں مبنی ہیں تو اُن کے تیور کسی قدر بدل جائیں گے جس کی وجہ سے بدظنی اور بے اعتباری کے وہ ابخرے دور ہو جائیں گے جن میں ہم اس وقت گھرے ہوئے ہیں اور جنھوں نے عملاً ہماری ان اُمیدوں کے نا امیدہ شگوفہ کو مسل ڈالا ہے جو ہم کو دربارہ ایک سند یافتہ (چارٹرڈ) اسلامی دار العلوم کے قائم کرنے کی تھیں۔ اور میں اس امید کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ تیور اُن کے بدلنے سے اس ملک میں ایک زیادہ صاف دل

روشن خیال، زیادہ اعتماد اور بھروسے کی تعلیمی سیاست (پالیسی) عمل میں آجاوے گی یعنی وہ سیاست (پالیسی)، جو ملک معظم کی تقریر سے مترشح ہے۔

اب اگر میں فوراً الحاق کے مسئلہ پر نہیں آجاتا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اس کی اہمیت کا قایل نہیں۔ بلکہ یہ کہ وہ سر دست عملی سیاست (پالیسی) کے احاطہ سے خارج کر دی گئی ہے۔ زیادہ مفید اوّل یہ بحث ہو گی کہ ہم علی گڑھ کالج سے اس کی موجودہ حالت میں کیا کام لے سکتے ہیں اور اس کو کس ترکیب سے تمام ہندوستان میں قوم کے واسطے بیشتر از بیشتر کارآمد کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہاں تک فائدہ کے ساتھ ایک غیر مستند (بے چارٹرد) یونیورسٹی کو بڑھا سکتے ہیں۔ جو فوراً سند یافتہ بن جانے کے لئے طیار ہو۔ اگر ایسا وقت آجائے اور ضرور آجائے گا کہ کوئی وزیر ہند سیاسی نظر میں (پولیٹکل کالیڈاسکوپ) کو ایک پھیرا دے کر صورت حال کو بالکل تبدیل کر دے مگر بالفرض اگر سب وزیر ہند ہمیشہ کے لئے سنگ دل بن جاویں تب ہمارے پاس ایک ایسی تاسیس (انسٹی ٹیوشن) ہو جائیگا جو باوجود اُن نقائص کے جو اس میں گورنمنٹ کے سند نہ دینے سے موجود ہوں گے ایک بہت کارآمد قومی دارالعلوم کا نمونہ ہو۔ پس ہم کو تفصیل کے ساتھ اس کی تفتیش کرنی چاہیئے کہ موجودہ حالت میں ہم کن ذرایع سے علی گڑھ کو ایک غیر مستند یونیورسٹی کی سبیل پر آگے بڑھا سکتے ہیں جو موقع پا کر مستند بن جاسکے مگر دونوں حالتوں میں تمام ہندوستان کے لئے ایک ایسی درس گاہ کا کام دے جو اولاً مسلمانوں کی خاص ضروریات کی کفالت کرے اور انھیں کے قائم مقام اس کا کل انتظام کریں۔ مگر جس کے دروازے سب فرقوں اور قوموں اور مذہب کے لئے کھلے ہوں۔

ایسی یونیورسٹی کی تلاش میں ہمارے لئے یہ بے سود ہو گا کہ ہم دنیا کی موجودہ یونیورسٹیوں میں سے کسی کو نمونہ قرار دیں۔ کوئی خاص نمونہ مثلاً آکسفورڈ یا لنڈن۔ گیٹنگن یا برلن یا پارس ہمارے گوں کا نہ ہوگا۔ ہماری ضروریات ایسی ہیں کہ ان کے حصول کے لئے ہم کو ایک سے زیادہ نمونوں کی خصوصیات کو ملا دینا پڑیگا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم اپنی ضروریات سے واقف ہوں۔

حال کے ایک مصنف (پریزیڈینٹ چارلس فرانکلن تھنگ ایل ایل ڈی) نے دنیا کی کل یونیورسٹیوں کی چار تقسیمیں کی ہیں جن کے حدود فاصل کی تعریف کامل درستی کے ساتھ نہیں ہو سکی۔ کیوں کہ بعض مقام پر ان میں خلط ہو جاتا ہے یعنی ایک ہی یونیورسٹی میں ایک سے زیادہ تقسیموں کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں پھر بھی ان اقسام میں فرق ایسا بین ہے کہ دیکھنے سے بآسانی پہچانی جاتی ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے اور یہی غالباً زیادہ رائج ہے جس کا مقصد ہوتا ہی حقیقت کو دریافت کرنا، اور اس کو اشاعت دینا اس قسم کے

مدرسے علمیت اور تبحر کے فدائی ہوتے ہیں۔ تجربہ خانے (لابورٹیری) اور کتب خانے اُن کے اوزار ہوا کرتے ہیں اور اُن کا طرزِ عمل مشاہدہ ہوتا ہے۔ جن یونیورسٹیوں کے اوپر "جرمن" کے نام کا اطلاق ہوتا ہے (اور اس لفظ کو جغرافیہ سے اس قدر تعلق نہیں ہے جس قدر کہ تمدنی حالت سے) وہ اس تقسیم کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہ زمانۂ حال کی اعلیٰ تعلیم کی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی طرق کا نمونہ ہیں۔"

دوسری تقسیم جس کے نمونے اسکاٹ لینڈ اور امریکہ کی یونیورسٹیاں ہیں سب سے اول قوت متخیلہ کے زور سے اخلاق پیدا کرنے کی جویاں رہتی ہیں۔ علمیت کو اس گروہ میں بھی جگہ دیجاتی ہے مگر نہ اس قدر تسلّط کے ساتھ ان کا مدعا زیادہ تر دماغی اور اخلاقی ہوتا ہے۔ اور شخصی یعنی ہر شخص سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔

تیسری قسم کا اصل مقصد جنٹلمین یعنی شریف طینت انسان بنانا ہے جس میں دماغ۔ دل، ایمان ارادہ اور قوت ممیزۂ حسن اس طرح پر آپس میں مخلوط اور ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ وہ ہر صحبت اور جلسہ میں بے تکلف ملنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اس گروہ کے نمونے آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں۔

چوتھی قسم وہ ہے جو قابلیت والے انسان پیدا کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ اس قسم کی یونیورسٹیاں ایسے فارغ التحصیل (گریجوایٹ) پیدا کرنا چاہتی ہیں جو روٹی کمانے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ بجنسہ اسی طور پر جیسے انجینئرنگ اور طب کے پیشہ سکھانے والے مدرسے۔ ایسی یونیورسٹیاں خصوصاً مشرق اقصیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان۔ چین اور جاپان میں۔ مگر ذرا ڈاکٹر ٹھٹنگ کے تتمہ کے پُر درد الفاظ کو سنیئے۔ وہ کہتے ہیں " اس کا سبب تلاش کرنے کو دور نہیں جانا پڑے گا۔ معاش کے ذرائع اتنے قلیل ہیں، فاقہ کشی اور محض سدِ رمق کے مابین فاصلہ اس قدر کم ہے کہ ہر ایک ایسی قوت سے کام لینا پڑتا ہے، ہر ایک ایسے طریقہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے خوراک میں ایک ٹکڑے کا اضافہ ہو سکے یا پوشاک میں ایک دھاگہ کا۔ اس جنس کی لیاقت پیدا کرنے والی یونیورسٹیاں ٹوکیو اور کلکتہ اور پیکنگ میں واقع ہیں۔"

ہمارے علی گڑھ کی یونیورسٹی میں خواہ وہ سند یافتہ یا غیر سند یافتہ ہوں ان چاروں نمونوں کی خاصیتوں کا اجتماع اور ان پر کچھ اس کی اپنے مخصوص رنگ ڈھنگ کا اضافہ ہونا چاہیئے اور ہماری ضرورتوں کا ملک معظم کے الفاظ سے بڑھ کر کونسا ہدایت نامہ ہو سکتا ہے جہاں پر وہ فرماتے ہیں کہ "اس زمانہ میں کوئی یونیورسٹی مکمل قرار نہیں دی جاسکتی تا وقتیکہ اُس میں علوم اور فنون کے ہر اہم شعبہ کی تعلیم کا سامان مہیا نہو اور تا وقتیکہ اُس میں نئی تحقیقاتیں کرنے کا پورا موقع نہ دیا جائے

آپ کو علوم قدیمہ کا ایفا بھی ضرور ہے اور اس کے ساتھ مغربی علوم کی ترقی میں سعی وافر کرنا ہے آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ طلبا ء میں اخلاق حمیدہ (کیرکٹر) پیدا کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر تعلیم بالکل بے سود ہوتی ہے'' اور پھر فرماتے ہیں کہ ''اپنے حوصلوں کے تخیل (آیڈیل) کو بلند رکھئے اور اُن کے حصول میں بلا وقفہ کوشش جاری رکھئے۔'' اگر ہم اس پر مذہبی تعلیم کی ضرورت کا اضافہ کر دیں جس کا اعتراف سب نے ایسے پورے طور پر کیا ہے اور جو اخلاق حمیدہ پیدا کرتے ہیں ایک لابد عنصر ہے تو ہم کو علی گڑھ کے مستقبل کے لئے ایک پورا ہدایت نامہ حاصل ہو جاتا ہے۔

جس حالت میں کہ ہم اپنی قسمت کے پیٹنے کے انتظار میں بیٹھے ہیں ہم علی گڑھ کو ان تمام پہلوؤں سے ترقی دے کر مکمل کر سکتے ہیں اور ہمارے حوصلوں کا تخیل (آیڈیل) یونیورسٹی کے بارہ میں ہی اس سے بہت قریب تر لا سکتے ہیں۔ مگر اس وقفہ میں جو کہ ہمارے لئے نہایت جانفشانی کا زمانہ ہوگا ہماری محنتیں اور کوششیں صرف علی گڑھ تک محدود نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ ایک ہی ان میں تمام ہندوستان پر ان تاسیسوں (انسٹی ٹیوشنوں) کی تعمیر میں صرف ہونی چاہئیں جو اس صورت میں کہ آپ کے حوصلوں کا تخیل بدل کر حقیقت امر ہو جائے۔ قانونی طور پر علی گڑھ کی یونیورسٹی سے جو اُن کی مادر مہربان ہوگی ملحق ہو جاویں گی۔ مگر درحقیقت ان تاسیسوں کا الحاق اُن کے اجرائے کے اول روز سے شروع ہو جانا چاہئے۔ یہ الحاق دل وجان کا یعنی روحانی الحاق ہوگا۔ نہ کہ قانونی۔ ہر درسگاہ میں علی گڑھ کو ہر بات میں اپنا نمونہ قرار دیں گی۔ مثلاً باشندگی کا دستور (ریذیڈنشل سسٹم) اتالیقی طریقہ ٹیوٹوریل سسٹم مذہبی تعلیم۔ علمی اور عملی دونوں قسم کی کھیل کود اور آپس کی یکجہتی۔ اگر ان درسگاہوں کی تعلیم ماٹریکیولیشن یا انٹرمیڈیٹ سے آگے نہ ہو تو ان کے پاس شدہ ابتدا سے علی گڑھ کی غیر سند یافتہ یونیورسٹی میں ایف اے یا بی اے کلاس میں داخل ہو جایا کریں گے۔ لیکن اگر وہ خود بی اے تک کی تعلیم دیتے ہوں تو سر دست ان کا الحاق روحانی بھی رہے گا۔ پھر بھی وہ اپنے گریجوٹیں کو علی گڑھ میں فارغ التحصیل لوگوں کی کلاس میں شریک ہونے کو اور جدید علمی تحقیقات کا کام کرنے کو بھیج سکتے ہیں اور سب سلسلوں سے جن کا ذکر میں تفصیل کرونگا وہ علی گڑھ کی زندگی اور روایات میں پورا حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ تو آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ یہ کالج اور اسکول جو تمام ہندوستان کے طول وعرض میں منتشر ہوں گے۔ ان کا الحاق ہر حالت میں بالکل ان کی رضامندی پر موقوف ہوگا۔ بالفرض اگر گورنمنٹ ہم کو سند معہ الحاق کے کامل اختیار کے دیوے یہ امر اُن اسکولوں اور کالجوں کی مرضی پر موقوف ہوگا کہ آیا وہ علی گڑھ کے ساتھ ملحق ہونا پسند کریں گے یا نہیں۔

اب جس اثناء میں ہندوستان کے اسلامی اسکول اور کالج اُگتے جاویں گے اور جڑ پکڑتے جاویں گے اسی اثناء میں علی گڑھ کو نہ صرف زیادہ رسیدہ اور پختہ ہوتا ہے بلکہ اس کو بے انتہا توسیع کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ اُن درس گاہوں کو ملحق کرنے اور اپنی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے اور یہ ایسا کام ہے جس میں سالہا سال لگ جاویں گے بلکہ پشتیں۔ علی گڑھ کو جو کام درپیش ہے اُس کی عملی تفصیلات تو میں ذرا دیر میں بیان کروں گا۔ مگر اس مقام پر اس قدر کہنا ضروری ہے کہ جو تیس لاکھ کے قریب روپیہ ہم نے جمع کیا ہے اُس سے تو ہمارا کام بہت کم چلے گا۔ ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی کوششوں کو دو چند کریں اور جب تک کہ ہمارے پاس پورا کروڑ روپیہ نہ ہو جائے ہم دم نہ لیں خواہ سند (چارٹر) ملے یا نہ ملے۔ علی گڑھ کو ایک اول درجہ کے اور زمانۂ حال کے شایاں تعلیمی تاسیس (انسٹی ٹیوشن) بنانے کے لئے جو تمام ہندوستان کے واسطے نمونہ ہو جائے۔ ہم کو جتنا روپیہ مل سکے وہ کم ہے۔ مگر یہ نکتہ کبھی فراموش نہ کیجئے گا کہ یہ کام جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب انتظام قوم کے ہاتھ میں ہو اور کسی محکمہ کی ہچکچاتی ہوئی پس و پیش کرتی ہوئی سنگ دلانہ پالیسی کے زیر سایہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اب جو تیس لاکھ کا چندہ یونیورسٹی فنڈ میں دیا گیا ہے اس کی نسبت تو میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کونسا معقول عذر ممکن ہے۔ اس میں کہ وہ روپیہ اُن کاموں میں صرف ہو جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یونیورسٹی فنڈ کوئی کل پرسوں کی بات نہیں ہے۔ اس کی ابتدا کو بہت برسوں کا عرصہ ہو گیا۔ اور اس کا چندہ چھوٹی چھوٹی رقموں میں آتا رہا۔ یہاں تک کہ ہز ہائنس سر آغا خاں بالقابہ نے اپنی کوششوں اور اپنی ذات بابرکات کی خصوصیتوں سے اس تحریک میں ایک جان ڈال دی۔ مگر جناب موصوف کی مداخلت کے قبل بھی اور بعد بھی غرض یہی تھی کہ علی گڑھ کالج کو بتدریج ایک ایسی یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچا دیا جاوے جس کی خواہش سرسید کو اُن کے بیٹے کو جو ان کے جانشین بھی تھے اور تمام اسلامی فرقہ کو تھی۔ یعنی ایک خود مختار باشندگی والی (رزیڈنشل) تاسیس (انسٹی ٹیوشن) کے درجہ کو جو ہر طرح پر گورنمنٹ کی وفادار ہو اور جس کو گورنمنٹ کے بہتیرے الجھے ہوئے تعلیمی مسائل سے دلچسپی ہو اور جن کے حل کرنے میں وہ بخوشی مدد دینے پر آمادہ ہو۔

بعض اوقات لوگ یہ کہتے ہیں کہ اب ہماری قوم میں ابتذال آگیا ہے۔ مگر اس میں مجھ کو شک ہے کہ ہماری قوم میں بھی اس درجہ میں سخاوت اور حب وطن سے مبرا لوگ نکلیں گے کہ وہ اپنا چندہ اُس وقت بھی واپس مانگیں جس وقت اُن کی سمجھ میں یہ بات آجاوے گی کہ ہم اُس کو اُسی استعمال میں لانا چاہتے ہیں جس کے لئے وہ روز اول سے نامزد کر دیا گیا تھا۔ یعنی علی گڑھ کو ایک ایسی یونیورسٹی کی حیثیت تک پہنچانے کے

لئے جو تمام ہندوستان کی اسی طور پر خدمت کرے جیسے کہ کالج کرتا آیا ہے۔ مگر اس سے زیادہ قابلیت کے ساتھ۔

الحاق کے مسئلہ کی نسبت اوّل تو مجھ کو علم ہوا ہے کہ قوم نے اس اصول کو بالکل مان لیا ہے کہ ہماری یونیورسٹی تعلیم دینے والی یونیورسٹی ہو گی اور اگر اس کے ساتھ اور کالج الحاق ہو تو وہ بھی باشندگی کے طریق (رزیڈنشل سسٹم) پر اور علی گڑھ کے نمونہ پر چلائے جاویں گے فقط امتحان لینے والی یونیورسٹی کا خیال یورپ سے بالکل اُٹھ گیا ہے۔ یونیورسٹی کے مفہوم اور اغراض کا جو جدید تصور ہے اُس سے اس کو کلی مغائرت ہے۔ اب اس کا اعتراف ہو گیا ہے کہ کتابیں علم کے تبلیغ کے ذرائع میں سے ایک ہی ذریعہ ہیں۔ اور وہ بھی کچھ مفلوک سا۔ اصلی علم دو ہی وسیلوں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک تو اُستاد کی زبانی تعلیم اور اُس کی صحبت سے اور دوسرے اپنے ہم عمر اور درجہ اور لیاقت میں برابر طلبہ کی صحبت اور روزانہ خلط ملط اور دوستی سے یہ باتیں بجز تعلیم یونیورسٹی کے اور کہیں نہیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ خود لندن یونیورسٹی جس کی نقل ہندوستان میں اُتاری گئی نہایت ثابت قدمی اور جاں فشانی سے ایسے جادہ پر قدم زن ہے کہ جس سے وہ فقط ممتحن یونیورسٹی ہونے کے عوض تعلیم دہ اور تربیت دہ یونیورسٹی کے رتبہ کو پہنچ جائے اور کلکتہ کی یونیورسٹی اسی کے قدم بقدم چل رہی ہے جن وجوہات کی بنا پر سر سید علی گڑھ میں یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے اُن میں سے ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ یونیورسٹیاں صرف ممتحن جماعتیں ہیں اور یونیورسٹی کے لفظ کے اصلی مفہوم کا اطلاق ان پر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس مضمون پر جو سب سے تازہ شگوفہ کھلا ہے وہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم کے ایک معتدبہ حصہ کی خواہش یہ ہے کہ اگر بالفرض ہم ہندوستان کو ماسوا روس کے تمام یورپ کے برابر قرار دیں تو وہ ایک ایسی آکسفورڈ کے طلب گار ہیں جس کے کالج نہ فقط اُس شہر میں بلکہ تمام یورپ میں واقع ہوں اور ان سب کا انتظام اور اختیار اسی ایک مرکزی صاحب اختیار جماعت کے ہاتھ میں ہو جو دریائے آیسس کے کنارہ پر اپنے اکلوتے چانسلر کی ماتحتی میں کام کرتی ہے۔ یہ کہنا فضول ہو گا کہ اس وقت میں ایسی کوئی یونیورسٹی دنیا کے پردہ پر موجود نہیں ہے۔ اگر یہ امتحاناً قائم کی جائے تو خواہ یورپ میں ہو یا ایشیا میں اتنے بڑے پیمانہ پر ہو سکے گی جس کو آسمان فرسا کہنا چاہئے۔ صرف اس کی جغرافی وسعت اتنی ہو گی کہ قرینہ یہ ہے کہ ان چیزوں کے دائرہ سے خارج ہو جس کا عمل درآمد ممکن ہے۔ بالفرض اس کا تجربہ یورپ میں بھی کیا جائے جہاں ایسے لوگوں کی کچھ کمی نہیں ہے جن میں اعلیٰ درجہ کی دماغی اور انتظامی قابلیت موجود ہے اور جن کو اس کی فرصت

بھی ہے کہ رفاہ عام کے کاموں میں اپنے کو فدا کردیں تو بھی اس کی کامیابی مشکوک ہوگی۔ ہندوستان میں جہاں ایسے لوگوں کی قلت دردناک طور پر نمایاں ہے اس قسم کی آزمائش کی قسمت میں ناکامیابی پہلے ہی سے لکھی ہوگی۔ مگر پھر بھی اپنے حوصلوں کے تخیل (آئیڈیل) کے طور پر مجھ کو ایک ایسی یونیورسٹی کو اپنا مدعا بنانے میں کچھ عذر نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو یاد رکھیں کہ ہم ایسے تخیل تک ایک ہی جست میں نہیں پہنچ سکتے۔ اگر اس قسم کی یونیورسٹی ممکن الوجود بھی ہو تو رومی دیوتا منروا کی طرح جیوپیٹر کے سر سے پورے طور سے مسلح اور آراستہ پیراستہ نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس کی تعمیر کے لئے صبر ایوبی درکار ہے۔ اور بے انتہا کوہ کنی کی ضرورت ہے۔ پھر اگر منزل مقصود تک پہونچی بھی تو بیچ کی منزلیں بہت دور دراز اور بہت کٹھن ثابت ہوں گی۔ تمام ہندوستان اور علی گڑھ میں ایک ہی وقت میں کام جاری رکھنا ہوگا۔ اور جس کو میں نے روحانی الحاق کہا ہے۔ پہلے اس کو اسلامی درسگاہوں میں پیدا کرنا پڑے گا۔ اگر اس سنگلاخ سفر کی ایک منزل کے طور پر اور اپنے حوصلوں کے تخیل (آئیڈیل) کی تلاش میں ایک جسمانی زادراہ کی حیثیت سے علی گڑھ میں ایک مقامی یونیورسٹی قبول کرلیں تو میری دانست میں کچھ مضائقہ کی بات نہیں ہے۔ گویا ہم کو ایک ایسا اکسفورڈ ملتا ہے جس کی شاخیں ابھی تمام مغربی یورپ میں نہیں قائم ہوئی ہیں۔ تاہم وہ آکسفورڈ تو ہوگا یعنی ایک ایسی تاسیس (انسٹی ٹیوشن) جو نہایت بکار آمد اور قابل قدر ہوگی بشرطیکہ اُس کا انتظام ہمارے اپنے ہی ہاتھوں میں ہو۔ اگر صاحب وزیر ہند کے لئے کوئی راستہ نکل آئے اور وہ ہم کو ایک ایسی یونیورسٹی عطا کرسکیں جس کو ہم اپنا کہہ سکتے ہوں تو دو تین نہایت قوی وجوہات سے میں مشورہ دوں گا کہ آپ علی گڑھ میں مقامی یونیورسٹی قبول کریں اور اس کو ایک قسط سمجھیں اپنے حوصلوں کے تخیل (آئیڈیل) کی جس کی امید آپ آئندہ کے لئے بے شک جاری رکھیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ سندیں (چارٹر) پتھر کی لکیریں نہیں ہوا کرتی ہیں جو مٹ نہ سکیں۔ اور یہ بخوبی ممکن ہے کہ جس وقت ہماری آئندہ نسلیں یہ ثابت کردیں گی کہ جو اعتماد گورنمنٹ نے ان کے اوپر کیا تھا وہ بے جا نہ تھا تو ان پر زیادہ بھروسہ کیا جائے اور جو اسلامی اسکول یا کالج اس وقت تک وجود میں آگئے ہوں ان کے الحاق کا حق عطا کرکے ان کو اپنی یونیورسٹی کی غایت کو وسعت دینے کی اجازت ملے۔ آپ میں سے بعض صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ خود لندن یونیورسٹی کا نشو و نما نہایت سست چال سے ہوا ہے۔ اس کی بنا اول ۱۵۷۹ء میں سرٹامس گریشم ملکہ الزبیتھ کے وزیر مالیہ نے ڈالی تھی

لیکن آپس میں نااتفاقی کی وجہ سے وہ پنپا نہیں۔ اس کے بعد مشہور شاعر ٹامس کامیل نے ۱۸۲۵ء میں یونیورسٹی کالج بنایا اور لندن یونیورسٹی کا پہلی سند (چارٹر) ۱۸۳۶ء میں منظور ہوا۔ اُس وقت سے جوں جوں اس نے اپنے دائرہ عمل کو وسعت دی ہے اور ایک بالکل ممتحن تاسیس (انسٹی ٹیوشن) ہونے کی عوض تعلیم و تربیت دہ تاسیس ہونے کی کوشش کی ہے اس وقت سے اُس کو کوئی چھ سندیں (چارٹر) مل چکے ہیں۔

زیادہ وسیع سند (چارٹر) حاصل کرنے کے لئے ہم کو یہ دکھانا ضرور ہوگا کہ ہم ایک نسبتاً چھوٹے کاروبار کا یعنی ایک مقامی یونی ورسٹی کا انتظام اقلاً اتنی قابلیت سے کر سکتے ہیں جتنی کہ علی گڑھ کے انتظام میں ہم نے دکھائی ہے اور یہ کہ ہم اس نمونہ کے نوجوان تیار کر سکتے ہیں کہ جن کی اس قدر ستائش سر آکلنڈ کالون۔ سر چارلس کراسٹھویٹ اور گورنمنٹ کے دیگر اعلیٰ حکام نے کی ہے۔ ہم کو یہ دکھانا ہوگا کہ ہماری یونیورسٹی سے بھی جیسے کہ اس وقت تک ہمارے کالج سے نکلتے رہے ہیں بقول ہمارے ملک معظم کے "وفادار، مردانہ مزاج، اور بکار آمد متوطنان ملک تیار ہو کر نکلا کرینگے جو حرفت اور علم کاشتکاری اور زندگی کے ہر مشغلہ میں کسی سے کم نہوں۔"

دوسری وجہ اس کی کہ میں اس محدود سند (چارٹر) کو منظور کرنے پر آمادہ ہوں یہ ہے کہ فی الآن ایسی تاسیس (انسٹی ٹیوشن) جس کو ہم ملحق کر سکتے ہوں بالکل عنقا ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ قبل اس کے کہ ہمارے پاس ایسی تاسیسیں طیار اور ملحق ہونے پر آمادہ ہوں ہم کو بہت کچھ جد و جہد و تیشے کوہ کنی کی اشد ضرورت ہے جس کے لئے سالہا سال بلکہ پشتہا پشت کا زمانہ درکار ہے اور جس کو تمام ہندوستان میں ایک ہی وقت میں جاری رکھنا ہوگا اور اگر علی گڑھ میں اپنی زندگی کے اس نئے پہلو کے لئے قابلیت پیدا کرنا منظور ہو تو وہاں بھی اس قسم کی کارروائی اُس کے استحکام اور توسیع کے لئے درکار ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سر دست الحاق کا معاملہ ایک پرچھائیں ہے اور یہ عقلمندی کے خلاف ہوگا کہ اس پرچھائیں کے لالچ میں ہم ایک اصلیت وار یونیورسٹی سے دست بردار ہو جاویں۔ بشرطیکہ ہم کو اس کے معاملات کے انتظام کا اختیار بلا روک ٹوک دیا جائے۔ اِلّا اس صورت میں اور اُس وقت میں کہ جب ہم نے اپنے کو اپنی ذمہ داری کا نا اہل ثابت کر دیا ہو یا اپنی امانت میں خیانت کی ہو۔

تیسری اور آخری وجہ یہ ہے کہ میں آپ پر ثابت کردوں گا کہ ہماری یونیورسٹی خواہ سند یافتہ (چارٹرڈ) یا غیر سند یافتہ ہو یا بدامی کی حالت میں بھی یعنی جس وقت کہ وہ ایک ہی مقام پر سکون کی حالت میں

ہو گی اور اس کو پروانہ وار ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک پرواز کرنے کی اور اپنے کو شمع علم کے اوپر فدا کرنے کی طاقت ہنوز نہ ہو گی اس آزمائش کی حالت میں بھی اپنے کو نمایاں طور پر تمام ہندوستان کی خدمت کے قابل بنا سکتی ہے۔ اگر ہندوستان اس کی شفقت سے فائدہ اٹھانا قبول کرے۔ مگر پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے مضمون کے عملی حصہ سے دست گریباں ہو جاؤں اور ان عملی کارروائیوں کا ذکر کروں جو ہم کو فوراً علی گڑھ میں اس روپیہ کی مدد سے جو جمع ہو چکا ہے اور جمع ہونے والا ہے جاری کر دینی چاہئیں کیونکہ میں اس کو ایک طے شدہ امر فرض کر لیتا ہوں کہ ہم اپنی کوششوں میں رتی بھر بھی کمی نہ کریں گے تاوقتیکہ ہمارے پاس بنک میں ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو جائے اولاً اس وقت تک سرمایہ کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے اور فقط منافع کو یا اُس کے ایک حصہ کو ضروری اخراجات کے لئے کام میں لانا چاہئے اگر عمارتوں کے لئے روپیہ درکار ہو تو اس کا چندہ خاص طور پر ہونا چاہئے اور اس روپیہ کو اسی کام کے لئے مخصوص کر دینا چاہئے۔ ان حدود کے اندر کارروائی ضروری ہے اور اس میں ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ہماری آنکھیں کھل جاویں گی اور ہم کو معلوم ہو گا کہ سچ تو یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے ہم نے بہت کم جمع کیا اور جہاں یونیورسٹیوں کا معاملہ ہوا کرتا ہے وہاں تیس لاکھ کا منافع کچھ نہیں ہوتا۔

عملی کارروائی کا پہلا قدم جو میں پیش کرتا ہوں وہی ایسا ہے جس میں بہت قلیل رقم یا کچھ بھی نہیں صرف ہو گا میں تحریک کرتا ہوں کہ ہمارے کالج کا نام بدل کر اب "مسلم یونیورسٹی کالج" علی گڑھ رکھ دیا جائے جو ہمارے اس مصمم ارادے کی دلیل ہو گی کہ ہم آئندہ کسی زمانہ میں ایک اسلامی دارالعلوم بنانے کی نیت سے جو پھر بھی نہیں مٹتے ہیں اور یہ نام حال کے نام یعنی محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج سے زیادہ مختصر اور کم بھدا بھی ہے جس کو اب ہمیشہ مخفف کر کے لوگ ایم۔ اے۔ او کالج بنا دیتے ہیں جو دیکھنے میں بھی بُرا لگتا ہے اور ایک معمہ بھی بنجاتا ہے جس کو ہندوستان کے باہر پبلک نہیں سمجھتی ہے اور جس کے واسطے کسی یورپین سے اثناء گفتگو میں بہت کچھ شرح کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ختم ہونے پر وہ مایوس ہو کر اس کے سمجھنے کے ارادہ سے باز آتا ہے۔ ڈاکٹر ھنٹنگ کالج کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں "ہندوستان کے مسلمان علاگارھ (علی گڑھ) میں اپنی تاریخی یونیورسٹی کی اصلاح چاہتے ہیں مگر اس وقت تک نتیجہ بہت کم ہوا ہے۔ جن اسباب نے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی میں رکاوٹ ڈال دی ہے وہ اب بھی موجود ہیں" مسلم یونیورسٹی کالج علی گڑھ کا نام جو میں نے تجویز کرنے کی جرأت کی ہے سادگی کے لحاظ سے بھی قابل تحسین ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ لبوں سے نکلتے ہی فوراً وہ اپنی شرح آپ کر دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب وقت آجائے گا ہم کو صرف لفظ "کالج" اس میں

سے خارج کو دینا پڑیگا۔

قبل اس کے کہ میں یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین اغراض سے بحث کروں اور اس لئے کہ مبادا آپ کو کوئی بے وجہ خدشہ پیدا نہ ہو جائے۔ میں کہے دیتا ہوں کہ نیا علی گڑھ پرانے علی گڑھ کی طرح اس چکی کا کام دیتا رہے گا جس سے سرکار کے مختلف صیغوں اور محکموں کی ضروریات پسکر نکلتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے بہت سے نوجوانوں کے لئے جن کا اور کوئی سدِ رمق نہیں ہے اور جن کے حوصلے منصف یا ڈپٹی مجسٹریٹ کی کرسی سے اعلیٰ طبقہ کو پرواز نہیں کرتے ذریعۂ معاش بھی پیدا کرتا رہیگا۔ ہماری یونیورسٹی کو ہر ایک ایسے طریقہ سے کام لینا پڑے گا جس سے ہماری مفلوک الحال قوم کی خوراک میں ایک ٹکڑے کا اضافہ ہو سکے یا پوشاک میں ایک دھاگے کا۔ مجھ کو معلوم ہے کہ کسی یونیورسٹی کے بارہ میں حوصلوں کا ایسا تخیل (آیڈیل)، وہ نہیں ہے جو اگلے زمانہ میں تھا یا جس کا اب بھی دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ ”علم کی غایت علم ہی ہونی چاہیئے“ ایک ایسی شریعت ہے جس کا وعظ اب بھی بڑے وسیع پیمانہ پر ایسے اوقات میں ہوا کرتا ہے کہ جب کسی نئی یونیورسٹی کا افتتاحی جلسہ ہوتا ہے یا کسی پرانی یونیورسٹی میں کوئی بڑی تقریب۔ اس کو اخبار ہمارے کانوں میں بھرا رتے ہیں اور اپنے زعم میں اپنے کو نہایت صالح اخلاق والے سمجھنے لگتے ہیں۔ ذوالقدر اور ذوالجلال لوگ اپنے اعلائے علیین سے اس کی نسبت پر جوش تقریریں کرتے ہیں۔ اس ملک میں تو یہ کہانی کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہ فقط ایک زاہدانہ آرزو باقی رہ گئی ہے اور ایک ایسا مقولہ جو اب بے معنی ہو گیا ہے اقلاً مغرب میں اور جو اب سے زیادہ مسعود اگلے زمانہ میں تبرک کے طور پر ہم تک پہنچا ہے پرانے زمانہ میں اس کا فخر کیا جاتا تھا۔ کہ منفعت کا خیال بھی علم کے لئے موجب توہین ہے اور اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں نے طبابت اور مہندسی اور علم زراعت کی تعلیم کا انتظام کر دیا ہے اور مانچسٹر اور لیڈس کی یونیورسٹیوں کو بہت کم اوقاف یا عطیہ ملتے اگر انھیں فن تجارت اور حرفت کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام نہ کر دیا جاتا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ تعلیم کی سوداگری کی جو جدید روح ہے اس نے علم کے میدان میں حوصلوں کے اعلیٰ ترین تخیل (آیڈیل) کو برباد کر دیا ہے اور یہ روح سب ملکوں سے زیادہ انگلستان میں یعنی دنیا کی تجارت کے مرکز میں پھیلی ہوئی ہے۔ آکسفورڈ میں یونانی زبان کی جبری تعلیم کا پورا قضیہ زمانہ کی روح کی دلیل ہے۔ کیمبرج کے کسی انڈر گریجویٹ کو عربی سیکھنے کی ترغیب دینا محال ہے الا اس صورت میں کہ وہ پہلے سے گورنمنٹ میں کسی عہدہ پر نامزد کر دیا گیا ہو۔ مشرقی علوم کا کالج جس کے لندن میں قائم کرنے کی تجویز ہو رہی ہے اُس کے وجود کا امکان بھی اس وجہ سے ہوا ہے کہ اس میں تجارتی اغراض کے لئے زبانوں کی تعلیم دی جاوے گی۔

انگلستان میں علم کے ہر ایک تولہ کا معاوضہ پونڈ شلنگ اور پینس کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر میں اس کی مثالیں دے کر آپ کی تضیع اوقات نہیں کرنا چاہتا۔ تعلیم کے بیوپار کی اس روح نے ہندوستان پر بھی چڑھائی کی ہے اور یہی وجہ ہے یا اقلاً یہ ایک وجہ ہے اس کی کہ جو حرمت استاد کی شاگرد کو ہونی چاہئے اس میں ہم بعض اوقات کمی دیکھتے ہیں جس کا ہم سب کو قلق ہے۔ اگلے زمانہ میں بشرطیکہ استاد کو کوئی ذریعہ معاش ہوتا تھا۔ یا علم کا کوئی مربی اپنے کو اس کی خوراک اور پوشاک کا ذمہ دار کر لیتا تھا اس کو کسی اور اُجرت کی توقع نہیں ہوتی تھی بجز نام اور شہرت کے۔ اپنے شاگردوں کو وہ بیٹوں کی برابر سمجھتا تھا۔ اسی طرح پر دہلی، لکھنؤ اور بنارس کی مسجدوں اور مندروں اور ذاتی مکانوں میں لوگ اپنے کو شاگردوں پر وقف کر دیتے تھے۔ جیسے کہ آج مصر کی یونیورسٹی الازہر میں ہو رہا ہے اور جیسے کہ یورپ میں خانقاہوں کی علمیت کے زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ شاگرد اُس زمانہ میں استاد کی ہر ایک خدمت کو جس کی ان کو اجازت ملتی تھی خواہ وہ کیسی ہی ادنےٰ درجہ کی کیوں نہ ہو اس کی شفقت کی نشانی اور اپنا فخر سمجھتے تھے۔ ہم مسرت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اس ملک میں اب بھی یہ روح ایسے مقاموں میں باقی ہے جہاں معقول اُستاد اور شائستہ شاگرد اکھٹا ہو جاتے ہیں۔ مگر عمدہ ترین نتائج اسی وقت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب ایک طرف تو کسی قدر دل سوزی شاگرد کی بہبودی کا خلوص دل سے خیال اور کام میں کسی قدر گرمجوشی درکار ہے اور دوسری طرف سے تادیب یافتہ (ڈسپلنڈ) دل جس کی تادیب گھر پر بھی اور اسکول میں بھی باقاعدہ تربیت کے ذریعہ سے ہوئی ہو۔ جہاں کہیں کہ تعلیم میں سوداگری کی روح شدت کے ساتھ غالب ہو جاتی ہے اس قدر روپیہ کے عوض میں اتنے گھنٹہ کام کسی طرح پر بھی کر دیا جائے۔ وہاں حرمت کی روح اکثر فنا ہو جاتی ہے۔ انگلستان کے عمایدیہ شکایت کرتے ہیں کہ یہ روح اکسفورڈ اور کیمبرج سے جاتی رہی ہے۔

ہندوستان سے زیادہ کسی ملک میں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ متعلم کو علم سے روپیہ پیسے کی صورت میں نفع حاصل ہو۔ بقول ڈاکٹر تھئینگ کے "اس کا سبب تلاش کرنے کو دور نہیں جانا پڑے گا۔ معاش کے ذرائع اتنے قلیل ہیں۔ فاقہ کشی اور محض سد رمق کے مابین فاصلہ اس قدر کم ہے" علاوہ بریں دنیا میں کوئی اور ملک ایسا نہیں جہاں اتفاقات کا زور آدمی کو خواہ مخواہ سرکاری نوکری کرنے پر اس قدر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر انگلستان میں کسی اوسط نوجوان متعلم سے یہ سوال پوچھئے کہ تم کیا پیشہ اختیار کرو گے۔ تو غالباً یہ معلوم ہوگا کہ وہ مہندسی (انجنیرنگ) کے ایک نہ ایک شعبہ کے لئے تحصیل کر رہا ہے اور جب اس کا درس پورا ہو جائے گا تو اُس کا اسکول یا کالج یا خود

اس کا باپ، جو شاید خود بھی انجینیر ہو، اس کو کسی ریلوے یا لنگر گاہ کی تعمیر یا معدنیات کی کان یا ایک نہ ایک انجنیری کارخانہ میں خواہ وہ سول یا مکانیکل یا الکٹریکل ہو یا تو نوکری دلادے گا یا شاگردی کی جگہ (اپرنٹس شپ)، کہ اس طرح کی آزاد نوکری جو ہمارے یہاں کے نوجوانوں کو میسّر نہیں ہے۔ انگلستان میں لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہے کہ ہماری گورنمنٹ بعض لحاظ سے ایک بڑھی چڑھی سوشلسٹ گورنمنٹ ہے۔ اس ملک کی ریلوے اور تار برقی تقریباً تمام اور بہتیرے انجنیری کے کارخانہ سرکار کے ہاتھ میں ہیں اور جو لوگ ان میں ملازمت چاہتے ہیں ان کو سرکاری نوکری اختیار کرنا ضرور رہے۔ ان کے علاوہ وہ انجنیری کے کارخانے، جو یورپین شرکتوں (کمپنیوں) کے اپنے ہیں۔ ان میں وہ عہدہ دار براہِ راست انگلستان سے بلاکر رکھتے ہیں۔ انگلستان میں انجنیر کے لئے غیر سرکاری ملازمت کے دروازے بے شمار کھلے ہوئے ہیں۔ اور اُس کی ترقی کا پایہ بالکل اس کی اپنی لیاقت پر موقوف ہے۔

انگلستان کے نوجوانوں کے لئے ایک اور پیشے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ یعنی ڈاکٹری کا جس میں ہمارے نوجوانوں کے لئے اگر وہ اپنے ذاتی طور پر معالجہ کرتے ہوں بہت سے سنگ راہ واقع ہیں۔ اس پیشہ میں سول سرجن اور اسسٹنٹ سرجن دونوں گورنمنٹ کے نوکر سرکاری شفاخانہ کے معالجہ کا بالکل اور عام معالجہ کا تقریباً بالکل انحصار کر لیتے ہیں۔ ان کو اپنے عہدوں کی وجہ سے لوگوں کے اوپر ایک قسم کا قابو ہو جاتا ہے اور شفاخانہ کا مطب کلیتاً ان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ان کو عملی تجربہ اور مہارت حاصل کرنے کا ایسا موقع ملتا ہے جو اپنے برتے پر معالجہ کرنے والے کو میسّر نہیں ہوتا۔ جس ہندوستانی نے ڈاکٹری کی ڈگری خواہ اس ملک میں حاصل کی ہو یا انگلستان میں، اس کے لئے یہاں اس قسم کے موقع کا نہ ملنا مقابلہ کے میدان میں ایک بڑا سدِّ راہ ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں شفاخانے گورنمنٹ کے زیر انتظام نہیں ہوتے ہیں۔ کوئی سند یافتہ انسان، جو قابلیت رکھتا ہو، ان کے عہدہ داروں کے ضمن میں تقرر پا سکتا ہے جو شفاخانے کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ان میں ہر ایک نوجوان کو جس میں اوسط درجہ کی قابلیت اور جفاکشی کا مادہ ہو غالباً اس کا موقع ملتا ہے کہ شفاخانے کے اندرونی عہدوں میں سے ایک پر اُس کا تقرر ہو جائے۔ اور اگر اتفاقات مساعدت کریں تو وہ شفاخانے کے مستقل عہدہ داروں میں ملازمت پائے۔ مگر اپنی تعلیم وہ شفاخانہ سے باہر بھی اور شفاخانوں میں بہتیرے عہدے ایسے ہیں جو اس کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور جن میں اس کو اپنے فن میں مہارت اور خود اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور ابتدا میں یہ ایسے ماہرین فن کے زیر نگرانی

حاصل ہوتا ہے جو اس سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ ان وجوہات سے ہندوستان میں بچ کے معالجہ میں خواہ وہ جرّاحی ہو یا طبی، رکاوٹیں بہت ہیں اور پھر اکثر لوگوں کو سرکاری نوکری بھی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ اب یہ بتائیے کہ ہم پر جو علی الدوام یہ طعنہ زنی کی جاتی ہے کہ ہم کو سرکاری نوکری کا ایسا ہوکا ہے جو کبھی فرو نہیں ہوتا۔ کیا ہم اس کے مستحق ہیں؟

حیف صد حیف ہمارے لئے سوائے پیشۂ وکالت کے اور کوئی علمی پیشہ جس میں خود مختاری حاصل ہو نہ رہا۔ کیوں کہ ہم کو پاوری کے پیشہ کا یا اور دو ایک ایسے پیشوں کا جو زیادہ خوش قسمت ملکوں میں رائج ہیں ذکر ہی فضول ہے۔ جو کچھ مجھ کو اس موقع پر کہنا ہے اس میں مجھ کو کسی قدر یہ دقت معلوم ہوتی ہے کہ آغاز سخن کہاں سے کیا جائے۔ بہرحال اول میں آپ کی سرگرم توجہ اس امر کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں بھی اتفاقات ہی کا روزہ ہے جس کی وجہ سے جو لوگ کوئی منفعت بخش اور آزاد پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو بمجبوری قانون کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹری اور انجینرنگ کے پیشے عملاً ہمارے لئے بند ہیں۔ الا سرکاری خدمت کے ان کے نیچے کے درجوں میں جن کی تنخواہیں نہایت حقیر ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انڈین میڈیکل سروس جس کا لندن میں مقابلہ کا امتحان ہوتا ہے ہمارے لئے کھلا ہے۔ مگر اس سے بہت کم لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے واسطے ایک نہایت گراں تعلیم انگلستان میں درکار ہے جس کے بعد ایک بہت ہی سخت اور نتیجہ کے لحاظ سے مشکوک امتحان دینا پڑتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے لئے سب سے کم رکاوٹ کا رستہ قانون کا پیشہ ہے۔

دوسرا امر جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ہندوستان کی ملازمتوں کے سرشتہ میں جو سب سے گراں بہا تحائف و انعام ہیں اُن کے لئے بہت اعلیٰ درجہ کی قانونی لیاقت درکار ہے۔ علاوہ سول سروس کے عہدوں کے جن کے لئے بھی کسی قدر قانونی لیاقت چاہیئے۔ یہ گراں بہا انعام حسب ذیل ہیں۔ والیسرائے کی اور دیگر انتظامی (اگزیکیوٹو) کونسلوں کی ممبری، ہائیکورٹ کی ججی، پریسیڈنسی مجسٹریٹ کا عہدہ، اور شاید اور عہدے علاوہ بریں قانون کا کم و بیش علم گورنمنٹ کے صیغہ عدل گستری (جوڈیشل لائن) کے تمام عہدوں کے لئے درکار ہے مثلاً ڈسٹرکٹ ججی، ڈپٹی مجسٹریٹی منصفی وغیرہ۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ ایک نہایت معمولی بات ہے نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ دنیا کے پردہ میں ہر جگہ کہ جہاں اس قسم کا ایک گراں بہا انعام اس کی آنکھوں کے سامنے معلق کیا جاتا ہے وہاں سو آدمی اس کی حرص میں بازی جیتنے کے لئے مقابلہ پر کمربستہ ہو کر دوڑ پڑتے ہیں۔ پس آپ اس کو بالکل طبعی امر سمجھیں گے کہ جو لوگ ان انعام

کو سامنے لٹکاتے ہیں، جو لوگ علم قانون کی گرم بازاری کے باعث ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک طبعی نظارہ ہوگا کہ ہمارے نوجوانوں میں جو سب سے حوصلہ مند ہیں وہ یا تو اس کو اپنا پیشہ بنانے کو یا زندگی کے مستقل مشاغل کی تیاری کے لئے قانون کی تحصیل میں اپنے کو منہمک کردیں حتیٰ کہ آپ کو اس کی توقع ہوگی کہ وہ لوگ اس قسم کے مقابلہ کو بڑھاوا بھی دیں گے تاکہ ایک بڑی تعداد میں سے آپ کو لایق لوگوں کے انتخاب کرنے کا موقع ملے۔ مگر جب آپ حقیقت حال ملاحظہ کریں گے تو یہ سب کچھ نہ پاویں گے بلکہ اس کے برخلاف ایک عجیب وغریب نظارہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ وہائٹ ہال[1] اور کرامول روڈ کی اطراف سے کر ہندوستان کے اُن بڑے مرکزوں تک جہاں حکومت راں قوم کے باوقعت اور ذی اختیار لوگ اور ہماری قوم کے وہ لوگ جو اُن کے صدائے بازگشت ہوا کرتے ہیں اکھٹا ہوتے ہیں۔ ایک ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ "قانون دانوں کا ستیاناس ہو"، میں نے اس کی تفتیش کی کہ ایک کارآمد فرقہ کے خلاف جس کو انگریزی طریقہ عدل گستری وجود میں لایا ہے اس قسم کے تعصب کی کیا وجہ ہے۔ مستند طور پر مجھ کو دو ہی سبب بتائے گئے۔ ایک تو یہ کہ یہ لوگ روپیہ بہت کماتے ہیں۔ مگر یہ کوئی ایسی خطا نہیں ہے جو اُن کو سرزنش کا سزاوار کرے اور پیشوں میں ہمارے دیس کے لوگوں کو بہت کم ملتا ہے۔ دوسرا سبب جو غالباً زیادہ اہم بھی ہے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایک محکمہ سے دوسرے محکمہ کو اپیل کرکے مقدمہ بازی کو ترقی دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جو غالباً ہر ملک میں وکالت پیشہ لوگوں کے بعض گروہوں پر صادق آسکتا ہے۔ اور اس ملک میں بھی ایک محدود معنی میں ہم اس کو مان سکتے ہیں۔ مگر اس نقاشی کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ میں نے ایک بہت خیرخواہ وکیل سے جو متعدد خیرخواہانہ رسالوں کے مصنف ہیں جن کا ترجمہ اُنھوں نے انگریزی میں پرائیویٹ طور پر شائع کرنے کی غرض سے کرایا ہے اور جو خود انگریزی دانی کے الزام سے مبرا ہیں پوچھا کہ آپ کا خیال اس اتہام کی بابت کیا ہے۔ ان کی رائے سے یہ معلوم ہوئی کہ اس قسم کی اپیلیں وکیلوں کی کسی مخصوص کھوٹاپن یا خودسری کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ بعض نوجوان جن کی نمایاں لیاقتوں میں قانون دانی ہمیشہ شامل نہیں ہوتی بہت

---

[1] وہائٹ لندن کی وہ شاہراہ ہے جس میں انڈیا آفس اور دیگر سرکاری دفاتر واقع ہیں۔ اور کرامول روڈ ہال کی ایک سڑک ہے جس میں وہ مکان واقع ہے جو تازہ وارد ہندوستانی طلبہ کے چند روزہ قیام کے لئے آراستہ کیا گیا ہے ۱۲

ہی ضعیف اور اکثر قابل تمسخر فیصلے لکھا کرتے ہیں۔ پس اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ ہر ایمان دار اور ذی حرفت وکالت پیشہ شخص کا اپنے موکلوں کے حقوق کے لحاظ سے فرض ہے کہ عدالت بالا تک اپیل لے جانے کی ضرورت قباحت کو جاری رکھے۔ الّا اس صورت میں کہ اس ملک کا طریقہ عدل گستری از سرتا پا بدل دیا جائے اور ہر ایک شخص، جو کرسی عدالت پر جاگزیں ہو، بذات خود ایک قانون مان لیا جائے۔ میں اپنے مضمون کے اس حصہ میں فقط ایک لفظ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہ غل غپاڑہ زیادہ زور شور سے بارسٹروں کے خلاف سنائی دیتا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ میری طبیعت بہت جھنجلائی ہے اُن لوگوں سے جو بدوں کسی علمی لیاقت کے، جس کی بنا پر وہ قانونی لیاقت کی تعمیر کریں۔ اور بدوں اتنی استعداد کے کہ جو تھوڑا بہت قانون وہ پڑھتے ہیں اس کو سمجھ سکیں محض ان علمی خلاصوں کے زور سے جو اُن کے دماغ میں زبردستی ٹھونس دیئے جاتے ہیں متعدد ناکامیابیوں کے بعد بارسٹروں کے زمرہ میں لے لئے جاتے ہیں میں نے اور کسی مقام پر ایسی دردناک اور دل سوز تمثیلیں عمر اور قوا اور روپیہ اور ورثہ کی بربادی کی نہیں دیکھی ہیں جیسی کہ ان گمراہ ہندوستانی نوجوانوں میں جو گویا ان پڑھ ہونے کے برابر تھے اور جو گزشتہ سنوں میں اس طریق سے قانون کے پیشہ میں داخل ہو گئے ہیں اسی بنا پر ہم کو قانونی تعلیمی کونسل کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس نے ایسے قواعد بنا دیئے ہیں جن سے ابتدائی تعلیم کا ایک اچھا خاصہ معیار انگلستان میں قانون کے پیشہ میں داخل ہونے کے لئے ضرور ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ سے خود وہ نوجوان اور اس ملک میں ان کے والدین بہت سی کلفت اور مایوسی سے محفوظ رہیں گے۔ مگر جو کچھ میں نے پانچ برس کا عرصہ ہوا اس ملک سے انگلستان واپس ہونے پر ایک ایسے عام مجمع میں کہا تھا جس میں بہت سے نوجوان ہندوستانی طالب علم موجود تھے وہی میں اب بھی کہتا ہوں۔ میں نے اُس وقت کہا تھا کہ ہندوستان میں وکالت کے پیشے میں حد سے زیادہ اژدہام ہو گیا ہے۔ اور اس میں اب جگہ نہیں رہی۔ مگر اس کا اطلاق صرف بیوقوفوں پر ہو سکتا ہے جو لوگ درحقیقت قابلیت رکھتے ہیں ان کے لئے جگہ کافی ہے بلکہ اس سے فاضل۔ اس قول سے میں آج تک سرمو نہیں ہٹا ہوں۔

مستقبل کا علی گڑھ ہم کو اتنے پہلوؤں سے مدد دے سکتا ہے۔ دقت اس میں ہے کہ کس ترتیب سے ان کا تذکرہ کیا جائے۔ جو اہمیت میرے ذہن میں ہر پہلو کی ہے اس کو میں اس ترتیب میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ مگر ایک سے زیادہ وجوہات کی بنا پر میں علوم مشرقی سے آغاز

کرتا ہوں۔ ہمارے ملک معظم نے فرمایا ہے کہ تم کو اپنے قدیمی علم کے نگاہ داشت ضرور ہے۔ یہ ایک ایسی خدمت ہے جو خاص طور پر ہماری یونیورسٹی کے لئے موزوں ہے۔ اکثر یونیورسٹیاں اوّلاً ابتدا میں ایسے راستہ پر چلتی ہیں کہ جس میں اُن کو رکاوٹ سب سے کم ہو۔ جیسے کہ منچسٹر اور لیڈس میں تجارتی اور حرفتی تعلیم خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ وہی ان کے لئے کم سے کم رکاوٹ کی راہ ہے۔ اسی طرح آپ علی گڑھ میں علوم مشرقی خصوصاً عربی اور دیگر سامی زبانوں کی ایسی درسگاہ بدوں زیادہ دقت یا اخراجات کے قایم کر سکتے ہیں جو کئی پشتوں میں اپنی تحقیقات کی عمدگی کمال صحت اور غایریت کی بنا پر تمام دنیا میں اپنے مخصوص صیغہ میں سند مانی جائے۔ یہ ایسا کام ہے جس کو آپ فوراً شروع کر دے سکتے ہیں۔ اور علاوہ بریں یہ ایک ایسا کام ہے جس میں خاص کر کے اس رضامندانہ اور روحانی الحاق کی گنجائش ہے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ہر سال یا دو دو تین تین سال میں آپ اُن تمام اسلامی درسگاہوں کو خواہ وہ لاہور، کراچی، بمبئی میں ہوں یا دوسری جگہ۔ جن کی قابلیت کو آپ نے مان لیا ہو اور نیز علی گڑھ کو مشرقی ادب یا تاریخ کے کسی خاص صیغہ میں تحقیقات کے لئے کوئی مضمون دے سکتے ہیں جس میں وہ سب کے سب مقابلہ کریں اور جس قسم کی لیاقت یا عمدگی ان کے کام میں پائی جائے اس کی مناسبت سے ان کو انعام یا یومیہ اسکالرشپ عطا کیا جائے۔ اس کام کے لئے ایک ضروری بات یہ ہوگی کہ مقابلہ کرنے والوں کو انگریزی کی پوری لیاقت ہو اور وہ فرنچ یا جرمن بھی کارروائی کے موافق جانتے ہوں۔ مجرّد مشرقی علوم کی لیاقت اعلیٰ صفت کی تحقیقات کے لئے کافی نہ ہوگی جس کی وجہ بہت صریح ہے۔ یعنی یہ کہ جرمن اور فرنچ زبانوں میں علم کے اس صیغہ پر مسالے کا ایک انبار موجود ہے جس تک صداقت کے جویاں کو رسائی ہونی چاہیئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان اصولوں پر آپ فوراً مشرقی علوم کے لئے سندیں (ڈپلوما) دینا شروع نہ کر دیں۔ جن کو ندوہ کے علماء بھی اگر چاہیں تو انگریزی اور جرمن بقدر ضرورت سیکھ لینے کے بعد فوراً حاصل کر سکتے ہیں۔ ان علماء کے لئے علی گڑھ میں کلاس کھولنے چاہئیں اور دو یا تین برس میں ان کو ضرورت بخوبی سکھا دیا جا سکتا ہے۔ میں اس مقام پر فروعات سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں کہ میری غرض فقط آپ کو جتا دینا ہے نہ کہ مکمّل تجویز آپ کے سامنے پیش کرنا میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی علوم کے بعد دینیات کی تعلیم کا مسئلہ طبعی طور پر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں بھی ہم اسی رستہ پر ہیں جس میں رکاوٹ کم ہے۔ مُسلم یونیورسٹی کالج میں ہم فوراً الٰہیات کی ڈگریاں دینا شروع کر دے سکتے ہیں جس کے امیدوار علی گڑھ کے طالب علم بھی ہوں گے اور اُن تمام تاسیسوں

(انسٹی ٹیوشنز) کے بھی جو اس کے ساتھ اپنی رضامندی سے ملحق ہوں۔ مگر ہم کو لازم ہے کہ ہم ان ڈگریوں کو اپنی یونیورسٹی کے شایانِ شان بناویں اور ایسی کہ ان کی عزت ہر جگہ اُس تحریک کی وجہ سے کی جائے جس کے بغیر وہ حاصل نہ ہو سکیں گی اور جو ہمیشہ ان لوگوں میں پایا جائے گا جس کو وہ دیجاویں گی میرا خیال ہے کہ اسلامی الٰہیات (مسلم ڈوینٹی) کے باچلر کی ڈگری اور بالخصوص ماسٹر کی ڈگری کے لئے علاوہ اُس کے مخصوص مضامین کے بہت اعلیٰ پایہ کی عربیت اور انگریزی کا اس قدر علم جو اُس کے جدید ادب کو بخوبی سمجھ لینے کے لئے اور انگریزی بآسانی لکھنے کے لئے کافی ہو، مشروط کر دینا چاہیئے۔ مگر دیگر مذاہب کے اصول سے پوری واقفیت رکھنے کے علاوہ ان ڈگریوں کے لئے کسی قدر اعلیٰ اور بہت پکا علم، علم حیات (بائیالوجی)، علم کیمیا (کیمسٹری)، اور علم طبعیات (فزکس)، کا بھی ہونا چاہیئے تاکہ جس وقت مذہب کے برخلاف سائنس کی آواز بلند کی جائے تو وہ اسے سمجھ سکیں۔

پس یہ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص ہماری الٰہیات کی ڈگری کا طالب ہوگا اس کو اوائل ہی سے اس مضمون کو مخصوص کر لینا اور اپنا پورا وقت اس میں صرف کرنا پڑے گا۔ وہی لوگ جن کو کسی قدر باطنی نور عطا ہوا ہے زندگی کے اس مشغلہ کی ہمت کریں گے۔ یہ ڈگری ان میں اسلام کی قسیس (مشنری) ہونے کی صلاحیت پیدا کر دے گی اور اُن حملوں کے رد کرنے کی جو روزمرہ ہر جانب سے اسلام پر کئے جا رہے ہیں۔ مگر دینیات کے اس معیار کے ساتھ ایک اس سے ادنیٰ اور زیادہ عملی پیمانہ مذہبی تعلیم کا اُردو میں ہونا ضرور ہے جس کو مسلم یونیورسٹی کے ہر مسلمان طالب علم کے لئے لابد ہونا چاہیئے۔ اس کی درسی کتابیں علی گڑھ کو دیگر تاسیسوں (انسٹی ٹیوشنز) سے جس کی وہ مادر مہربان ہوگی مشورہ کر کے معین کرنا چاہیئے اور سب کے لئے یکساں ہونا چاہیئے اس تعلیم کا معیار ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر طالب علم کو مذہب کی ضروری باتوں سے اور اس کے عملی فرائض سے کامل واقفیت حاصل ہو جائے۔ یہاں پر مذہب اسلام کے اخلاقی اصول پر بہت زور دینے کی ضرورت ہے اور طالب علم کو خود اپنی زبان میں کلام شریف کے محاسن اور اس سے جو سبق ہم سیکھ سکتے ہیں بتا دینا چاہیئے۔ راستی اور راستبازی اور پاک دامنی کے فرض کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے سکھانا چاہیئے جس طرح پر کہ خیرات اور نماز اور روزہ کا فرض۔ اس خصوص میں صرف ایک لفظ میں بطور تنبیہ کے عرض کرنا ضرور سمجھتا ہوں اور وہ یہ مذہبی اور فرقی نارواداری اور اخلاقی تنگ نظری سے احتراز کرنا۔ یاد رکھئے کہ اسپین میں عربوں کی تعلیمی کارپردازیوں کو

فلپ ثانی اور مذہبی تفحص (انکوئزیشن) نے تباہ کیا۔ اسپین کے لوگوں نے بدعت کو مٹا دینے کا ارادہ کیا اور درحقیقت تعلیم کو مٹا دیا اور خود اپنے کو تباہ کرنے میں مدد دی۔" ہوشیار رہیئے ایسا نہ ہو کہ ہم ایک شمہ بھر بھی ان کا تتبع کریں۔ ہمارا مقولہ ہونا چاہیئے "آزادانہ تحقیق"

قبل اس کے کہ کوئی دوسرا مضمون شروع کروں میں بہت زور شور سے اس رواج پر اعتراض کرنا چاہتا ہوں جو یورپین مصنفوں میں جاری ہو گیا ہے اور جو بڑھ رہا ہے اور جس کے بموجب وہ تعلیم جو گورنمنٹ کے اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے "لامذہب" کے لفظ سے نامزد کی جاتی ہے اس بناء پر کہ ابھی تک گورنمنٹ مذہبی معاملات میں ایک عاقلانہ بے طرفی کا برتاؤ کرتی آئی ہے اگر میں اس مسئلہ پر کسی قدر غلو سے زبان کھولتا ہوں تو اس کی وجہ فقط وہ غیظ نہیں ہے جو ہر صالح آدمی کو ایک ایسے بہتان پر آتا ہے جس کا بارہا استرداد ہو چکا ہو۔ مگر جس کا پھر بھی ہمیشہ اعادہ کیا جاتا ہو۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ عملی طور پر اسلامی فرقہ سے بہت کچھ تعلق ہے۔ جس وقت یہ مصنف کہتے ہیں کہ ہندوستانی انگریزی تعلیم "لامذہب" ہوتی ہے تو اتنا اور بھی اس میں اضافہ کر دیتے ہیں کہ جن لوگوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے ان کے دین و ایمان کی بناء متزلزل ہو جاتی ہے۔ ان کے دلوں میں کسی چیز کی حرمت کا احساس باقی نہیں رہتا، اور ان کے اخلاق پر برا اثر پیدا ہوتا ہے قصہ مختصر وہ خود بھی لامذہب ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بیان ہے جو واقعہ کے بالکل خلاف ہے باستثناء عیسائی تاسیسوں (انسٹی ٹیوشنز) کے دینیات کی باقاعدہ تعلیم کل کی بات ہے اور تمام ہندوستان میں تقریباً ایک ہی کالج میں جاری ہے۔ یعنی علی گڑھ کالج میں حالاں کہ سالہائے دراز سے گورنمنٹ کالجوں سے بی اے اور ایم اے وغیرہ ڈگری حاصل کئے ہوئے اور غیر ڈگری والے سینکڑوں طلبہ پڑھ کر نکل چکے ہیں جن کا اخلاقی آئین نہایت اعلیٰ نمونہ کا ہے اور جنھوں نے اخلاق کے معیار کو گورنمنٹ کی خدمتوں میں بھی اور ہندوستان کے تمدنی اور خانگی زندگی میں بھی اعلیٰ کر دیا ہے۔ ان میں بے حد کثرت ان لوگوں کی ہے جو اپنے دین میں اسی قدر ثابت قدم ہیں جتنا کہ پہلے کبھی بھی تھے اور ہر شے اور ہر انسان کی خواہ وہ کسی قوم کا کیوں نہ ہو حرمت کرتے ہیں اگر وہ حرمت کا مستحق ہو۔ اگر اس معاملہ میں کسی وقت شک کی گنجائش بھی تھی تو وہ جنگ طرابلس و بلقان کے آغاز کے بعد سے بالکل رفع ہو گیا ہوگا۔ ہاں انگریزی تعلیم سے یہ بیشک ہوتا ہے کہ لوگ روشن خیال ہو جاتے ہیں اور مذہبی مسائل پر خود اپنے ذہن سے کام لیتے ہیں اور ہمیشہ آنکھیں بند کر کے ان لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جو اُن سے قبل گزرے ہوں۔ ان کا رجحان مذہب کے ابتدائی اور خالص

اور سادہ شکل کی طرف ہوتا ہے اور اُن کو اس کی فکر ہوتی ہے کہ اگر اس میں کوئی مضر اختراعیں داخل ہو گئی ہوں تو اُن سے وہ پاک کر دیا جائے۔ جدید تعلیم اہل ایمان کو یہ سکھاتی ہے کہ ان کے عقاید عقلی دلائل کے موافق ہیں نہ کہ ان کے مخالف۔ وہ اُن اوہام پرستی کی بیڑیوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ اور نیز بعض ایسے رسوم کی پابندی سے جن کا زور مذہبی عقاید کے برابر ہو گیا ہے۔ اسی قسم کی حالتوں نے عربوں کی روشن خیالی کے زمانہ میں فرقہ معتزلہ کو پیدا کیا۔ اسی قسم کی حالتوں نے یورپ میں آج کل کی خدمت ہیولا پرستی پیدا کر دی ہے اور سوائے مال دولت کے ہر چیز کی حرمت کو مفقود کر دیا ہے۔

جو کچھ میں نے کہا اس کا عملی اثر بہت اہم ہے۔ آرام طلب اور ناعاقبت اندیش مسلمان والدین کے لئے سرکاری کالجوں اور اسکولوں کے لا مذہب ہونے کا خیال اپنے لڑکوں کی تعلیم سے بالکل غافل ہو جانے کے لئے ایک بہت عمدہ عذر ہو جاتا ہے اور چونکہ آرام طلبی اور ناعاقبت اندیشی ایسے عیوب ہیں جن سے ہماری ساری قوم گھری ہوئی ہے اس لئے جن لڑکوں پر ان کا اثر پڑتا ہے ان کی تعداد بہت کثیر ہے۔ پس والدین کو اس آسانی کے ساتھ اپنے فرض سے دل چرانے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ اگر وہ خود اتنی سادی مذہبی تعلیم نہیں دے سکتے جو اُن کے بچوں کے لئے ضروری ہے تو وہ یا تو کوئی روپیہ مہینہ دے کے کسی ملا کو نوکر رکھ لیں یا اُس سے یا کسی دوست سے یہ کام بلا اُجرت نکال لیں ہم سے کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ سے ایک سال میں سات سو لڑکوں کی بھرتی نہ ہو سکی کیونکہ گنجائش نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کو کسی گورنمنٹ اسکول یا کالج میں داخل ہو جانا چاہیے تا وقتیکہ علی گڑھ میں ان کے لئے جگہ بنائی جائے اور وہ باری باری سے ایک ایسے رجسٹر سے جس پر ان کے نام علی الترتیب درج ہوں داخل کئے جاویں۔

لفظ یونیورسٹی کی بہت سی تعریفیں بلکہ توصیفیں کی گئی ہیں جن سے صرف ایک شخص واحد کی طبیعت کا جوش یونیورسٹی کے کسی رخ یا کسی خصوصیت کی جانب ثابت ہوتا ہے۔ مگر ان میں سب میں یہ وصف ہے کہ یہ عاقل کے لئے اشارہ کا کام دیتی ہے۔ مثلاً ان دو مقولوں کو لیجئے بقول کارلائل "یونیورسٹی کتابوں کے مخزن کو کہتے ہیں" اور زیادہ جدید خیال کے موافق "تجربہ خانوں (لابارٹری) کے مجمع کو کہتے ہیں" یہ دونوں تعریفیں ہمارے کام کی ہیں یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ زمانہ مستقبل کے علی گڑھ اسلامی دار العلوم کے پایگاہ میں عمدہ کتب خانے اور عمدہ تجربہ خانے (لابارٹری) ضرور ہونی چاہئیں۔ ورنہ اس کو اپنے مقصد میں ناکامیابی ہو گی بغیر ایک اوّل درجہ کے کتب خانہ کے جس میں قدیم اور جدید کتابیں اور وقتی رسالے موجود ہوں آپ تعلیم

علم کی نگاہ داشت کر سکتے ہیں نہ کوئی ایسی تحقیقات جو اس نام کی سزاوار ہو۔ آپ کو ضرور ہے کہ اپنے ملک کی قلمی کتابوں کی حفاظت کا بار اپنے اوپر لیویں۔ کیوں کہ ایک نہ ایک طریق سے وہ اس ملک سے مفقود ہوتی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں آپ کو اسی ایک آن میں مغربی علوم کی ترقی میں سعی وافر کرنا ہے اور اُس زمانہ میں کوئی یونیورسٹی مکمل نہیں قرار دی جاسکتی تاوقتیکہ اس میں علوم وفنون کے ہر اہم شعبہ کی تعلیم کا سامان مہیا نہ ہو اور تاوقتیکہ اس میں نئی تحقیقاتیں کرنے کا پورا موقع نہ دیا جائے اور مغربی علوم (سائنس) کی تحقیقاتوں کے لئے صرف اچھا کتب خانہ ہی درکار نہیں ہے۔ بلکہ اچھا تجربہ خانہ۔ (لابوریٹری) اس معاملہ میں آپ سے کیا ہو سکے گا؟ یہ بہت کچھ اس پر موقوف ہے کہ آپ کارروائی کیوں کر شروع کریں گے۔ اور کس قدر روپیہ اس پر خرچ کر سکیں گے۔ آپ اس کمالیت کی توقع نہیں کر سکتے جو آکسفورڈ کی باڈلین لائبریری کو حاصل ہے۔ وائنا یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی (جس کا نمبر شاید پانچواں یا چھٹا ہو) سات لاکھ کتابیں ہیں۔ مگر یہ یونیورسٹی کی سالانہ آمدنی بھی چھبیس لاکھ روپیہ ہے اور اس میں چھ ہزار طالب علم ہیں جن میں سے تین ہزار قانون پڑھتے ہیں۔ جملہ معترضہ کے طور پر میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ان طلبہ کا قانونی علم غیر قانونی مشاغل کے لئے بھی بہت عمدہ مکتب ثابت ہوتا ہے۔ مگر ان اعداد سے آپ کو مایوسی کی وجہ کوئی نہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں جس وقت کہ اسکول کے لڑکوں کے لئے علٰحدہ انتظام ہوجائے گا۔ اوایل میں تعداد اتنی کثیر نہ ہوگی۔ ہم پانچ یا چھ سو طلبہ کے لئے انتظام کرنا شروع کر سکتے ہیں اور چند سال کے بعد تعداد کو ہزار تک پہنچا سکتے ہیں۔ جس جماعت میں سات کروڑ آدمی ہوں اُس کے لئے یہ کوئی بات نہیں ہے جو جمہوریہ زیوریچ کی یونیورسٹی بناتی ہے۔ وہ تعداد میں صرف ساڑھے تین لاکھ ہے اور رقبہ میں سات سو مربع میل سے کم باژل کی آبادی جو ایک لاکھ سے کم ہے اپنی یونیورسٹی بنا رہی ہے۔ علاوہ بریں باژل کے حرفتی مدارس دنیا کے بہترین مدارس میں شمار کئے جاتے ہیں (ڈاکٹر چارلس فرانکلن تھنگ ایل ایل ڈی)

علی گڑھ کے تجربہ خانوں کے لئے آپ کو کیمبرج کے کاونڈش لابوریٹری سے بہتر نمونہ نہیں مل سکتا ہے کیوں کہ باوجودیکہ اُس کی عمارت بے ڈھنگی ہے دنیا بھر میں اس سے فایق شاید کوئی دوسرا تجربہ خانہ (لابوریٹری) نہیں ہے ایک اور سمت ایسا ہے جس میں آپ کا خرچ جس وقت کہ آپ یونیورسٹی قایم کریں گے بہت بڑھ جاوے گا۔ یعنی معلموں کے مہیا کرنے میں۔ اس مضمون پر مجھ کو بہت کچھ کہنا ہے۔ مگر آج مجھ کو اختصار سے کام لینا ضروری ہے کیونکہ آپ کے صبر پر میرا حملہ حد سے زیادہ تجاوز کر چکا ہے اس زمانہ میں کوئی یونیورسٹی اس نام کی سزاوار نہیں ہے۔ اگر اس کی روایتوں میں

بڑے بڑے مشاہیر کے نام استاد کی حیثیت میں ورثہ کی طرح نہ چلے آئے ہوں۔ چنانچہ مثلاً لائیڈن اور برلن کی یونیورسٹیوں میں یا بعض انگلستان کی یونیورسٹی میں پایا جاتا ہے۔ علاوہ اُن فائق نوجوانوں کے جن کی خدمتیں ہم کو آج حاصل ہیں آپ کو ایک رتبہ کے معلم بلانے ہوں گے جن کی آپ کو فی الحال ضرورت نہیں ہے۔ میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جو علم کے کسی خاص شعبہ میں کوئی کارنمایاں دکھا چکے ہوں اور امتیاز کے ساتھ انگلستان یا امریکہ یا یورپ کے یونیورسٹیوں میں تازہ تقرر یافتہ (جونیئر) معلم کی حیثیت میں پڑھا چکے ہوں۔ اس مقام پر جگہ اتنی نہیں ہے کہ میں تفصیلوار ہر تفریق کے بھرتی کرنے کی مناسب تدبیروں سے بحث کروں۔ لیکن اگر علی گڑھ کالج کے منتظمین کو خواہش ہو تو جو کچھ مجھ کو اس مضمون پر کہنا ہے وہ آپ کی خدمت میں حاضر کرنے کو موجود ہوں۔ ایک بات البتہ مجھ کو فوراً کہنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ ہم کو جو حال کا دستور نقد عطیہ دینے کا ہے اس کے عوض اپنے پروفیسروں اور معلموں کے لئے پنشن کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ بیشک اس کے لئے ہم کو انگلستان کے کسی اچھے محاسب کی ضرورت ہوگی جو اس تجویز کو عمل درآمد کے قابل بنا دے۔ مگر میرا خیال ہے کہ خرچ میں جو اضافہ ہوگا وہ اتنا نہ ہوگا کہ اس کارروائی کا مانع ہو اور اس سے حاصل یہ ہوگا کہ ہم کو اپنے اسٹاف کے تقرر میں گورنمنٹ ہند سے مقابلہ کرنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ ایسی صورت میں علی گڑھ زیادہ ترغیب دے سکے گا۔ بہ نسبت سرکاری نوکری کے۔ کیونکہ وہاں ایک مقام سے دوسرے مقام کو تبادلہ میں اور گراں شہروں میں قیام کرنے میں بہت کچھ روپیہ صرف ہو جاتا ہے آئندہ سے جب ہم گورنمنٹ کے مقابلہ میں سودا کرتے ہوں تو ہم کو چاہئے کہ علی گڑھ کی ایسی خوبیوں پر زور ڈالیں۔ اور موزوں الفاظ میں اشتہارات کے ذریعہ سے شایع کریں گے۔ میں اپنے محکم عقیدہ کے طور پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی تعلیمی نوکریوں میں بھی اصلی اصلاح نہ ہوگی۔ الّا ایک ایسے مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ سے جس کا دروازہ ہر شخص کے لئے کشادہ ہو۔ موجودہ حالت میں اکثر صورتوں میں اتفاق وقت ہی اس کا باعث ہوتا ہے۔ کہ ایک نوجوان آدمی مدرّسی کے پیشہ کو اختیار کرے۔ کھلے ہوئے مقابلہ کے امتحان کی موجودگی میں بہتیرے کم عمر لوگ بہت پہلے سے ارادہ مصمم کر لینگے اور ایک باعزت اور دل کش مسلک کے لئے اپنے کو تیار کریں گے جس سے اس صیغۂ ملازمت

کو بھی فائدہ ہوگا اور خود امیدوار کو بھی۔ مگر اب ہم کو یہ مضمون ختم کرنا چاہیئے۔

علوم ریاضیہ (سائنس) اور حرفتی تعلیم (میکنکل ایجوکیشن) کے بارہ میں بھی مجھ کو بہت کچھ کہنا ہے مگر نہیں کہہ سکتا چونکہ وقت تنگ ہے لیکن اس قدر تو ہیں پر اور فوراً کہہ دیتا ہوں کہ یہ خاص اور ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ہماری یونیورسٹی قوم کو اکسیر کا کام دے سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اب ایک کثیر تعداد ہندوستان کے نوجوانوں کی جس میں گاہے گاہے کوئی مسلمان بھی ہوتا ہے انگلستان اور یورپ کو مخصوص حرفتی مضامین کے سیکھنے کے لئے جانے لگی ہے جن کے لئے بہت اعلیٰ اور بہت عملی علم کیمسٹری اور فزکس کا درکار ہے۔ ان میں سے قریب قریب سب بلکہ شاید میں کہہ سکتا ہوں کہ سب کے سب اس علمیت میں بہت خام ہوتے ہیں جس کی ضرورت ایسے مخصوص تجربہ خانوں میں ہوتی ہے جو خاص کر کے منتہیوں کے لئے ہوتے ہیں اور جدید تحقیق اور انکشاف کے لئے جس کی اس تجارتی شکایت کے زمانہ میں اشد ضرورت ہے۔ ان کی معلومات اور بھی ناکافی ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کو بہت سا قیمتی وقت اور بہت روپیہ انگلستان میں ایسی چیزوں کی تحصیل میں ضائع کرنا پڑتا ہے جن کا انھیں لازم تھا کہ قبل روانگی کے اپنے ملک میں سیکھ لیتے۔ ایسے موقعوں پر علی گڑھ ان کی دستگیری یوں کر سکتا ہے کہ جو لوگ کسی خاص حرفتی تعلیم کی نیت کریں۔ ان کے لئے کیمسٹری اور فزکس کے کلاس منتہیوں کے درجہ کے برابر کھول دے۔ اس کی ایک مجسم مثال میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ چند سال سے مجھ کو انگلستان میں ان لوگوں سے بہت دلچسپی رہی جو روغنیات کے مضمون میں تحقیقاتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک میں ہر قسم کے بیج اور دیگر اشیا جن سے روغن نکلتا ہے بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو اس ملک میں اس کے کارخانے جاری کرنے کی غرض سے اس مضمون کی حرفتی تفصیلوں سے گہری دلچسپی تھی مگر چونکہ ان کو سائنس کا وہ ابتدائی علم جس کی ضرورت تھی نہیں حاصل تھا اس لئے ان کو انگلستان میں چند سال اس کی تحصیل میں ضائع کرنے پڑے۔ علی گڑھ میں جس قدر کی ان کو ضرورت تھی وہ سب سکھا دیا جا سکتا تھا۔ بغیر اس کے کہ وہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی ڈی ایس سی۔ بی ایس سی وغیرہ امتحانات کے گورکھ دھندے میں پھنس جاویں۔ مخصوص حرفتوں کے اس قسم کی تیاری کے کلاس جس قدر ممکن ہو علی گڑھ میں کھولنا چاہئیں اور جو کوئی طالب علم کیمسٹری یا فزکس میں مخصوص تحصیل کرنا چاہتا ہو اس کو اس میں داخل کرنا چاہیئے۔ بشرطیکہ جتنی ابتدائی انگریزی کی اس کے لئے ضرورت ہے وہ جانتا ہو۔ مناسب یہ ہے کہ ان کلاسوں میں فقط ہمارے بمبئی، رنگون

دہلی، کلکتہ وغیرہ کے بڑے بڑے ہندو مسلمان یا عیسائی کارخانوں کے نونہال داخل ہوا کریں یا قلاں وہ لوگ جن کو ہندوستان واپس آنے کے بعد جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہو مل سکے مگر نئی حرفتوں کے قائم کرنے کے لئے فقط سرمایہ ہی نہیں درکار ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کا حوصلہ ہے کہ اپنے ملک کی اقتصادی (اکونامک) حالت کو ترقی دیں۔ ان کی تربیت کا ایک ضروری حصہ یہ ہے کہ ان کو عظیم الشان مالی معاملات اور مالی نظم و نسق سے ارتباط حاصل ہو۔ اسی وجہ سے میں نے یہ کہا کہ ان کلاسوں کے لئے سب سے زیادہ موزوں اگر مسلمانوں ہی کا ذکر کیا جائے تو ایسے گھرانوں کے نونہال ہوں گے جیسے کہ بمبئی میں سر کریم بھائی ابراہیم یا سر آدم جی پیر بھائی ہیں یا رنگون میں جمال برادرس یا ملّا داؤد اینڈ سنس۔ ان نوجوانوں کو یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے وقت بھی نہیں ہے اور اس کی خواہش بھی نہیں۔ مگر میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ یہ بخوشی اس ملک میں کیمسٹری اور فزکس کی اعلیٰ طبقہ کی تعلیم حاصل کرنے کو آمادہ ہونگے۔ قبل اس کے کہ وہ ہندوستان سے باہر اپنے مضمون کی مخصوص حرفتی حصہ کو سیکھنے کے لئے جاویں۔ نباتی یا حیواناتی روغن کی کیمسٹری۔ معدنی تیل کی۔ کھار قلیا (الکلی) کی صابون کی دوائیات اور اور بے شمار تجارتی مرکبات کی کیمسٹری فوراً ذہن میں آتی ہے۔ یا فزکس کے علم کا سیکھنا عملی میکانیکل اور الکٹرکل انجینیری کی تیاری کے طور پر۔

جو میں نے اوپر کہا ہے اس سے فن تجارت کی ڈگریاں جو وسط انگلستان کی یونیورسٹیاں دیتی ہیں مستثنیٰ ہیں۔ ہر ایک شخص ان کو حاصل کر سکتا ہے اور اگر ابتدا میں خود اس کے پاس سرمایہ نہ ہو تو بڑے تجارتی گھروں میں نوکری کر سکتا ہے۔ مگر میں کسی مسلمان طالب علم کو ان ڈگریوں کے حاصل کرنے کی ترغیب دینے میں کامیاب نہ ہوا۔ اگرچہ بعض ان میں سے آسودہ حال تھے اور ایک ایسے باپ کے بیٹے تھے جس کی لکھوکھا روپیہ کی تجارت ہوتی ہے۔

اس قسم کی کلاس علی گڑھ میں نوجوانوں کو سول سروس اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے امتحانات کے تیار کرنے کے لئے کھولنا چاہئے اور انگلستان کی قانونی امتحان کے لئے۔ اگرچہ امتحان لاطینی کے اضافہ کی وجہ سے اور بھی مشکل کر دیا جائے۔ مگر اس بحث کی تفصیلات کو میں کسی اور موقع کے لئے محفوظ رکھتا ہوں ایسی مسئلہ سے جیسا ہمارے لڑکوں کی انگلستان کی تعلیم کا مسئلہ ہے جو حال میں انڈیا آفس کی دست اندازی ہے اور انگلستان میں جو ہندوستانی طلبہ ہیں ان کی نگرانی کے لئے ایک بڑے اور گراں محکمہ کے قائم مقام کرنے سے نہایت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ مگر در حقیقت بعد اس کے کہ وہ کرامول روڈ والے مکان سے جہاں ان کا ہنگامی مقام بود و باش ہوتا ہے چلے جاتے ہیں تو ان کی نگرانی محکمہ کے امکان سے باہر ہو جاتی ہے۔ اس پورے محکمہ کی

بنا سیاسی (پولٹیکل) معلوم ہوتی ہے اور اس مقام پر میں اس کے بارہ میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا علاوہ بریں جو انگلستان کی قدیم یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کے اکثر کالجوں نے ہندوستانی طلبہ کی تعداد کو بہت سختی کے ساتھ محدود کر دیا ہے اور عموماً اُن کو سرکاری ہی وسائل کے ذریعہ سے بھرتی کرتے ہیں۔ پس اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ جو طالب علم انگلستان میں پہونچتا ہے اور کسی یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ اکثر ایسی کس مپرسی کی حالت میں گرفتار ہو جاتا ہے جو قابل رحم ہوتی ہے۔ وہ آکسفورڈ یا کیمبرج کے کسی کالج کے ذی اختیار حکام کے پاس جاتا ہے تو وہ اس سے کہتے ہیں کہ سرکاری ذریعہ سے آؤ۔ جو سرکاری ذریعہ والے ہیں وہ اُن سے کہتے ہیں کہ کوئی جگہ خالی نہیں ہے لیکن اگر کسی کالج کے حکام ہم کو تمھارے بارہ میں لکھیں گے تو ہم اُن کو مناسب جواب دے دیں گے۔ بعض ڈاکٹری کی درس گاہوں نے بھی اب ہندوستانی طلبہ کے لینے سے انکار کرنا شروع کر دیا ہے یا ان کے ساتھ انصافانہ سلوک نہیں کرتے۔

یہ ایک ایسی صورت حال ہے کہ جس کی اصلاح ضروری ہے۔ پہلے تو ہم کو یہ دیکھنا ضرور ہے کہ ہم سے خود انگلستان میں کیا ہو سکتا ہے۔ آخر ہم بھی برٹش گورنمنٹ کی رعایا ہیں اور لارڈ مارلے نے ایک موقع پر ہوس آف لارڈس میں بہت سچ کہا کہ آپ حضرات کی ایک ہی شاہنشاہی (امپایر) ہے اور وہ ہندوستان ہے۔ ہندوستانی طالب علم جرمنی اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بخوشی منظور کئے جاتے ہیں۔ مگر اُن کی طرف ہم کو اُس وقت نظر ڈالنی چاہیے جب ہم کو کوئی اور چارہ باقی نہ رہے اس وقت تک ہمارے نوجوانوں نے اپنی توجہ کو قدیم اور با اعتبار یونیورسٹیوں تک محدود رکھا ہے تو جہ ان کی تاریخی تعلقات اور یونیورسٹی کے زندگانی کے جس کا پورا فائدہ اب ان کو شاذ و نادر حاصل ہوتا ہے۔ آئندہ کے لئے میرے خیال میں ان کو زیادہ توجہ لندن یونیورسٹی اور صوبہ جاتی یونیورسٹی کی طرف کرنا چاہیے جن میں سے اکثر میں تعلیم درحقیقت نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ خصوصاً ڈاکٹری اور انجنیری کی اور شاید ہمارے نوجوانوں کی ضروریات کے لحاظ سے یہ زیادہ موزوں بھی نہیں۔

ہم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ سوائے بارسٹری کے اور پیشیوں کے لئے اور ہر قسم کی اعلےٰ تعلیم کے لئے سوا انگلستان کے اور ملک بھی ہمارے لئے موجود ہیں۔ لہذا جب ہم لڑکوں کو انگلستان بھیجیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم انگلستان کا ایک نعم البدل کوئی ملک ان کے لئے تجویز کر دیں جو اس صورت میں کام آئے جب وہ وہاں در وا زے مسدود پائیں جرمن یونیورسٹیاں

درحقیقت اُن لوگوں کے لئے زیادہ ترموزوں ہیں جو کسی انگلستان کی یا امریکہ کی یونیورسٹی میں تحصیل کر چکے ہوں۔ جن لوگوں کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہے اُن کے ساتھ میں اس پر اور گفتگو کرنے کو آمادہ ہوں۔

عورتوں کی تعلیم کے بارہ میں اب وہ زمانہ گزر گیا ہے کہ مجھ کو آپ کے سامنے اس مضمون پر وعظ و پند کرنے کی ضرورت ہو۔ اس کا پورا اعتراف ہو گیا ہے کہ قومی ترقی کے لئے یہ صرف مقصد ہی نہیں بلکہ لابد ہے۔ اس حدیث شریف کی میں تکرار کرتا ہوں کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ۔ علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت۔ اس معاملہ میں آپ کے دو فرض ہیں۔ اوّل تو یہ فیصلہ کرنا کہ لڑکیوں کو کس قسم کی تعلیم دینی چاہئے۔ کیوں کہ وہی تعلیم جو لڑکوں کو دی جاتی ہے اُن کو نہیں دی جا سکتی۔ حیدرآباد نے جو لڑکیوں کی تعلیم میں ترقی کی ہے اس کی وجہ سے وہ تہنیت کا سزاوار ہے اور اس من چلے شہر سے آپ اس معاملہ میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بھی مشورہ دوں گا کہ آپ حیدرآباد کی بعض تعلیم یافتہ بیبیوں سے التجا کریں کہ وہ علی گڑھ آن کر بود و باش اختیار کریں اور اپنے وقت کا ایک حصہ رضامندی کے ساتھ اور صرف شفقت کی نظر سے وہاں کے زنانہ مدرسہ میں کسی کلاس کے پڑھانے میں صرف کریں۔ اُجرت پانے والے سربراہ کاروں اور معلموں پر بالکل تکیہ کرنا کوئی کام کی بات نہیں ہے۔ قوم کی روشن خیال بیبیوں کو یا تو لڑکیوں کی یا ان کی استانیوں کی تعلیم میں حصہ لینا چاہئے۔ کیوں کہ عموماً استانیوں کو ایسے مضامین کا علم کم ہوتا ہے جیسے کہ حساب ہے یا جغرافیہ، یا تاریخ۔ آپ کا دوسرا فرض یہ ہے کہ جہاں کہیں لڑکیوں کی تعلیم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پڑ گئی ہو جو واجبی آزمائش کے بعد کوئی نتیجہ نہ دکھا سکے ہوں اور جو اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو صرف اس مضمون پر باتیں بنانے میں یا تحریریں لکھنے میں ضائع کرتے ہیں اُن سے اُن کو نجات دینی چاہئے۔ باتیں بنانے کی مہلک عادت کا اب وقت ہم کو نہیں رہا۔ عملی کام کی آمد آمد میں بہت دیر ہو چکی ہے۔ اٹھئے کام کیجئے اب دیر نہ کیجئے!

یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ یونیورسٹیوں کو ابتدائی تعلیم سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

بلکہ اس کے برخلاف ابتدائی تعلیم یونیورسٹیوں کو غذا پہنچانے کے لئے ضرور ہے۔
مگر ہمارے ہاں یہ ہماری تعلیمی کانفرنس کا خاص محکمہ ہوگیا ہے اور اس کے لائق اور پرجوش اور ان تھک آنریری جائنٹ سکرٹری میرے قابل قدر دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے زیر نگرانی ہے۔ اس مضمون پر مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ ایک معمی کی شکل میں قلمبند کرتا ہوں۔ یعنی ابتدائے تعلیم کو ہماری قوم کے لئے رضامندانہ طور پر جبری کر دینا چاہیئے اور عند الضرورت مفت۔ اس لغز کی تفسیر میں ایک طول طویل مضمون لکھنا آسان بات ہے۔ اس مقام پر اسی قدر کہنا بس ہوگا کہ ہم کو لازم ہے کہ ہر ایک والد یا والدہ کو خواہ وہ غریب ہو یا متمول ہر جائز ذریعہ سے اس کو تحریص دینی چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو مکتب کو بھیجا کریں اور مرفہ الحال لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے مکانوں پر مکتب کھول کر یا قریب کے کسی مدرسہ میں اپنے صرف سے غریبوں کے بچوں کو پڑھوائیں۔ ہر صاحب خانہ کو اپنا فرض سمجھنا چاہیئے کہ نہ صرف اپنے اور غریب عزیزوں کے بچوں کو بلکہ اپنے نوکروں کے بچوں کو بھی تعلیم دے۔ اگر مالک مکان خود نہیں پڑھا سکتا ہے تو اس کو اپنے خرچ سے یا دو ایک دوستوں کی مدد سے ایک ملا نوکر رکھ لینا چاہیئے اور خود ملا کی تعلیم بھی ساتھ ہی ساتھ جاری رہنا چاہیئے۔ نئی پشت کے جوانوں کو چاہیئے کہ اس کو اس قسم کے مضامین پڑھاویں جیسے حساب اور جغرافیہ ہے تاکہ بتدریج اس کی قابلیت بڑھتی جائے اس کو لازم ہوگا کہ اپنے خدمت کے معاوضہ میں کھانے کپڑے اور کسی قدر زر نقد پر قناعت کرے۔ نواب خدیو جنگ بہادر کی اہل خانہ نے حیدرآباد میں اپنے نوکروں کے بچوں اور بچیوں دونوں کے لئے ایک ایسا مدرسہ کھول دیا ہے اور مجھ کو امید ہے کہ لکھنؤ میں بھی اس قسم کے متعدد مدارس جلد کھل جائیں گے کسی مکتب میں ایک ہی آن میں دس بارہ لڑکوں سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں۔ اور ان میں سے جن کو استطاعت ہو اُن کو لازم ہوگا کہ پڑھائی کے اخراجات کا حصہ بٹا لیں۔

قبل اس کے کہ آگے بڑھوں میں ضرور سمجھتا ہوں کہ ایک خاص مسئلے کو چھیڑ دوں جو کچھ عرصہ سے میرے ذہن میں متمکن ہے۔ میری مراد اس مسئلے سے ہے کہ ہمارے موجودہ کالج یا ہمارے آئندہ کی یونیورسٹی کے معاملات میں "فرانچیس" یعنی رائے زنی کا حق کس کو ہونا چاہیئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال بہت پھیلا ہوا ہے۔ خصوصاً

ان لوگوں میں جن کا شمار ابھی تک نوجوانوں میں ہے کہ کالج کے موجودہ طریقہ حکومت اور ٹرسٹیوں کے انتخاب کے طریقے میں بعض باتیں ایسی ہیں جو قابل اطمینان نہیں ہیں۔ اس مسئلے کا لب لباب حق رائے زنی (فرانچیس)، کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ کالج یا یونیورسٹی کے معاملات میں رائے دینے کا حق کس کو ہونا چاہیئے؟ اس وقت یہ حق حال کے ٹرسٹیوں تک محدود ہے اور جگہ خالی ہونے پر وہی نئے ٹرسٹی منتخب کرتے ہیں۔ جو لوگ ابھی نسبتاً عمر کم رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حق رائے زنی (فرانچیس) زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ حدِ فاصل کہیں نہ کہیں بنانی پڑے گی۔ ایسے معاملہ میں تمام عالم کو رائے دینے کا حق نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ویسا ہوگا کہ گویا فوج کی کمان سپاہیوں یا رعایا کے ووٹ سے ہوا کرے۔ بعض لوگوں نے یہ صلاح دی ہے کہ تمام ملک کے بڑے بڑے مرکزوں میں ایسی انجمنیں قائم کرنی چاہیئیں جو نمائندہ ہوں اور جن کو ایک ایسے قائم مقام کے انتخاب کا حق حاصل ہو جو کالج کے معاملات میں ووٹ دیوے۔ لیکن دشواری اس امر کے فیصل کرنے میں ہوگی کہ وہ کون انجمنیں ہوں گی اور کن مرکزوں میں؟ مسلم لیگ میں جو کچھ ہو چکا ہے اس سے ہم کو کسی قدر تجربہ اس کا ہو گیا ہے کہ اس میں کس قسم کی آپس کی نزاعوں کے برپا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایسے قضئے کے منطقی نتیجے کا مہمل ہونا ہم پر اس وقت ثابت ہو جاتا ہے جب ہم اس امر کے امکان کا تصور کرتے ہیں کہ شریر لوگ ہیچ پوچ لوگوں کی نام نہاد انجمنیں قائم کر لیں اور کالج یا یونیورسٹی کے معاملات میں دخل دینے کا ادعا کریں۔

ان وجوہات سے میں اس مسئلہ پر ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں جو میری رائے میں ہم خرما و ہم ثواب کا حکم رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کے سب اس مقولے سے آشنا ہیں کہ "نیابت نہ دو تو خراج نہ لو" میں کہتا ہوں کہ اس قضئے کو مقلوب کر لیں اور اس مسئلہ میں اس کے برعکس پر عمل درآمد کریں یعنی "خراج نہ دو تو نیابت نہ لو" میرے پاس آپ کے سامنے پیش کرنے کو کوئی قطع برید کی ہوئی تجویز موجود نہیں ہے، بلکہ محض چند اشارے۔ سب سے پہلا تو یہ ہے کہ جتنے مرکزوں میں ممکن ہو ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جن کے نام ہوں مسلم یونیورسٹی (یا مسلم یونیورسٹی کالج) کی انجمن حق رائے زنی (فرانچیس ایسوسی ایشن)، کسی ایک انجمن کے ممبروں کی تعداد فرضاً بارہ سے کم نہ ہونی چاہیئے۔

اور ہر ممبر کو لازم ہوگا کہ کالج یا یونیورسٹی کو سالانہ چندہ دیا کرے جس کی رقم ایک سو روپیہ سے کم نہ ہو۔ ایسی ہر ایک انجمن کو ایک نمائندے یا نائب کا استحقاق ہوگا۔ اگر کسی انجمن کے ممبروں کی تعداد اتنی ہو کہ بارہ کو کسی عدد سے ضرب دینے سے وہ تعداد نکلے تو نائبوں یا ووٹوں کی رقم کو بھی اسی عدد سے ضرب دینا ہوگا "خراج نہ دو تو نیابت نہ لو" کے قاعدے سے خود ٹرسٹی صاحبان بھی مستثنیٰ نہیں رہیں گے۔ ہر ایک ٹرسٹی کو لازم ہوگا کہ یونیورسٹی کو یا کالج کو کم سے کم ایک سو روپئے سالانہ کا چندہ دیوے جس عرصہ میں کہ کسی ٹرسٹی یا جن انجمنوں کا ذکر ہوا ہے اُن کے کسی ممبر کے ذمہ چندے کا بقایا واجب ہو اس عرصہ میں اس کو ووٹ دینے کا حق نہیں ہونا چاہیئے۔ اور ایک معقول مدت کے بعد اگر پھر بھی اس کا چندہ وصول نہ ہو تو اس کو ٹرسٹی یا انجمن کا ممبر (جیسی کہ حالت ہو) نہیں رہنا چاہیئے اس تجویز کے پیش کرنے میں مجھ کو بہت کم پس وپیش اس وجہ سے ہے کہ میں خود متمول گروہ میں شامل نہیں ہوں۔ اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے سخت قاعدہ کی وجہ سے ہماری قوم کے بعض بہت لائق لوگ رائے زنی کے استحقاق سے خارج ہو جائیں گے۔ مگر زندگی میں ذرائع کے محدود ہونے کی وجہ سے جو مصیبتیں روز دکھائی دیتی ہیں ان کے مقابل میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی کالج یا یونیورسٹی کے معاملات میں رائے زنی کا حق پھر بھی ایک غیر ضروری نعمت ہے اور سو روپیہ سال ایک ایسی قلیل رقم ہے کہ گویا ایک خدمت گار کی تنخواہ کے برابر ہے۔ بہت مستثنیٰ حالتوں میں قوم کے متمول افراد اس کا انتظام کر سکتے ہیں کہ کسی لایق لیکن تنگ دست بھائی کا چندہ ادا ہو جائے۔

حضرات! ہم کو اپنی تعلیمی ضرورتوں کے لئے روپئے کی اشد ضرورت ہے اور یہ ایک نہایت سیدھا سادھا اور با اثر طریقہ اس کے حاصل کرنے کا ہے۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ہمیشہ کے لئے حق رائے زنی کے بارہ میں جو کچھ شکستہ دلی اس وقت ہے ایک بارگی دفع ہو جائے گی۔

ایک سو بیس ٹرسٹیوں سے ہم کو سال میں بارہ ہزار روپیہ مل جاوے گا اور یہ ایک ایسی رقم ہے جس سے تین طالب علم انگلستان کو تعلیم کے واسطے بھیجے جا سکتے ہیں یا ایک بہت ہی اعلے درجہ کے پروفیسر کی تنخواہ ادا کی جا سکتی ہے۔ اور اگر حق رائے زنی

کی استدعا میں درحقیقت کچھ جان ہے تو چاہیئے کہ اس ذریعہ سے ہم اس سے بھی بڑی رقم اپنی آئندہ یونیورسٹی کے لئے جمع کرلیں۔

میرا خیال ہے کہ جو کچھ مجھ کو اس بارے میں لکھنا تھا کہ رضامندانہ ہمعملی یعنی روحانی الحاق کو تمام ہندوستان کی مختلف اسلامی درس گاہوں میں کسی طریق سے پیدا کرنا چاہیئے وہ میں پہلے سے کہہ چکا ہوں۔ ان میں بعض کا اگر پھر شمار کیا جاوے تو وہ یہ ہیں۔ اسکول کے اور بی اے سے نیچے کے درجوں میں واحد مضامین انشاپردازی کے واسطے جس کے لئے انعام اور یوسمئے (اسکالرشپ) جس کے ملنے کا حق سب کو ہو۔ ان میں سے جو اونچے درجوں میں ہوں یا ڈگری حاصل کر چکے ہوں اُن کے واسطے مخصوص تحقیقاتوں کے لئے واحد مضامین۔ استادوں کا تبادل جیسا کہ جرمن یونیورسٹیوں اور امریکہ کی مشہور "ہارورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ طالب علموں کا تبادل جیسا کہ امریکہ اور انگلستان کے مابین ہوتا ہے۔ درسی کتابوں کا واحد ہونا اور مشرقی علوم کی تعلیم میں دستورالعمل کا ایک ہی ہونا ایک ہی لکچر دینے والوں اور واعظوں کا مختلف تاسیسوں میں دورہ کرنا۔ کھیل اور ریاضتوں میں اسی قدر مقابلہ جتنا کہ دماغی کام میں۔

میں نے آپ کو یہ دکھا دینے کی کوشش کی ہے کہ ہم ایک غیر سند یافتہ یونیورسٹی کو نہایت بکار آمد قومی تاسیس بنا سکتے ہیں۔ سند (چارٹر) سے آپ کو اسی قدر حاصل ہو سکتا ہے کہ آپ کی ڈگریاں سرکاری ملازمت اور وکالت کے امتحان کے لئے مانی جائیں ان کے لئے آپ کو اس وقت بھی الہ آباد یونیورسٹی کے وسیلے سے کام نکالنا ہوگا۔ مگر اگر آپ بجد ہو کر اور استقلال کے ساتھ اس پر کمر باندھ لیں کہ جو لوگ آپ کے ہاں سے بدل کر نکلیں وہ سرکاری تاسیسوں کے برآوردہ اشخاص سے علم میں، معقولیت میں، تمیز میں ملنساری کے مادہ میں، انتظامی مادّے میں اور وفاداری میں فائق ہوں تو ممکن نہیں کہ گورنمنٹ مدت تلک اُن کی حق شناسی سے انکار کرے۔

آپ یہ بھی ملاحظہ فرمادیں گے کہ اُن اصلاحوں۔ درستیوں۔ اختراعوں اور ترقی کے خیالات میں سے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے کوئی ایسا نہیں ہے جو وجود میں لایا جا سکے الا اس صورت میں کہ آپ کو اپنی آمدنی اور خرچ اور انتظام پر پورا اختیار ہو۔ اسی

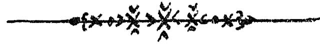
وجہ سے آپ کو کبھی ایسی یونیورسٹی نہیں منظور کرنی چاہیئے جس میں آپ کا ہر فعل منسوخ کر دیا جا سکے۔

خاتمے میں میں چاہتا ہوں کہ جس قدر سرگرمی میرے امکان میں ہے اس کو کام میں لا کر آپ کی خدمت میں مکرر ایک ایسے مضمون پر زبان کھولوں جس کو میں قوم کی بہبودی کے لئے اشد درجہ ضروری سمجھتا ہوں۔ اس ملک کی اقتصادی (اکونامک) ترقی میں آپ کے لئے جو جگہ زیبا ہے اور جو حصہ واجبی ہے وہ آپ نہیں لے رہے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی آپ اسی طرح پر پیچھے رہے جاتے ہیں جیسے کہ اور سب معاملوں میں۔ اگر آپ اپنی تن آسانی کو ترک نہ کریں گے اور اپنی قوتِ بازو سے کام نہ لیں گے تو آپ کے انجام کار کے تیرہ و تار ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ زمانہ حال کے اقتضا کے بموجب مال کا پیدا کرنا آپ کا پہلا فرض ہے۔ اگر آپ اس میں ناکامیاب رہیں گے تو ہر چیز میں ناکامیاب رہیں گے۔ ہنوز بہت سے اچھے تجارتی کارخانے موجود ہیں۔ جو آپ کو تجارت کی عملی تعلیم کی صورت میں آپ کی دستگیری کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن جدید تجارتی طریقے ہمارے پرانے طریقوں سے روز بروز زیادہ مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور آپ کا فرض ہے کہ قبل اس کے کہ وقت ہاتھ سے جاتا رہے آپ ان جدید طریقوں کو سیکھیں اور تب ایسے تجارتی کارخانوں میں شاگردی اختیار کریں۔ جو آپ کے اس علم کی قدر کریں گے۔ نئی حرفتوں کا قائم کرنا روزمرہ کا کام نہیں ہے۔ کسی حرفت کے مخصوص علم کے علاوہ اس میں اور بہت سے عنصر اور ضمنی مسئلے شریک ہیں۔ مگر اس کی بھی ہمت تجارتی کارخانوں کے نونہالوں کو کرنی چاہیئے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے۔ لیکن فن تجارت کی ڈگریاں اس سے بہت بڑی تعداد کے لئے ممکن التحصول ہیں علم کے اس شعبہ کی تلاش میں جہاں کہیں بھی ممکن ہو جائے اگر علی گڑھ سرِدست آپ کو یہ نہیں دے سکتا "اُطلبوا العِلمَ وَلَوکانَ فِی الصِّینِ ؕ" کی حدیث پاک میں جو آپ سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو علم کی تلاش میں چین تک جاؤ۔ تو یہ بات اس میں مفروض ہے کہ آپ اپنے مذہب کی حفاظت کر سکیں گے۔ تو آپ اس کی تلاش میں انگلستان، جرمنی امریکہ کو جائیے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو بمبئی تک تو ضرور جائیے۔ لیکن اتنا تو ضرور کیجیے کہ اپنے منصوبوں کو منصفیوں اور ڈپٹی مجسٹریٹیوں سے موڑیئے۔ میں نے سنا ہے کہ بمبئی میں ایک نہایت عمدہ حرفتی تاسیس ہے جس کا نام وکٹوریہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ہے اور

جس کے پرنسپل ڈرسن صاحب ہیں۔ یہاں کی تربیت کامل اور حقیقی اور عملی ہے۔ علاوہ بریں ابھی چند ہی روز کا عرصہ ہوتا ہے کہ ہمارے فیاض اور محب الوطن، متوطن ملک آنریبل فاضل بھائی کریم بھائی نے اپنا اسکول پونا میں جاری کر دیا ہے جو تجارتی مضامین کو اپنا مخصوص موضوع بنائیگا یعنی بمبئی کے لئے جو کم سے کم رکاوٹ کا رستہ ہے اس پر چلے گا۔ اگر مجھ سے خواہش کی جائے تو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ جو کچھ مشورہ مجھ سے ہو سکتا ہے دینے کو آمادہ ہوں کہ کسی شوقین محنتی آدمی کو کیا کرنا لازم ہے اگر وہ چاہے کہ فوراً کسی نہ کسی حرفت یا صناعی میں اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لے۔ فقط یہ شرائط ضرور ہوں گے کہ اُس کو محنت کرنے کا بے انتہا مادّہ ہو اور کام دیانت سے کرے۔ ہمارے ہندو اور پارسی بھائی نہایت سرگرمی اور سکون اور سکوت اور کامیابی کے ساتھ اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں اُن کو مبارک ہو۔ اگر آپ اس سالانہ جلد پر ایک نظر ڈالیں جو حرفتی کانفرنس کی طرف سے شائع ہوتی ہے تو ممکن نہیں کہ آپ حیرت نہ کریں۔ اگر آپ اُس اطمینان اور استقلال کو ملاحظہ فرمائیں جس کے ساتھ وہ ہر جگہ۔ انگلستان میں۔ یورپ میں۔ امریکہ میں اسی میدان میں قدم زن ہیں تو ممکن نہیں کہ آپ اپنے دل میں ان کی تعریف نہ کریں۔ آپ کیوں ان کی برابر شانہ بشانہ کھڑے نہیں ہو جاتے اور ہندوستان کے اقتصادی (اکونامک) نجات کے حصول میں ان کا ہاتھ نہیں بٹاتے؟ ہندوستان کا مستقبل اسی پر موقوف ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سیاست (پالٹیکس) سے کچھ نہیں ہوتا اور نہ اس سے کہ سیاسی (پولٹیکل) اختیار کسی کے ہاتھ میں ہے۔ الّا جس حد تک کہ اس کا اثر اقتصادی (اکونامک) حالات پر حسب دلخواہ ہو یا اس کے برعکس۔

اخیر میں میں آپ سے اتنا کہے دیتا ہوں کہ جو امن و امان آپ کو انگریزی عملداری کے تحت میں حاصل ہے اور اُس نے جو حالتیں پیدا کر دی ہیں اُن سے زیادہ موافق مراد آپ کو اپنے ملک کے اقتصادی (اکونامک) نجات کو عمل میں لانے کے لئے کبھی نہیں ملیں گے جو لوگ دنیا میں اسلحہ کے استعمال کو موقوف کرنے کی اور صلح کو گراں سے گراں قیمت پر خریدنے کی تائید کرتے ہیں وہ بھی اس کو مانتے ہیں کہ جو جبر کہ کسی ملک پر پولیس کی حیثیت میں کی جائے یعنی امن و امان اور ملک کی امن و امان ترقی کی مددگار ہو وہ جائز ہے۔ ہندوستان میں انگریزی سرکار اسی قسم کے جبر کا استعمال کر رہی ہے اور اس لئے وہ ہماری مشکورانہ

اور وفادارانہ اعتراف کی مستحق ہے۔ گورنمنٹ کے ساتھ ہماری جنگ کبھی اس سے زیادہ کچھ نہوگی کہ ہم کونسل کے کمرہ میں یا پبلک پلاٹ فارم پر اس کے مقابلہ میں کھڑے ہوکر اس ملک کی اقتصادی (اکونامک) حالات میں عدل و انصاف کا تیقن حاصل کرنے کے لئے لڑجھگڑیں علم کے ہر درجہ کی اشاعت۔ ابتدائی سے لے کر انتہائی تلک اسی لئے ضرور ہے کہ اس ملک کے لوگ اس کے اقتصادی (اکونامک) ارتقا DEVELOPMENT میں اپنا پورا حصہ لینے کی قابلیت پیدا کریں۔ ہم کو امید رکھنی چاہیئے کہ ہم کو یہ حاصل ہو جائے گا۔ پولیس قانون اور انصاف ایک ہی وقت میں حرفت اور تجارت کی لونڈیاں یا ندیاں بھی ہیں اور محافظ بھی۔ اور جہاں کہیں انگریزی عملداری ہو وہاں ہمارے لئے ان گراں بہا نعمتوں کا وجود ہمیشہ بھروسے کے ساتھ فرض کرلیا جاسکتا ہے۔





آنریبل مسٹر جسٹس شاہ دین
صدر اجلاس بست وهفتم (آگرہ سنہ ۱۹۱۲ ع)

اجلاس بست و ہفتم

(منعقدہ آگرہ ۱۹۱۳ء)

صدر آنریبل مسٹر جسٹس شاہ دین جج چیف کورٹ پنجاب

حالات صدر

ممدوح کے حالات اجلاس نہم منعقدہ علی گڑھ بماہ دسمبر ۱۸۹۴ء کے ذیل میں صفحہ ۹۲ پر درج ہو چکے ہیں

خطبہ صدارت

حضرات! آج پورے اُنیس برس ہوئے کہ ۱۸۹۴ء کے ہفتہ کرسمس میں اسی کانفرنس کے نویں سالانہ جلسے کے موقعہ پر جو محمدن اورینٹل کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا تھا مجھے صدر جلسہ ہونے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ وہ شاندار جلسہ مجھے ایسا ہی یاد ہے کہ گویا کل کی بات ہے اور وہ تمام سماں میری آنکھوں میں پھر رہا ہے جبکہ اسلامی تہذیب اور شائستگی کے بہترین نمونے اور نمایندے میرے گرد و پیش جمع تھے۔ مشہور و معروف بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ جناب سرسید احمد خاں مرحوم و اُن کے نامور صاحبزادے مسٹر سیّد محمود۔ ریاست حیدرآباد کے قابل مدبر اور سلیس درباری نواب محسن الملک بہادر جو بعد میں یادگار زمانہ سرسیّد مرحوم کے لایق جانشیں ہوئے۔ عالم متبحر روشن خیال فاضل الٰہیات مقرر جادو بیان جناب مولانا نذیر احمد صاحب اور دہلی کے کثیر التصانیف

ہمہ گیر مصنف مولوی ذکاء اللہ صاحب - یہ سب بزرگ جلوہ افروز مجلس تھے - افسوس یکے بعد دیگرے یہ سب نامور بزرگ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے - مگر وہ ایسے روشن کارنامے اور گراں قدر ورثے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے مسلمانان ہند کا مایۂ ناز رہیں گے -

ان محترم اصحاب نے مسلمانان ہند میں جدید تعلیم کی اشاعت کرنے میں گویا مقدمۃ الجیش کا کام دیا ہے - پس ایسے اجلاس میں جس میں ایسے نامور اور قابل بزرگ موجود ہوں - کرسیٔ صدارت پر متمکن ہونا واقعی ایک ایسا امتیاز اور اعزاز تھا جو ہر شخص کے لئے موجب فخر ہو سکتا ہے - اُنیس برس بعد قوم کی متفقہ آواز نے آج مجھ کو دوبارہ اس معزز عہدہ پر ممتاز فرمایا ہے اور آپ صاحبان کے ارشاد و حوصلہ افزائی کی تعمیل کے لئے میں آج پھر حاضر ہوں - اس کانفرنس میں صدارت کا کام دشواری اور ذمہ داری کا کام ہے - اور اس کام کی انجام دہی کے لئے مجھ کو منتخب فرمانے میں جو عزت و افتخار مجھے آپ صاحبان نے بخشا ہے میں اُس کی دل سے قدر کرتا ہوں - کاش یہ اہم کام کسی مجھ سے قابل تر شخص کے ہاتوں میں سپرد کیا جاتا - مگر چونکہ آپ صاحبان نے مجھے اپنے اعتماد کا شرف دیا ہے میں سعی بلیغ کروں گا کہ اپنے تئیں اس شرف عزت کا مستحق ثابت کروں - اور مجھے یقین ہے کہ اس کام میں جو میرے سامنے ہے میں آپ صاحبان کی دلی امداد اور حمایت پر پورا بھروسہ کر سکتا ہوں -

واقعات گذشتہ پر ایک نظر ۱۸۹۴ء تا ۱۹۱۳ء

مجھے یہ دیکھ کر کمال مسرّت اور دلی طمانیت حاصل ہوئی ہے کہ میری پہلی صدارت کے بعد جو زمانہ گزرا ہے اس میں مسلمانان ہند نے بہت کچھ تعلیمی ترقی کی ہے - مغربی طریقۂ تعلیم کے خلاف تعصب قوم میں قریب قریب ہر جگہ مفقود ہو گیا ہے اور قوم تعلیمی معاملات میں بہت کچھ اُولوالعزمی دکھانے لگی ہے اور بہ حیثیت مجموعی یہ زمانہ سابق کی نسبت مسلسل ترقی کا زمانہ رہا ہے اور قوم میں ایک خاص درجہ تک شعور نفس اور احساس اتحاد پیدا ہو گیا ہے - اور یہ دونوں باتیں مسلمانوں کی کایا پلٹ کرنے - اور ان کو دوبارہ معراج ترقی پر پہنچانے کے لئے - لازمات سے ہیں - اگر ملک کے کسی حصہ میں قوم نے کبھی تعلیم کے اصلی مفہوم کے سمجھنے میں یا تعلیمی خیال کو عملی صورت دینے میں غلطی بھی کی ہے یا احتیاط اور عاقبت اندیشی کی صحت بخش پابندیوں سے گھبراہٹ بھی ظاہر کی ہے تاہم بعد میں اِن غلطیوں کی اصلاح اور تلافی کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور آخر کار خردمندانہ مصلحت کی قدر کرکے اس پر عمل

کیا ہے۔

علی گڑھ کالج | علی گڑھ کالج شہرۂ آفاق بانی کے تعلیمی نصب العین کا نمونہ ہے اور اگر اس کو مسلمانوں کے مزرعہ تعلیم میں سب سے اعلیٰ کشت زار تجربہ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ اس کالج کی تاریخ بھی آشوب انقلاب سے محفوظ نہیں رہی ہے۔ اور اس پر ایک ایسا وقت آچکا ہے کہ جب یہ اندیشہ تھا کہ یہ دارالعلوم پُرانی نسل کی باہمی رقابت سے محفوظ نہیں رہی ہے۔

ایک وقت ایسا آچکا ہے کہ نئی نسل کے خلاف اعتدال مطالبات کا مرکزِ طوفان بن جائے گا مگر شکر ہے کہ آخر کار خردمندانہ مشورے غالب آئے اور کئی مرتبہ ایسے نازک وقت بخیر و خوبی ٹل گئے۔ ہمارا علی گڑھ کالج مسلمانانِ ہند کا مرکزی قومی درس گاہ ہے اور ہمیشہ رہے گا اور بلحاظ ان عظیم الشان روایات اور اس بے انتہا اثر کے جو یہ قوم کی تمام بڑی بڑی تحریکات پر ہمیشہ ڈالتا رہا ہے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس درس گاہ کی عام حالت جملہ مسلمانانِ ہند کی اخلاقی اور دماغی ترقی کے اندازہ لگانے کے لئے شاید بہترین معیار کا کام دے گی۔ کچھ شک نہیں کہ علی گڑھ کی طاقت بھی بہت بڑی طاقت ہے۔ مگر اس کی ذمہ داریاں اُس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ میں اس کالج کی جماعت منتظمہ اور طلبار کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سرسید مرحوم نے جو پالیسی اور اصول دونوں کی رہنمائی کے لئے قایم کر دیئے ہیں اُن سے انحراف کرنا گویا ایک بڑی امانت میں خیانت کرنا ہوگا۔ علی گڑھ کالج کے قیام کا بڑا مدعا یہ تھا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک بہترین نمونہ تیار کیا جائے۔ یعنی اس کالج سے ایسے نوجوان نکلیں جو اعلیٰ درجہ کی دماغی قابلیت اور اعلیٰ خصائل رکھتے ہوں جن میں مشرق کی شیریں ادائی اور خوش اطواری کے ساتھ مغرب کی شرافت خیز خودداری اور محکم آزادی پائی جائے گویا وہ نوجوان ایسے ذی فہم ہندوستانی ہوں جو خلوت و جلوت میں ہمیشہ متانت و وقار و ضبط و ذمہ داری کو ملحوظ خاطر رکھیں اور جن کا مقصد یہ ہو کہ وہ سوسائٹی کے مفید ممبر اور سلطنت برطانیہ کے وفادار اور مددگار متمدن ثابت ہوں۔ یہ وہ نصب العین تھے جو سرسید نے مسلمانانِ ہند کے روبرو پیش کئے تھے اور ان کی عملی صورت میں تکمیل کرنا نہ صرف علی گڑھ بلکہ جملہ اسلامی درس گاہوں کا مقصد اور فرض ہونا چاہیئے۔ حالاتِ زمانہ میں یہ بات نہایت امید افزا اور طمانیت بخش پائی جاتی ہے کہ معاملات تعلیم میں سرسید مرحوم

کی قایم کردہ پالیسی پر ہی اب تک عمل درآمد چلا جارہا ہے۔ گو بعض اوقات قوم کے ضمیرِ روشن کی دھیمی آواز نفسانیتوں کے جنگ وجدال کے شور وشغب میں سنائی نہ دے مجھے پورا یقین وبھروسہ ہے کہ آخر کار لوگ اُس آواز کو ضرور پورے ادب کے ساتھ سنیں گے اور کالج کی روز افزوں ترقی کو موجودہ نسل کے سمجھ دار نوجوانوں کی وفادارانہ معاونت سے ضرور قوت حاصل ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی صاحبان! ہندوستان میں علی گڑھ کی تحریک کی اشاعت کا ایک نہایت خوش گوار نتیجہ وہ تھا جو اس باانتظام کوشش سے مترتب ہوا جو ہماری قوم نے علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کے لئے سرمایہ بہم پہنچانے میں دکھائی تھی وہ گرمجوشی کی لہر جو تمام ملک کے ہر طبقہ کے مسلمانو میں موج زن ہوئی اور وہ حیرت انگیز کامیابی جو حامیان یونیورسٹی کو ہز ہائینس سر آغاخان کی روشن قیادت میں حاصل ہوئی اس بات کا معنی خیز ثبوت ہیں کہ ہماری قوم میں ایک بڑی بیداری پیدا ہوگئی ہے اور یہ بیداری زیادہ تر اس روشن خیالی کا نتیجہ ہے جس کی اشاعت رفتہ رفتہ علی گڑھ سے ہوتی رہی ہے یہ خیالات اور اُن کے اساسی اصول مسلمانوں میں بہ سعی تمام اشاعت پذیر ہونے چاہئیں اور اس نئے نظام حالات پر جو اب صورت پذیر ہوتا جاتا ہے اُن کا اطلاق کرنا چاہیئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس طرح نہ صرف تعلیمی تحریک میں بلکہ دیگر تحریکات میں ہماری قوم کو وہ مرتبہ ضرور حاصل ہو جائے گا جو بلحاظ قومی روایات اور ملک میں تعدادِ آبادی کے ہماری قوم کے شایاں ہے۔ ہماری قوم کے لئے تعلیم اس وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اور دیگر اقوام کے مقابلے میں ترقی کرنا اُسی نسبت پر منحصر ہوگا جس نسبت سے ہم زمانۂ جدیدہ کے اصول کے مطابق تعلیم حاصل کریں گے۔ اور اس حقیقت کے نظرانداز کرنے سے یقیناً اس ملک میں ہماری حالت معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔

تمام ملک میں گزشتہ تین سال سے مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ پر ہر پہلو سے بحث ہو چکی ہے۔ اور اس خیال سے کہ معاملہ ابھی تک خاص ذی اختیار کمیٹی کے زیر غور ہے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اس جلسہ میں خاص طور پر اس معاملہ کی نسبت اظہار رائے کیا جائے لیکن اس قدر بیان کر دینا شاید بیجا نہ ہوگا کہ پہلے نہایت شوق وشغف دکھانے کے بعد اب قوم اس کی طرف سے کچھ بے دل اور بے پرواہوگئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس تغافل کی

زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں بعض اہم حالات نہایت اندیشہ ناک طور پر واقع ہوتے رہے ہیں جن کی طرف مسلمانان ہند کی توجہ مبذول رہی ہے اور جس سے ان کے مالی ذرائع پر بھی بہت کچھ بار پڑا ہے۔ مگر اب چونکہ ان مشکلات کا بادل کھل گیا ہے اور مطلع صاف نظر آنے لگا ہے اور میں نہایت زور کے ساتھ قوم سے التماس کرتا ہوں کہ دوبارہ مسئلہ یونیورسٹی کی طرف اپنی توجہ منعطف کریں کیونکہ یہ مسئلہ ہمارے لئے اب نہایت ہی ضروری ہو گیا ہے۔ اس معاملہ کی نسبت میں اس قدر مشورہ دینے کی اور جرأت کرتا ہوں کہ اس معاملہ کا صحیح تصفیہ کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے سربرآوردہ اصحاب اپنے دل و دماغ کی قوتیں اس مسئلہ پر صرف کریں۔ اور قوم کے عوام الناس جمہور اس معاملہ میں عقیدت مندی کے ساتھ ان کی تقلید کریں۔ مجھے شک ہوتا ہے کہ شاید ہمارے رہنما اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کی نوعیت اور وسعت کا پورا اندازہ نہیں کر سکے ہیں۔ انہوں نے ایک نہایت مشکل تجربہ کرنے کا کام شروع کیا ہے جس کے غالب نتائج دور تک اثر پکڑنے والے ہیں؛ اور بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کام کو انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس کے انتظام سے وہ سراسر عاری ہیں۔ مسئلہ یونیورسٹی پر وہ بحث مباحثہ جو اخبارات میں اور ان کمیٹیوں کے جلسوں میں جس کا یونیورسٹی کے مسئلہ پر بالتفصیل غور کرنا فرض ہے۔ ہوتے رہے ہیں میرے خیال کی تائید کرتے ہیں اور ان بحث مباحثوں سے جو نتیجہ آج تک مترتب ہوا ہے اس کے متعلق اکثر اہل الرائے اصحاب کو بے اطمینانی ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق جو قوم کا طرز عمل رہا ہے۔ اس پر بڑے نقص کی بات یہ ہے کہ ہر شخص جس نے یونیورسٹی فنڈ میں کچھ بھی چندہ دیا ہے یا چندہ دینے کا وعدہ کیا ہے یہ سمجھتا ہے کہ اس کو یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن اور اس کے آیندہ معاملات کے انتظام کے متعلق رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ بلالحاظ اس امر کے اس کو ایسے معاملات کی نسبت صحیح رائے قایم کرنے کی قابلیت بھی حاصل ہے۔

ایسے لوگ جو ہندوستان کے تعلیمی مسئلہ کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں، اخبارات میں مسئلہ یونیورسٹی کے متعلق ایسی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ جن سے ان اصحاب کے بھی ہوش اُڑ جائیں کہ جنہوں نے خود یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی ہے اور جو کسی حد تک اس مسئلہ کی پیچیدگیوں کا اندازہ کرنے کے قابل ہیں۔ میں نہایت زور سے قوم کو یہ مشورہ دوں گا کہ یونیورسٹی کا تمام مسئلہ تعلیمی ماہران کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ یعنی ایسے اصحاب کے ہاتھ

میں جو اپنے تجربہ اور تعلیم کے لحاظ سے اس مسئلہ پر رائے دینے کے اہل ہیں۔ اور ایسے ماہران سے میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا فرض دلیری اور دقیقہ رسی کے ساتھ کماحقہٗ انجام دیں۔

اس مسئلہ میں بے انتہا مشکلات کا سامنا ہے۔ ہم کو ان مشکلات کی ماہیت کو سمجھنا چاہیئے۔ اور مردانہ وار اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اور محض بظاہر پسندیدہ تعمیات اور جلد بازانہ نتائج اخذ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ میرا ذاتی خیال جو ایک یونیورسٹی کی عملی کارروائی کے مختصر سے تجربہ پر مبنی ہے یہ ہے کہ ہماری اصلی مشکلات چارٹر ملنے اور مسلم یونیورسٹی کے وجود میں آنے کے بعد شروع ہوں گی اور مجھے اندیشہ ہے کہ حامیان تجویز یونیورسٹی میں سے ایسے افراد بہت کم ہیں جو اپنے تئیں اس کام کے سرانجام دینے کے لئے جو اُنہیں درپیش ہی قابل بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ تعلیمی معاملات میں عملی تربیت جو ٹرسٹیان علی گڑھ کالج بحالت موجودہ حاصل کر رہے ہیں ایسی تربیت نہیں ہے جو مجوزہ یونیورسٹی کے مجلس منتظمہ کے لئے کارآمد ہو سکے گی۔ کیونکہ مجوزہ یونیورسٹی موجودہ یونیورسٹیوں کی سینٹ اور سنڈیکیٹ کی طرح مشرقی اور مغربی اعلٰے تعلیم تمام شعبوں کے انتظام کی خود مختارانہ ذمہ دار ہوگی۔

ہماری یونی ورسٹی کے متعلق تعلیم دینے اور امتحانات منعقد کرنے کا کام ہوگا۔ امتحانی معیار قایم کرنے، جملہ امتحانات کے لئے نصاب منتخب کرنے، ممتحن مقرر کرنے، انعقاد امتحانات کا انتظام کرنے، اور دیگر تمام اُمور متعلقہ کے سرانجام دہی، ایسے سوالات ہیں جن کا فیصلہ اُن مقامی حضرات کو جو براہ راست ذمہ دار ہوں گے بڑے غور و خوض سے کرنا پڑے گا۔ یہ وہ مشکلات ہیں جو بحالات موجودہ منتظمان علی گڑھ کالج کو جو خود ایک یونیورسٹی کے ساتھ ملحق ہے درپیش نہیں آتیں۔ اور جب ہم اُن روزافزوں دقتوں کو بھی مدنظر رکھیں جو منتظمان کالج کو آیندہ پیش آئیں گی تو ہم کو اُن مشکلات کا اندازہ ہو سکے گا جس کا مجوزہ یونیورسٹی کے کورٹ و سینٹ کو مقابلہ کرنا پڑے گا۔ پس ہمارے ماہران فن تعلیم کو نہایت جاں فشانی کے ساتھ اس کام کی انجام دہی کی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جو اُن کی سپرد ہونے والا ہے۔ اگر وہ ضروری معیار قابلیت حاصل کرنے سے قاصر ہیں تو مجھے خوف ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی کے جس کی اس قدر دھوم مچ چکی ہے ایک مفید نعمت ہونے میں شک کرنے کی گنجایش ہوگی۔

مخلوط درس گاہیں اس مضمون کے ضمن میں میں ایک امر آپ حضرات کے ذہن نشیں کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ کی تعلیمی ضروریات کی کفیل آپ کی صرف ایک یونیورسٹی ہرگز

نہیں ہو سکتی اور اس لئے آپ کو ان سہولتوں سے جو ملک کے موجودہ کالج و یونیورسٹیاں
بہم پہنچاتی ہیں۔ مستفید ہوتے رہنا لازمی ہے۔ ان کالجوں میں آپ کی قوم کا عنصر نہایت کم ہے۔
اور وہاں آپ کو اپنی تعداد بڑھانے کے لئے بہترین کوشش عمل میں لانی چاہیئے۔ یہ خیال
کرنا کہ ان کالجوں کی تعلیم مسلمانوں کی ضروریات کے مناسب حال نہیں اور یہ کہ ہم کو اپنا ایک
تعلیمی حلقہ علیحدہ قایم کرنا چاہیئے، میرے نزدیک ایک مہلک غلطی ہے۔ مجوزہ یونیورسٹی ایک
خاص محدود الاثر انتظام ہے اور موجودہ حالات اور واقعات ایسے ہیں کہ آپ ایک عرصہ
دراز تک اس کے حلقہ اثر کو کافی وسعت نہیں دے سکیں گے۔ لیکن اگر یہ ممکن بھی ہے تو مجھے
اس توسیع کی ضرورت تسلیم کرنے میں کلام ہے کیونکہ میرے خیال میں ہندوستان کی مادی بہبودی
اور ارتفاع میں پورا حصّہ لینے کے لئے مسلمانوں کی آیندہ نسلوں کو دیگر اقوام کے ساتھ میل
رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اور اُس کا ذریعہ ہمارے ملک کے مخلوط اسکول اور کالج ہیں۔ میں نے
اس کانفرنس کے روبرو مسلمانان پنجاب کی تعلیم کے متعلق ۱۸۹۳ء میں ایک مضمون پڑھا تھا
اس مضمون میں خالص اسلامی درس گاہوں کی تعداد بڑھانے کی عدم مناسبت کا ذکر کرتے ہوئے
میں نے یہ تقریر کی تھی کہ اُیسے بعید از کار تجربوں کے خلاف ایک اور مضبوط دلیل یہ بھی ہے
کہ اِس ملک میں بلا ضرورت قومی مدارس کی تعداد بڑھانا نہ صرف نامناسب بلکہ خطرناک ہے
ہر گھر میں ایک بُت قومی مدارس کی شکل میں کھڑا کر دینا پنجاب کی مختلف الاقوام آبادی کے لئے
برے نتائج سے خالی نہیں۔ پہلے بھی ہندو اور مسلمانوں کے مابین مذہبی اور تمدنی خیالات کی تفریق
ایک ناقابل گذر دریا واقع ہے جس کو عبور کر کے ظاہری راہ و رسم رکھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

پس اس مغائرت کو زیادہ بڑھانا اور ایسے مدارس کو قایم کرنا جن کے ذریعہ سے
ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ متعصب ہو جائیں۔ کسی صورت سے مناسب نہیں۔

سرکاری مدارس میں ہمیں مشترکہ میدان میسّر ہے۔ جہاں ہر دو اقوام کے نوجوانوں
میں باہمی دوستانہ ارتباط ہو سکتا ہے۔ جہاں وہ ایک دوسرے کے محاسن اور مصائب سے
آگاہ ہو سکتے ہیں۔ جہاں اغراض کے تصادم کو باہمی ربط و ضبط بہت کچھ دھیما کر سکتا ہے جہاں
ایک ہندو ایک سچے مسلمان سے خود داری اور دلیری کا سبق لے سکتا ہے۔ اور اپنے مسلمان
ساتھی کو استقلال اور بآسانی تربیت پذیر ہونے کا نمونہ دکھا سکتا ہے۔ ان فوائد کو ہمیں حقارت
کے ساتھ نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ یہ مناسب ہے کہ دونوں اقوام میں محض پیدایشی اختلاف

کو زیادہ تقویت دینے کی غرض سے قومی خصوصیات کے کو راتہ عزم میں جو آجکل زور شور پر ہے مخصوص قومی درس گاہیں بنا دیں اور اس صورت میں اِن ہر دو اقوام کو بالکل اس طرح جدا کر دیں کہ پھر ملنا محال ہو جائے۔ اگر آپ کو حقیقت میں ایسے کالجوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ضرور بنائے لیکن آپ کا فرض اولین یہ ہوگا کہ تیقن کے ساتھ اس ضرورت کو ثابت کیا جائے۔ ایسے موقعہ پر جذبات کا کچھ لحاظ نہیں رکھنا چاہیئے نہ یہ مناسب ہے کہ اسکول کے ساتھ بطور نمایش ضمیمہ یا ایک دل خوش کن شوق کے کالج کا اضافہ کیا جائے۔"

سلسلہ وظائف کا اجرا جس رائے کا میں نے ۹۳ء میں اظہار کیا تھا وہ ایک حد تک آج بھی قابل پذیرائی ہے۔ اور یہ میرا یقین ہے کہ ایک نہایت ہی عملی ذریعہ مسلمان نوجوانوں کو اس کشمکش زندگی کے قابل بنانے کے لئے جو ہندوستان میں درپیش ہے یہ ہے کہ مخلوط درس گاہوں میں دوسری اقوام کے ہوشیار اور چلتے پرزے نوجوانوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو تربیت حاصل کرنے کا موقعہ دیا جائے تاکہ ابتدائی عمر سے ان کا افق ذہنی زیادہ وسیع ہو جائے اور ان کو ان لوگوں کے خیالات، مذاق، جذبات سے زیادہ عمیق آگاہی ہو جائے جن سے ان کو زمانہ آیندہ میں مقابلہ کرنا پڑے گا اِن مخلوط درس گاہوں میں مسلمان طلبا کی تعداد بڑھانے کے لئے بہترین تجویز یہ ہے کہ ہر ایک صوبہ میں ایک سلسلہ وظائف کا قایم کیا جائے کیونکہ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ بہت سے طلبار کی راہ میں جو کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے خواہشمند ہیں افلاس ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اور یہ کہ جہاں کہیں ایسے طلبا کے لئے خاص وظائف کا انتظام کیا گیا ہے اُن کی تعداد اس عرصہ قلیل میں بہت بڑھ گئی ہے صوبہ پنجاب میں ۸ء میں گورنمنٹ کی طرف سے جو ملی وظائف جاری کئے جانے سے اہل اسلام نے کالج کی تعلیم میں بہت کچھ ترقی حاصل کی اور میرے خیال میں دیگر صوبجات میں بھی ایسی تجاویز کامیاب ثابت ہو گئی ہیں۔ ہماری قوم میں ہر جگہ اعلیٰ تعلیم کی مانگ بڑھ رہی ہے اور مانگ کو پورا کرنے کے لئے اب ہر جگہ اپنے کالج جاری نہیں کر سکتے علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ سب سے مقدم یہ بات ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو مکمل تعلیم دینے کا انتظام کریں اور اس لئے تعلیم کی نوعیت جو کالج میں دی جائے بہ نسبت امتحان یونیورسٹی میں اس کے پاس شدگان کی تعداد کے زیادہ تر قابل لحاظ ہے۔ چنانچہ یہی وہ اصول ہے کہ جس پر علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ اور اس صحیح اصول سے گریز کرنا افسوس ناک غلطی ہوگا۔ اپنے بچوں کو ناکارہ درس گاہوں میں تعلیم دینے سے قومی تخیل کے سرچشموں کو زہر آلود کرتے ہیں۔ اور اخلاقی اور ذہنی نقطہ خیال

سے اس کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ پس بلا سوچے سمجھے متزلزل بنیاد پر اپنے قومی کالج بنانا جہاں سے باوجود صرف کثیر اور بے انتہا محنت کے ادنیٰ درجہ کے گریجویٹ نکلیں جو تعلیم یافتگان دیگر اقوام ہند کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں مقابلہ کے لئے ناقابل ہوں ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہو گا کہ قابل مسلمان طلباء کو وظائف دئے جائیں تاکہ وہ اُن سرکاری کالجوں میں تعلیم حاصل کر سکیں جو بہ لحاظ انتظام و سامان تعلیم اطمینان بخش ہوں۔

میں ضمناً یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسئلہ تعلیم کا اقتصادی پہلو آپ کی توجہ کا خاص طور سے مستحق ہے۔ آپ کے طریق عمل پر یہ بڑا عبرت انگیز دھبّہ ہے کہ اسلامی درس گاہوں میں فی طالب علم جس قدر خرچ پڑتا ہے وہ اُسی درجہ کے ہندو مدرسوں اور کالجوں کی نسبت بہت زیادہ ہے ہماری مفلس قوم کے لئے یہ ایک خطرناک معاملہ ہے اور میں اپنے ماہران فن تعلیم کو بڑے زور سے مشورہ دوں گا کہ وہ ایسی درس گاہوں کے حالات و انتظامات کا جیسے فرگسن کالج پونا اور دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور ہیں۔ خاص طور پر مطالعہ کریں۔ ایثار نفس اور رضا فی الفرض کی جو اعلیٰ مثالیں ان کالجوں کے ہندو پروفیسروں نے دکھائی ہیں وہ ہمارے اسلامی درس گاہوں کے اُستادوں اور پروفیسروں کے لئے بوجہ احسن قابل تقلید ہیں۔

میں اس جملہ معترضہ کی معافی چاہتا ہوں۔ میری رائے میں قومی سلسلہ وظائف کا قایم کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔ اور میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اس معاملہ پر اپنی توجہ مبذول فرماویں۔ انجمن ترقی تعلیم امرت سر نے اور دیگر مقامات کی اسلامی انجمنوں نے اس کے متعلق چھوٹے سے پیمانے پر کام چلا کر بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن ان کا طرز عمل حالات جدیدہ کے نامناسب ہے۔ اگر ہمارے ماہرانِ فن تعلیم وظائف کے متعلق غور و خوض کے بعد ایک تجویز قرار دے لیں تو وہ قوم کی ایک بڑی خدمت بجا لائیں گے۔ اس تجویز میں یہ انتظام ہونا چاہئے کہ ہمارے ہونہار نوجوانوں کو میعادی وظائف اس غرض سے دئے جائیں کہ وہ ممالک غیر میں جا کر اپنی تعلیم کو خصوصاً ٹکنیکل مضامین میں تکمیل تک پہنچائیں اور ان وظائف کی تقسیم میں عام طور پر اُن شرائط کا لحاظ رکھا جائے جن سے بمبئی اور کلکتہ میں نمایاں نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ جہاں کہ ٹاٹا وظائف کمیٹی اور انجمن ترقی سائنٹفک کالج مستحق ہندوستانیوں کو اس غرض سے وظائف عطا کیا کرتی ہیں کہ وہ ممالک غیر میں جا کر اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کریں۔

ٹیکنیکل اور سائنٹیفک تعلیم

حضرات! مسلمان نوجوانوں کو ٹیکنیکل تعلیم دینا روز بروز زیادہ ضروری ہوتا جاتا ہے اور بعض صوبجات کے مقامی حالات کو مدنظر رکھ کر مجھے اُمید ہے کہ اگر ہم اس طرف توجہ کریں تو ہماری قوم اس صنعت تعلیم میں اطمینان بخش ترقی کرسکتی ہے۔ ہندوستان کے صنعتی ارتقاء نے ایک نیا پہلو بدلا ہے اور یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ ہم مسلمانان ہند کو فی الحال اپنی کوشش ادبی تعلیم تک محدود رکھنی چاہیئے۔ اور اس کے بعد ٹکنیکل تعلیم کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی دلیل کا اطلاق فنون فاضلانہ کی تحصیل یعنی طب اور انجینیرنگ کے متعلق نہیں کیا جاتا۔ اور مجھے تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ صنعت و حرفت اور عام تجارتی مضامین بھی مسلمانوں کی تعلیم۔ ادبی تعلیم کے پہلو بہ پہلو چلنی چاہیئے۔ آج تک بہ حیثیت قوم ہم نے اپنے حصول دولت کی طاقتوں کو تقویت دینے میں بہت کچھ کوتاہی روا رکھی ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری اقتصادی حالت نہایت زبوں اور خطرناک ہوگئی ہے۔ آجکل صنعت و حرفت کا دور دورہ ہے اور میں اون نوجوانوں کو جو آرٹس کالجوں میں تحصیل علم کرتے ہیں بڑے زور سے یہ صلاح دوں گا کہ وہ بمقابلہ زبان ہائے جدیدہ اور فلسفہ کے طبعیات اور اقتصادیات کے مطالعہ پر زیادہ توجہ کریں۔ زباندان یا فلسفی کے مقابلہ میں ایک ماہر طبعیات تحقیقات علمی کے مفید کام میں زیادہ نمود پاتا ہے۔ اور ہماری قوم کے واسطے آج بمقابلہ ایک فلسفیانہ شاعر کے جو اپنے تجربہ کی مدّھم روشنی میں زرین خواب و خیال کا لطف اُٹھا رہا ہو۔ ایک ماہر علم مادیات کا وجود زیادہ مفید ہے جس کا ذہن ان واقعات سے لبریز ہو جو اپنی قوم کی مادی بہبودی سے متعلق ہیں اور جس کی عملی تعلیم اُس کو زندگی کی مجسم حقایق سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ قابل بنا دیتی ہے۔

گورنمنٹ ہند کی تعلیمی پالیسی

حضرات! گورنمنٹ ہند نے حال ہی میں ترقی تعلیم کا ایک وسیع پروگرام شائع فرمایا ہے اور مسلمانان ہند کو اُن سہولتوں سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے جو ملک کی مختلف جماعتوں میں بغرض اشاعت تعلیم مہیا کی گئی ہیں۔ گورنمنٹ نے اپنے رزولیوشن مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۱۳ء میں اس پالیسی کے اصول کا ذکر کیا ہے جس پر ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے بارہ میں سررشتہ تعلیم کا پابند ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ رزولیوشن ملک کی تعلیمی ترقی میں ایک نہایت ضروری مرحلہ کا آغاز ہے۔ اس کے بعد ۳ اپریل ۱۹۱۳ء کو گورنمنٹ ہند نے اسلامی تعلیم کے متعلق ایک گشتی چٹھی ہر ایک گورنمنٹ کے نام جاری فرمائی۔ جس میں ماسواء درجہ پرائمری تمام صوبوں میں مسلمانوں کی غیر تسلی بخش تعلیمی حالت کی طرف توجہ دلائی گئی اور ایسی تجاویز طلب

کی گئیں کہ جن سے حالت بہتر ہو سکے - اس چٹھی میں گورنمنٹ ہند نے اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں - اور ان اُمور کا بھی اشارہ کر دیا ہے جن کی تحقیقات اور دریافت گورنمنٹ ہند کی رائے میں زیادہ مفید ہو گی - میں سمجھتا ہوں ابھی تک وہ چٹھی ہر لوکل گورنمنٹ کے زیر غور ہے - اور انھوں نے اپنے صوبوں کی اسلامیہ انجمنوں اور سر برآوردہ مسلمانوں سے اُن کے متعلق اور نیز بالعموم مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے بارہ میں آرا طلب کی ہیں - میں نہایت وثوق سے اُمید کرتا ہوں کہ مذکورالصدر انجمنیں مقامی حالات کو مدّنظر رکھتے ہوئے مضمون کے ہر پہلو پر غور و فکر کر کے ایسی عملی اور مفید تجاویز پیش کریں گی - جن سے بالعموم تمام تعلیمی مدارج میں اور بالخصوص درجہ وسطیٰ اور درجہ کالج میں جہاں ہماری قوم کا عنصر نہایت کم ہے ہماری تربیت ترقی پذیر ہو سکے -

ہم گورنمنٹ ہند کے نہایت شکر گزار ہیں کہ اسی نے اسلامی تعلیم کے متعلق ایسی گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اور میں مسلمانان ہند کی جانب سے یہ امید ظاہر کرتا ہوں کہ ہر مقامی گورنمنٹ - گورنمنٹ آف انڈیا کی پالیسی کے اتباع میں اپنی مسلمان رعایا کی تعلیم کو ترقی دینے کی خاطر خاص تجاویز پر عمل فرمائے گی - اس معاملہ میں جو مہتم بالشان کوشش سرکار عالیہ کی طرف سے ظہور میں آئی ہے تمام قوم اس کے نتائج کی بکمال شوق اور بہ تعلق خاطر منتظر ہے - کیونکہ تمام قوم نے اب مسلم طور پر مان لیا ہے کہ تعلیم جدیدہ ہی اُن کی دنیاوی نجات کا ذریعہ ہو سکتی ہے - اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر اُن کی اپنی کوشش و ہمت کے ساتھ سرکار عالیہ کی عملی ہمدردی اور معاونت کا سہارا مل جائے تو اُن کی تعلیمی ترقی متیقن ہو جائے گی - مسلمان جانتے ہیں کہ آج سلطنت ہند کی باگ ایک ایسے فیاض اور بلند خیال مدبّر کے ہاتھ میں ہے جو ملک کی عام بہبودی و فلاح ملحوظ خاطر رکھ کر درماندہ قوموں کی خاص ضرورتوں کو ہمدردانہ انداز سے پورا کرنے کو آمادہ ہے اور مسلمانوں نے بذات خود یہ ٹھان لی ہے کہ اپنی مدد آپ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں -

<u>اسلامی کالج پشاور</u> | اسلامیہ کالج پشاور کا اجرا ہم مسلمانوں کی تعلیمی کوشش اور سرکار با وقار کی ہمدردانہ ہمت افزائی کی ایک نہایت طمانیت بخش مثال ہے ہم سر جارج روس کیپل کی اس گہری دلچسپی کے بے حد ممنون ہیں جو صاحب موصوف نے ابتدا سے تجویز کالج کے متعلق دکھائی ہے اور ہم کو بصد شکر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس معاملہ میں جو نمایاں کامیابی مسلمانانِ پشاور کو نصیب ہوئی ہے وہ زیادہ تر صاحب ممدوح کی فیاضانہ ہمدردی اور حمایت کی بدولت ہے - ہمیں اُمید ہے کہ یہ کالج صوبہ سرحدی میں ایک مقتدر اخلاقی قوت کا مرکز ثابت ہو گا - اور اس صوبہ کے

مسلمانوں کی آیندہ نسلیں سر جارج موصوف کے اسم گرامی کو اپنے جلیل القدر محسنوں کے زمرہ میں ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ پچھلے دنوں ایک نہایت سربرآوردہ مسلمان نے پشاور کالج کے معائینہ کے بعد مجھے یہ تحسین آمیز فقرے مدرسۂ مذکور کی نسبت تحریر فرمائے تھے کہ یہ کالج نہایت اعلیٰ پیمانہ پر جاری کیا گیا ہے اور اس کا محل وقوع ایسا خوش نما اور دل فریب ہے کہ اُس کا منظر ہر گھڑی اُن اقوام کے زیر نظر ہے۔ جنہوں نے صدہا سال سے تاریخ ہند میں مقتدر حصہ لیا ہے۔ بنا بریں یہ اندازہ لگانا تو دشوار ہے کہ اس مرکز سے تمدن جدیدہ کی روشنی کا اثر ایک ایسی قوم پر جو آج تک کسی جسمانی طاقت کے رعب سے تسخیر نہیں ہوئی۔ کیا پڑے گا۔ تاہم بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر یہ کالج اس مسئلہ سرحدی کو حل کرے گا۔ جس کے حل سے بے شمار فوجی مہمات بھی آج تک عاجز و قاصر رہے ہیں۔ یہ نہایت معنی خیز الفاظ ہیں اور ان سے سر جارج موصوف اندازہ کر سکیں گے کہ مسلمانوں کی درماندہ قوم کی دست گیری کرنے سے اُنھوں نے اس قوم کے ذی فہم اصحاب کو کس قدر گرویدۂ احسان بنا لیا ہے۔ کیا یہ میرا امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ جس فیاضی سے گورنمنٹ صوبہ سرحدی نے کام لیا ہے دیگر مقامی حکومتیں بھی اس کی تقلید کر کے مسلمانوں کی اشاعت تعلیم میں امداد دیں گی۔

سرکاری چٹھی کے متعلق تبادلۂ خیالات

میری رائے میں مناسب ہوگا کہ گورنمنٹ ہند کی چٹھی کے متعلق یہ کانفرنس اُن عام تجاویز کی نسبت جو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ ہند کی چٹھی میں درج ہے مختلف صوبوں کے سربرآوردہ نمایندوں کے لئے جو یہاں مجتمع ہیں ایک معقول موقع تبادلہ خیالات کا بہم پہنچائے۔

ایک صوبہ کے حالات دوسرے صوبہ کے حالات سے ضرور کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ اس واسطے وہ تجاویز جو مختلف صوبوں کی ترقی تعلیم کے لئے اختیار کی جائیں گی یکساں نہ ہونگی۔ لیکن بایں خیال اور بالعموم کہ ہماری قوم مشترک النوع ہے ان کی تعلیمی ضروریات میں بہت کچھ مماثلت ہوگی اور اُن میں بہت سی مشترکہ خصوصیات پائی جائیں گی۔ پس مناسب ہے کہ ماہران فنِ تعلیم کو جو مختلف مقدمات سے یہاں تشریف لائے ہیں یہ کانفرنس موقع دے کہ وہ بعد تبادلۂ خیالات حتی الامکان آیندہ کی کارگزاری کے لئے ایک اساس مشترک قایم کرلیں اور خیال رکھیں کہ درجۂ وسطیٰ اور درجۂ کالج کی تعلیم ہماری خاص توجہ کی محتاج ہے۔ جیسا کہ گورنمنٹ ہند نے اپنی چٹھی میں ظاہر کیا ہے۔ ہم بمقابلہ دیگر اقوام اُن خاص شعبوں میں بہت پیچھے ہیں۔

صاحبان - آپ کی تعلیمی عمارت کی بنیادوں اور اُس کی بالائی تعمیر میں حیرت انگیز تباین واقع ہوا ہے - اور اس بڑے نقص کو بہرحال دور کرنا چاہیئے - ابتدائی تعلیم آپ کی قوم میں اگرچہ کلیتاً بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں - تاہم بعض صوبجات میں خاصی ہے - اس کے مقابلہ میں درجہ وسطیٰ کی تعلیم ہر جگہ کم ہے - اور جب ہم اعلیٰ تعلیم کی طرف آتے ہیں تو وہاں تعلیم میں صریح کمی پاتے ہیں - آرٹس کالجوں اور دیگر درس گاہوں میں جہاں اعلیٰ تعلیم کے خاص شعبوں میں تربیت دی جاتی ہے - مسلمان طلباء کی تعداد اس درجہ کم ہو جاتی ہے کہ گویا نہ ہونے کی برابر ہے -
اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری قوم میں ایسے قابل اشخاص کا قحط الرجال ہے - جو ملازمت سرکاری کے اعلیٰ طبقوں فاضلانہ پیشوں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں قومی حقوق کی حفاظت اور قوم کی نیابت کر سکیں - اس ملک میں حیرت انگیز ایسی ترقی ہو رہی ہے اور دیگر سر برآوردہ اقوام ایسی تیز رفتاری سے بڑھی جا رہی ہیں کہ اگر آپ اپنی قوم میں صحیح طریقوں پر ہر درجہ کی تعلیم پھیلانے میں اور خصوصاً یونیورسٹی کی تعلیم کے ادبی اور صنعتی شعبوں میں ترقی کرنے میں المضاعف کوشش نہ کریں گے تو آپ کو نہایت پیچیدہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا - آپ صاحبان کو کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی اور آیندہ کے لئے اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں - تعلیم ہی ایک ایسی دوا ہے جو ہماری قوم کی تمام بیماریوں کا بہترین علاج ہے - اور ذہنی تربیت کو مضبوط بنیاد پر قایم کئے بغیر ملک میں اپنی حیثیت کو تقویت دینے کے خیال سے اپنی کوششوں کو دیگر اطراف میں منتشر کر دینا اور زندگی کے زیادہ مرغوب شعبوں میں صرف کر دینا نہایت مہلک غلطی ہوگی - جس قدر آپ بااصول تعلیم میں اپنی خاص ضروریات کو ملحوظ رکھ کر ترقی کریں گے اُسی قدر ملک کے ترقی یافتہ پبلک زندگی میں اپنا جائز حصہ لیتے اور اُس پر اثر ڈالنے کے قابل ہوں گے - اور اسی صورت میں آپ حکومت کا وہ التفات اور دیگر اقوام کی نگاہ میں وہ عزت حاصل کر سکیں گے جس کا آرزومند ہونا بہبودی عامہ کی غرض سے ہر شخص کا فرض ہونا چاہیئے -

مسئلہ تعلیم کے دو پہلو

وہ تعلیمی مسئلہ جس کا حل ہم مسلمانان ہند کو در پیش ہے دو پہلو رکھتا ہے جن کو شاید اصطلاحی اور معنوی پہلو کہنا بیجا نہ ہوگا - مسئلہ تعلیم کے اصطلاحی پہلو کا تعلق تو اس امر سے ہے کہ دیکھا جائے کہ بمقابلہ دیگر اقوام ہماری حالت کیا ہے مسلمان طلباء کی تعداد تعلیم کے مختلف درجوں میں ہر قسم کے اسکول اور کالجوں میں کس قدر ہے - مسلمانوں نے یونیورسٹی کی

ڈگریاں بمقابلہ دیگر اقوام کس نسبت سے حاصل کی ہیں۔ فاضلانہ پیشوں میں ان کی تعداد کس قدر ہے اور ملک کی پبلک سروس میں ان کی کیا حیثیت ہے۔ اس سوال کے متعلق یہ ضروری ہے کہ ابتدائی وسطی اور اعلیٰ یعنی مختلف مدارج تعلیم میں نسبتاً اپنی کمی کے وجوہات کا مطالعہ کریں اور موجودہ کمی کو پورا کرنے کی تجاویز سوچیں تاکہ ہم ملک کی دیگر سربرآوردہ اقوام سے پیچھے نہ رہیں ہماری تعلیم کے معنوی پہلو کا تعلق بالکل دیگر قسم کے حالات سے ہے جن کا ظہور شائستگی اور روشن خیال کے اُس طاقت بخش کُرہ ہوا میں ہوا کرتا ہے جس کا موجود ہونا انسان متمدن کی ثمرور نیکیوں کی نشوونما کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اور ان حالات کو انفرادی اور قومی زندگی کے اعلیٰ اور لطیف مظاہر سے قریبی موالغت ہے میں اپنے مفہوم کو ایک سیدھی سی مثال سے واضح کئے دیتا ہوں۔

تعلیم جدیدہ کے مجسم نتائج کا شاید آپ کو تجربہ ہوا ہو گا تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس ملک کے تعلیم یافتہ حضرات میں دو قسم کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہ نوجوان ہے جس نے بہت سی نصابِ درسی کا مطالعہ کیا ہے متواتر امتحانات پاس کرکے تعلیم کے زینے کی سب سے پہلی سیڑھی سے چڑھ کر معراج ترقی پر پہنچ گیا ہے اور جولانگاہِ تعلیم میں گوئے سبقت لے گیا ہے اور وہ تمام انعامات حاصل کر چکا ہے جن تک ایک طالبعلم کی دسترس ہو سکتی ہے۔ اُس کے ہمعصر طلبا اُس کو مجسم دائرۃ المعارف کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں اور بہ لحاظ اُس کی فضیلت کے اُس کو مرعوبانہ تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس نوجوان کی فضیلت کو ذرا سا چھیلنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دراصل وہ نرا وحشی ہے۔ حقیقی تربیت اور سلاست شائستگی اس کو چھو تک نہیں گئی اور اس کے وحشی ہونے میں کسی کو محض اس وجہ سے کلام نہ ہونا چاہیئے کہ اُس کی پشت پر کتابوں کا بارگراں لدا ہوا ہے کیونکہ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ پہلے ہی فرما چکے ہیں۔ مصرعہ

"چار پائے بر و کتابے چند"

تعلیم یافتہ نوجوانوں کا دوسرا نمونہ جو نظر آتا ہے اُس کی یہ صورت ہے کہ اس نوجوان نے اسکول اور کالجوں کی تعلیم کے زمانہ میں جو کتابیں پڑھیں اُن کے اصلی مفہوم کے سمجھنے میں زیادہ توجہ صرف کی مگر اُن کتابوں کے الفاظی ڈھانچ کی چنداں پرواہ نہیں کی اس نے امتحانات میں کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں کیا نہ یونیورسٹی کانوکیشن میں تمغے پائے مگر جو کچھ اُستاد نے پڑھایا اُس کو کماحقہٗ دل نشیں کر لیا اور اپنے مبلغ علمی کو زندگی کے اصلی واقعات پر حاوی کیا۔ معاملات دنیا کو

عملی اور عمیق نگاہ سے دیکھنے سے قابلیت حاصل کی اور اس طریقہ سے سوسائٹی کے لئے مہذب متمدن ثابت ہوا ایسے شخص کا ظاہر و باطن یکساں منور رہتا ہے اور وہ اپنے معاشرتی حلقہ میں ایک زبردست اخلاقی اثر کا مرکز بن جاتا ہے۔

جو مثال افراد پر صادق آتی ہے وہی اقوام پر بھی حاوی ہوتی ہے۔ اس لئے اقوام کی طبائع میں بھی آپ صاحبان وہ دو نمونے ملاحظہ فرمائیں گے جن کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ یہ درست ہے کہ ملک کی موجودہ ضروریات ایسی ہیں کہ ہم تعلیمی مسئلہ کے اصطلاحی پہلو کو نظر انداز کر سکتے۔ یا بالفاظ دیگر ہم کو ایسی کوشش کی ضرورت ہے کہ حتی المقدور ان خواندہ وحشیوں کی تعداد میں اضافہ کرتے رہیں۔ تاہم اس مسئلہ کے معنوی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ یعنی ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ جدید تمدن زندگی کے جاودانی اصول کو سمجھیں ان کا انجذاب کریں اور روزمرہ کے افعال میں اُن پر کاربند ہوں تاکہ رفتہ رفتہ ہماری قوم بھی ایک دن مہذب اور روشن خیال افراد کی قوم بن جائے۔

تعلیم نسواں ہندوستان میں زمانہ کی رفتار نے ہم کو ترقی کے ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا دیا ہے کہ جس پر پہنچ کر سوائے ایک نہایت ہی متعصب مُلّا کے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہماری مستورات میں صحیح طور پر اشاعت تعلیم کی ایک باقاعدہ اور مستقل تجویز کی اشد ضرورت ہے ممالک مغربی میں عرصہ دراز سے قومی زندگی کی صحت افزا ارتقا میں اُن کی مستورات معتد بہ حصہ لیتی رہی ہیں اور گزشتہ چند سالوں سے ممالک مشرقی میں بھی اور خصوصاً ہمارے اپنے ملک میں بھی ایسے علامات کی کمی نہیں جن سے ظاہر ہو کہ صنف نازک باطنی ظہور پر اپنی طاقت کو محسوس کر رہی ہیں اور اُنھوں نے قطعی طور پر ارادہ کر لیا ہے کہ اپنے قدیمی گوشۂ تنہائی کو خیرباد کہہ کر بیرونی زندگی کے عملی معاملات میں معززانہ اور روز افزوں حصہ لیں۔ مگر آپ صاحبان میں سے بعض حضرات ضروریات زمانہ کی سخت بے پروائی کر کے اُس سیلاب کو جو اس سمت میں چلا آ رہا ہے روکنا بھی چاہیں تو اب یہ امر ناممکن ہے۔ اور آپ کے واسطے بہترین مشورہ یہ ہے کہ اس سیلاب کا ایسا انتظام کریں کہ اُس کا رُخ مناسب اطراف میں بدل جائے۔ بنی نوع انسان کے خصائل کے خاص انسانی پہلو پر عورت کا جو بے انتہا اثر پڑتا ہے وہ ایک نہایت ہی سرسری نظر سے دیکھنے والے کو بھی عیاں ہوگا اور ہمارا پہلا فرض اس وقت یہ ہے کہ اپنے ملک میں اُس اثر کو پاک و صاف کریں اور اس غرض سے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی تحریکوں کے متعلق

وہ زیادہ بار آور ہو۔ اس اثر سے وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر ہونے دیں۔

اُس وقت سے لے کر جب کہ نئی زندگی کی پہلی جنبش و حرکت سے ایک خاندان کے اُمید بھرے دلوں میں خوشی کی ہنسی پیدا ہوتی ہے اُس نازک وقت تک جب کہ اُمید کی آخری کرن غائب ہو جاتی ہے اور موت کا ہولناک اندھیرا ایک نحیف و زار کالبد انسانی پر طاری ہوتا ہے عورت کا وجود انسانی خیالات اور افعال کے پُرزوں حیثیتوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس لئے زمانہ حال میں یہ امر تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان کی بہبودی کو صورت پذیر کرنے میں عورت کا حصہ عظیم الشان محرکانہ قوت سے مملو ہے۔

آپ سب صاحبان کو یہ پُرمعنی مقولہ بخوبی یاد ہوگا کہ وہ نازک ہاتھ جو گہوارہ کو جنبش دیتے ہیں وہی ہات دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔ اور اگر مجھ کو اجازت دی جائے تو میں اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ وہ نازک اونگلیاں جو بستر مرگ پر ایک ایسے محبت آمیز طریق سے جس کا بیان کرنا انسانی زبان کی طاقت سے باہر ہے آخری الوداع کہنے والے انسان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو بند کرتی ہیں اس کے معاملات زندگی کی آئے دن کی گتھیوں کو سُلجھانے اور عقدہ ہائے کار کے کھولنے میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔ شروع زندگی میں مفید عادات کا راسخ ہو جانا اور بچہ میں اخلاقی خصائل کا محکم ہو جانا اور نوجوانوں میں معاشرتی الفتوں اور نفرتوں کا نشو و نما پانا اور انسانی تعلقات میں سے سب سے زیادہ اور مشکل تعلق کو جس کا نام ازدواج رکھا گیا ہے کامیابی کے ساتھ نبھانا اور خانگی ہم آہنگی اور یک جہتی اور محبت اور قناعت کا کرۂ ہوائی جس میں بہترین محاسن خانہ داری ہمیشہ ترقی پا سکیں پیدا کرنا یہ جملہ اُمور بہت کچھ عورت کے درجہ تربیت پر اور اس بات پر منحصر ہے کہ اُس کو تمدن میں اپنا خاص کام سرانجام دینے کا موقع دیا جائے۔

کوئی قومی تعلیم کی تجویز ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مکمل نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ اُس میں مستورات کی تعلیم کے متعلق طریقہ ہائے جدیدہ پر ایک ترقی پذیر اسلامی جماعت کی خاص ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر کافی انتظام نہ کیا گیا ہو اس سے ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ اُن طریقہ ہائے تعلیم کو اور اُس معیار شائستگی کو جو مغربی تہذیب کے ساتھ منسوب ہیں کلیتًا اختیار کر لیا جائے۔ ہم باشندگان مشرق اپنی جداگانہ روایات رکھتے ہیں اور ہمارے خیالات کا رجحان جداگانہ ہے اور ایشیا اور یورپ کے طریقہ ہائے تربیت کو صحت بخش طریقہ پر ترکیب دے کر ہم کو اپنے واسطے

ایک نیا طریقہ تربیت مرتب کرنا ہوگا تاہم یہ تو صاف ہے کہ ہماری مستورات کی صورت میں محض مشرقی طریقہ تعلیم ایسا ہی دقیانوسی ناموزوں اور غیر مفید ثابت ہوگا جیسا کہ وہ ذکور کی صورت میں ہوا ہے۔ اور قوم کو قطعی طور پر ایک دفعہ اس بات کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ کہ ہماری لڑکیاں عہد جدیدہ کے زیادہ علمی ترقیوں پر تربیت حاصل کریں۔ وہ زمانہ بہت دور گیا جب کہ ہمارے سرگروہ اصحاب کا یہ خیال تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے سوال پر غور کرنے سے پہلے اپنی تمام طاقتیں لڑکوں کی تعلیم کی تکمیل پر صرف کی جائیں۔ ہم اس مرحلے سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں جب کہ اس قسم کا خیال اور عمل بلا خوف اس امر کے کہ ہندوستان میں ہماری ترقی کو نقصان پہنچے ہو سکتا تھا۔ زمانہ حال میں لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلنی چاہیئے اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ اگر اس اصول سے بے پروائی کی گئی تو ہم سخت مشکلات میں پڑ جائیں گے اور زندگی کی دوڑ میں ہمیں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا ہوگا۔

ہمارے قومی نظام تعلیم میں اس اصول پر زور دینے کی سخت ضرورت ہے اور عوام الناس کے ذہن کو اس اصول کی وقعت کو تسلیم کرنے کے قابل بنانا چاہیئے۔ بدقسمتی سے مسلمانان ہند کے خیالات اس مضمون کے متعلق نہایت ابتدائی مرحلہ پر ہیں اور اس کا دردناک اظہار حال ہی میں پنجاب میں ہوا تھا جب کہ انجمن حمایت اسلام کے نئے جاری کردہ مدرسہ زنانہ میں نصاب تعلیم میں انگریزی شامل کئے جانے کی تجویز کی مخالفت پر زور سے مناظرہ ہوا۔ اس سوال پر نہ صرف انجمن کے اندر بلکہ اس کے باہر بھی پرجوش مباحثے ہوئے۔ اور یہ دیکھ کر مجھ کو واقعی رنج ہوا کہ اردو اخبارات میں بعض مضمون نگاران نے جو اپنے آپ کو ایک باخبر نقاد ظاہر کرتے تھے لیکن دراصل ذکور و اناث کی تعلیم کے حقیقی مفہوم اور مسلمانان ہند کی خاص ضروریات کے بارہ میں نہایت ہی خام خیالات رکھتے تھے محض لایعنی لفاظی اور بے محل طول کلام سے کام لیا۔

ہماری درماندگی

ہندوستان کی دوسری قوموں نے مستورات کو زیادہ ترقی یافتہ اور جدید طریقوں پر تعلیم دینے کے لئے مسئلہ پر سرگرمی کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور ایسے صوبجات میں بھی جو میدان ترقی میں بہت پیچھے ہٹے ہوئے ہیں اس وقت بھی بہت کچھ تسلی بخش نتائج دکھا سکتے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں سکھوں کی جماعت جو ایک چھوٹی سی جماعت ہے مستورات کو تعلیم دینے میں مسلمانوں سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ اور اہل ہنود جو اس معاملہ میں سکھوں سے دوسرے درجہ پر ہیں ہم پر بہت کچھ فوقیت رکھتے ہیں۔ اس عرصہ پنج سالہ میں جس کا اختتام

سرکاری سال ۱۲-۱۹۱۱ء سے ہوا مسلمان لڑکیوں کی تعداد میں تعلیم کے ابتدائی درجہ میں ۶۵، ۹ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اور تعلیم کے وسطی درجہ میں ۴۸، ۱ فیصدی کا۔ حالانکہ اہلِ ہنود کے درمیان (جن میں سکھ شامل ہیں) اسی عرصہ میں علی الترتیب ۱۷-۱ اور ۴۰، ۶ فیصدی کا اضافہ ہے۔

صوبہ سرحد شمال مغربی میں بموجب رپورٹ تعلیم بابتہ ۱۳-۱۹۱۲ء مسلمانوں میں تعلیم نسواں نی الواقعہ تنزل پر ہے اور اس رجعت قہقری کے اسباب میں رواج پردہ اور سند یافتہ اساتذہ کی کمی شامل سمجھی گئی ہے۔ اس صوبہ میں درجہ پرائمری میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد بلحاظ تعدادی آبادی مستورات مسلمان ۸، ۲ فیصدی اور درجہ وسطی میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں حالانکہ ہندوؤں میں درجۂ پرائمری میں ۵، ۲۹ فیصدی تعداد ہے اور درجہ وسطی میں ۴، ۷ فیصدی ان صوبجات میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد جو پبلک مدارس میں تعلیم پاتی ہیں ۰۷-۱۹۰۶ء اور ۱۲-۱۹۱۱ء کے درمیان تقریباً دس فیصدی کم ہوگئی ہے۔ حالانکہ ہندو لڑکیوں کی تعداد اسی عرصہ میں تقریباً پچاس فیصدی بڑھ گئی ہے۔

پس اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر اقوام نسبتاً تعلیم نسوان کے معاملہ میں تم سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اور ہر جانب میں اس امر کی تازہ بہ تازہ شہادت موجود ہے کہ انھوں نے اس سمت میں اپنی کوششوں کو دو چند کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ تم کو بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔ اور تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس معاملہ میں جیسا کہ بہت سے دیگر معاملات میں ابھی آرام سے بیٹھنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ یا تو تم زور دے کر آگے نکلو نہیں تو تم پیچھے رہ جاؤ گے۔ عورت جیسا کہ مغرب میں ان معاملات میں بہت کچھ حصہ لے رہی ہے اسی طرح اُس کی قسمت میں مشرق میں بھی بہت کچھ حصہ لینا ہے اور ہم مسلمانان ہند کا فرض ہے کہ نظام معاشرت میں عورت کے صحیح درجہ کو کوشش کر کے ذہن نشیں کرلیں۔ ورنہ موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

بیگم صاحبہ بھوپال کی عملی ہمدردی

اس سلسلہ میں ہر ہائینس بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کی اُس گہری ذاتی دلچسپی کا جو اُن کو تعلیم نسواں میں حاصل ہے اور اُن شاہانہ عطیات کا جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کار خیر کی مدد کے لئے دئے ہیں ذکر کرنا اور یہ کہنا کہ ہم بیگم صاحبہ موصوفہ کے تہ دل سے ممنون و احسان ہیں۔ یقیناً آپ سب حضرات کے حقیقی جذبات کا اعلان کرنا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس ملک کے دیگر حکمراں رؤسا بیگم صاحبہ موصوفہ کی دریا دلی کی مثال کی تقلید کریں گے۔ اس موقعہ پر میرا فرض ہے کہ جناب مولوی سید کرامت حسین صاحب کا قوم کی طرف سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ شکریہ

ادا کروں۔ میرے خیال میں مولوی صاحب موصوف متوسط الحال مسلمانوں میں پہلے ہی بزرگ ہیں۔ جنھوں نے اپنے صوبہ میں تعلیم نسواں کے لئے ایک رقم کثیر وقف کر دی ہے۔ اور جو ایک ایسے معاملہ میں جو نہ صرف ہماری قوم کے لئے بلکہ کل ملک کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

اس کانفرنس کے شعبۂ تعلیم نسواں کے لئے بہتر ہوگا کہ جناب مولوی کرامت حسین صاحب کے طریقہ ہائے تعلیم کو بغور مطالعہ کریں اور اُن کے مطابق عمل کریں۔ کیونکہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس شعبہ کا کام پڑتال اور ترقی کا سخت محتاج ہے۔ اور علی گڑھ میں ہمارے مدرسۂ زنانہ سے جو نتائج آج تک حاصل ہوئے ہیں وہ تسلی بخش نہیں کہے جا سکتے۔

مسلمانوں کے تعلیمی عطیات | ایک دوسرا امر جس کا ہماری قوم کی تعلیمی ترقی سے ایک نہایت عملی تعلق ہے وہ اسلامی اوقاف تعلیم کا انتظام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس پر یہ ایک سخت الزام ہے کہ اُس نے اپنی عمر کے گذشتہ ۲۰ سال میں اس نہایت ضروری سوال کو کبھی چھوا تک بھی نہیں۔ حالانکہ اس ملک کے بعض حصوں میں مشکلات تعلیم سے ہماری نجات بہت کچھ اسی سوال کے درست طور پر حل کرنے پر منحصر ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم وسطی اور تعلیم اعلیٰ کی اشاعت کے متعلق ذرائع اور وسائل کا سوال ہمارے کام کرنے والوں کو ہمیشہ دقت میں ڈالنے والا ثابت ہوا ہے اور ہمارے سربرآوردہ لوگوں نے بڑے بڑے نازک موقعوں پر اس لئے صدائے یاس بلند کی ہے کہ قوم کے عوام الناس نے چندہ طلب کرنے پر سرد مہری ظاہر کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے کسی قدر وقت اور توجہ صرف کر کے کبھی اس سوال کو حل کیا ہو کہ موجودہ اوقاف تعلیمی سے جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پشتوں سے خدا پرست مسلمانوں کی دریا دلی سے موجود ہیں اور جن کی مسلسل بد انتظامی قوم کے لئے باعثِ رسوائی ہے قوم کی سخت ضرورتوں کے لئے اُن سے کیونکر فائدہ اٹھایا جاوے۔ تین سال ہوئے جب کہ کل ملک میں تجویز مسلم یونیورسٹی کی امداد میں چندہ جمع کرنے کے لئے ایک مسلسل کوشش کی گئی تھی۔ اس وقت ایک بڑے اینگلو انڈین اخبار نے سربرآوردہ مسلمانوں کی توجہ برمحل اس طرف دلائی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے خیراتی اور تعلیمی اوقاف سے بڑی سے بڑی رقمیں سالانہ وصول ہوتی ہیں۔ اور اگر ان اوقاف کا ٹھیک انتظام کیا جائے اور اُن کی آمدنی جائز مصارف میں لگائی جاوے تو ایک کیا کئی مسلم یونیورسٹیوں کے اخراجات کافی و وافی طور پر نکل سکتے ہیں۔ کیا آپ صاحبان کی دانش مندی پر یہ ایک دھبّہ نہیں

کہ ایک غیر مسلم اخبار نویس آپ کی کمزوریاں آپ کو جتائے اور آپ کو وہ عملی طریقہ بتائے جس کے سوائے اس ادق سوال کے حل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ آپ صاحبان کب تک اپنے صریح فرائض سے غفلت کرتے رہیں گے۔

اور قوم کثیر کو جو اصل واقف کی نیت کے مطابق ترقی تعلیم میں اور مسلمانوں کے بچوں کی دماغی اور اخلاقی ترقی میں صرف ہونی چاہئیں خود غرض غاصبوں کے ناجائز تصرف میں آنے دیں گے جو سب مستحقین اور متعلقین کے لئے باعث تہذیب اخلاق ہے۔

حکومت مصر کا ایک جدید انصرام | چند روز ہی گزرے ہیں کہ حکومت مصر نے ایک نئی وزارت قائم کی ہے۔ جسے وزارت اوقاف سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور مصر کی مسلمان آبادی نے اس تجویز پر نہایت گرمجوشی سے اظہار مسرت کیا ہے کیونکہ عام خیال ہے کہ انصرام اوقاف کا حکومت مصر کی زیر نگرانی رہنا زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ دستور قدیم کی رو سے مصر میں خیراتی اوقاف ایسے زبوں حالت کو پہنچ گئے ہیں اور ایسے شرمناک تغلبات کئے جاتے تھے کہ بہت سی درسگاہیں جن کے اخراجات کے لئے وہ اوقاف مخصوص کئے گئے تھے قلت سرمایہ کی وجہ سے خستہ حال ہو گئیں۔ ایک مصری اہل قلم نے رسالہ مشرق ادنیٰ (دی نیر ایسٹ) میں حال ہی میں اپنے ملک کے مذہبی اوقاف کی بدانتظامی کی ایک نہایت غمناک تصویر کھینچی ہے۔ اور شہرۂ آفاق جامع ازہر کے تنزل اور ابتری کو بھی اسی باعث پر محمول کیا ہے۔ حالت زمانہ کی یہ نہایت اطمینان بخش علامت ہے کہ حکومت مصر نے آخر کار اپنی توجہ اس اہم معاملہ کی طرف مبذول کی ہے۔ اور مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس وقیع اصلاح کو عمل میں لایا جاوے۔ اور چند خود غرض لوگوں کی ناراضی پر کچھ خیال نہ کیا جاوے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں بھی اب وقت آگیا ہے کہ اس طرف توجہ کی جائے اور ہم کو بلند حوصلگی اور استقلال کے ساتھ اس میدان میں قدم بڑھانا چاہیئے۔

ہم کو چاہیئے کہ ملک کے ہر حصہ میں اسلامی اوقاف تعلیمی کی تاریخ اور کارگزاریوں کے متعلق دقیقہ رس تحقیقات کا سلسلہ جاری کریں اور ایسے عملی انتظامات کریں جن سے ان اوقاف کا کام اصل واقف کی نیت کے مطابق چلا جاوے اور ان جماعتوں کو نفع پہنچایا جاوے جن کی منفعت کے لئے وہ اوقاف قائم کئے گئے ہیں۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کی طرف سے ایک نمایندہ کمیٹی اس تحقیقات کے لئے مقرر کی جائے۔ اور یہ کمیٹی مختلف صوبجات کے سربرآوردہ مسلمانوں سے اور اگر ضرورت ہو تو مقامی حکومتوں سے خط وکتابت کرے

اور اس معاملہ میں اُن کی معاونت اور ہمدردی سے فائدہ اُٹھائیے - یہ سوال ایسا ضروری ہے کہ جوش مخالفت پیدا ہونے کے خوف سے آپ صاحبوں کو اس فرض کے پورا کرنے میں پس و پیش کرنا چاہیئے - اگر آپ ذرا استقلال کو کام میں لائیں گے تو کچھ شک نہیں کہ قوم کے سمجھدار اور فہیم اصحاب آپ کے مددو معاون ہو جائیں گے اور ذرا سی اخلاقی جراُت دکھا کر آپ ایسی نمایاں کامیابیاں حاصل کریں گے جن کے لئے آپ کی آیندہ نسلیں اس کانفرنس کے نام کو ہمیشہ شکر و سپاس کے ساتھ یاد رکھیں گی۔

مسلمانوں میں تربیت نفس کی کمی کا نقص عظیم

حضرات اگر مجھ سے یہ دریافت کیا جائے کہ مسلمانان ہند کی موجودہ کوتاہیوں کو ایک مختصر جملہ میں ظاہر کرو تو میں جواب دوں گا .. .. "تربیت نفس کی کمی" میں جانتا ہوں کہ انسانی تحریکات ایسی وسیع اور رنگا رنگ صورتیں اختیار کرتی ہیں کہ اُن کی نسبت کوئی تعمیم کرنا جو کسی ایک دور زندگی کے بے شمار مظاہر پر حاوی ہو اکثر نہ صرف گمراہ کُن ہوگی بلکہ واقعیت کے خلاف بھی ہوگی - لیکن میرے خیال میں اس قدر ممکن ہے کہ کسی قوم کی اخلاقی اور مادی ترقی کے کسی مرحلہ میں اُس قوم کی اُن نمایاں خصوصیات کو معلوم کیا جا سکے جو کہ اس کے افکار و افعال میں تواتر کے ساتھ ہمیشہ ظاہر ہوتی رہتی ہیں - اور جو کہ اس وقت اس کو دیگر اقوام سے ممیز کرتی ہیں - مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو خاص طور پر تربیت نفس اور ضبط کی کمی کا مرض لاحق ہے اور چونکہ ہمارے قومی خصائل میں یہ بڑا نقص ہے - اسلئے ہماری خوبیاں بھی بعض اوقات عیوب بن کر ظاہر ہوتی ہیں اسکی مثالیں آسانی ہماری قوم کی دینی اور دنیاوی زندگی میں مل سکتی ہیں مراسم مذہبی کی پابندی میں انتہائی سرگرمی مسلمانوں کی نمایاں خصوصیت ہے اور احکام مذہبی کے صحیح منشا کے خلاف اُن کا اتقا بسا اوقات بے معنی صورت اختیار کر لیتا ہے وہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلام کے تمام احکام میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ دینی و دنیاوی غرض کو ایک معقول مناسبت سے مربوط کیا جائے اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں نہایت اور معاملات اُخروی میں بے حد انہماک کے خلاف ہے بلکہ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ہم تمام انسانی تعلقات میں خیر الامور اوسطہا کے پابند رہیں - ہمارے واعظین ہمیشہ اپنے مقتدیوں کو فرائض دینی کی تلقین کرنے میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں - اور اسی وجہ سے اُن کے مقتدی بعض اسلامی کی تعمیل میں غیر ضروری جوش دکھلاتے ہیں اور یہ ملحوظ خاطر نہیں رکھتے کہ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے ان فرائض کے متعلق کیا حدود قایم فرمائے ہیں اس طرح ہماری بہت سی قوت فضول ضائع ہو جاتی ہے - ہمارے دلوں میں زندگی کے بعض شعبوں کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہوتی جاتی ہے - اور دنیاوی ترقی کے راستہ میں جو مشکلات حائل ہوتی

ہیں اون پر غالب آنے میں ہماری قوم کوئی جد و جہد نہیں دکھلاتی۔ ایک لمحہ کے لئے اس طریقہ عمل پر خود غور کیجئے جس میں ہمارے دیندار برادران اسلام خیرات جیسے نہایت مفید مسلک کا غلط استعمال کر رہے ہیں طریقہ خیرات اختیار کرنے میں ہر شخص اپنے تئیں بالکل آزاد سمجھتا ہے محل خیرات کو دانائی کے ساتھ منتخب نہیں کیا جاتا۔ اُس کی تقسیم میں کسی خاص طریق پر عمل نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ کے باقاعدہ انتظام و اہتمام کے متعلق اگر کوئی ہدایت کی جاتی ہے تو اُس کی مخالفت ہوتی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہماری دولت اور رقوت بیدردی سے ضائع ہو رہی ہے جس کو مسلمان ذرا سے انضباط اور انتظام کے ساتھ اپنے عظیم الشان قومی کاموں میں لاسکتے تھے ہماری تعلیم گاہیں قلت سرمایہ کی وجہ سے ادھوری پڑی ہیں ایسی نہ رہتیں اور ہماری پستی کا مسئلہ اب تک ایک حد تک حل ہو گیا ہوتا۔

علاوہ ازیں اُن عظیم دقتوں پر غور فرمائیے جن کا مقابلہ ہم کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ خاص ملک عرب میں کرنا پڑتا ہے کیونکہ بکثرت ایسے مسلمان جو بوجہ غربت اخراجات حج برداشت کرنے کے قابل نہیں اور اسی لئے حج بھی اُن پر فرض نہیں کیا گیا ہر سال باصرار حجاز کو جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ممالک مقدسہ میں بحالت پریشانی ہلاک ہو جاتے ہیں یا اپنے ہمراہی صاحب استطاعت حجاج کے لئے بار گراں ثابت ہوتے ہیں اس طرح پر ہر ایک سال مسلمانوں کو بے حد مالی نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ یہ نقصان بآسانی رُک سکتا ہے اگر مسلمان صرف اتنی بات سیکھ لیں کہ اپنے جوش مذہبی کی طغیانی کو اسلام کے محکم اور صحیح اصول کے مطابق حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے دیں۔ مسلمانوں میں ایک بڑا نقص۔ متانت۔ اعتدال۔ ضبط۔ اور ایثار کی کمی کا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن کو تعلیم اسلام کی رُو سے انسانی اوصاف کی فہرست میں نہایت بلند مرتبہ دیا گیا ہے۔ انسان عبادات اور ریاضات میں ایسی خود غرضی اور افراط و تفریط کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ دنیاوی تعلقات میں اور اسی حقیقت کی تربیت مذہبی تعلیم کا اصلی منشا ہے۔

اگر ہم اپنی زندگی کے دنیاوی پہلو پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہو گا کہ ہماری تربیت نفس کی کمی اسلامی ترقی کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے ہمارے نوجوانوں کا تباہ کن نکتہ چینی کی طرف رجحان اور عملی کام سے بے توجہی اس نقص کا ایک نمونہ ہے اور اس ناخوش گوار میلان کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری قوم میں احساس ذمہ داری بہت کم زور ہو گیا ہے جس سے احتمال ہے

کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ پہنچے جو فی الحال پہنچ چکا ہے۔ نیز ذرا غور فرمائیے کہ وہ کثیر رقوم جو مختلف تحریکوں کے ذریعہ سے مسلمانوں سے جمع .... کی گئی ہیں اون کا کیا حشر ہوا ہے اور کس بے قاعدگی سے اُن کو صرف کیا گیا ہے۔ آپ حضرات کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو دیگر اقوام سے بہت کچھ اس امر میں سیکھنا ہے کہ کس طرح آپ قومی جوش کو کاروباری اصول پر منضبط کریں۔ تاکہ اولاً آپ کی ثروت اس طرح ضائع نہ ہو اور ثانیاً آپ اپنے روپیہ کو مناسب محل و موقعہ پر لگا سکیں یہ ہی ایک طریقہ جس سے ہم اپنی قوم کو ان اسباب کو صحیح طور سے سمجھنے کی تعلیم دیں۔ جو ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔

اُردو شاعری | انسانی تحریکات کا ایک اور شعبہ جس میں ہم مسلمان فقدان تربیت نفس کی وجہ سے نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ ہمارا علم ادب ہے اور اس سلسلہ میں میں آپ کی توجہ اپنی عاشقانہ شاعری کے ایک شعبہ کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ پُرانے طرز کے مسلمان اُردو شاعری کا معشوق خیالی جو انسانی حسن کا ایک اعلیٰ معیار سمجھا جاتا ہے ایک فوق العادت کرشمۂ قدرت ہے دہن مہندس کے نقطہ سے بھی چھوٹا اور جس کی کمر بال سے بھی زیادہ باریک۔ نقطہ کے ساتھ دہن کی تشبیہ کی مثال کے لئے تو میں اس فارسی شاعر کا ایک شعر پیش کرتا ہوں جس کے طرز بیان اور مذاق کی تقلید کی کوشش ہمارے اُردو شعرانے کی ہے ؎

کردی بہ نطق نقطۂ موہوم را دو نیم ✤ اے ناقص کلام حکیماں بیانِ تو

اور کمر کی تشبیہ کی مثال میں میں ایک اُردو شاعر کے ایک مشہور شعر کا حوالہ دیتا ہوں ؎

صنم کہتے ہیں تیرے بھی کمر ہے ✤ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔

اگر آپ حضرات ایک لمحہ کے لئے غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قلمرو ادب میں اس قسم کی شاعری جو شاعر کے انتہائی مبالغہ کے شوق کو ظاہر کرتی ہے۔ قوت شاعری میں تربیت ضبط کی فقدان پر دال ہے۔ اور جب آپ یہ بھی یاد فرمائیں گے کہ علم بلاغت کے جید مصنفین صنعت مبالغہ کو ان استعارات میں بلند مرتبہ دیتے ہیں جن سے ہماری شاعری میں خوبی اور قوت پیدا ہوتی ہے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ضبط و تربیت کا فقدان نہ صرف ہماری روزمرہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے بلکہ تخیل کے ان قدرتی سرچشموں میں بھی پایا جاتا ہے جو ہماری ذہنی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

ہیجان جذبات | شاعری کی نسبت ذکر کرتے ہوئے میں اس امر کے بھی اظہار سے باز نہیں رہ سکتا جو میری رائے میں ہماری تعلیمی مجالس کا نقص ہے اور جس سے یہ کانفرنس بھی مبرّا نہیں ہے

ہمارے سالانہ جلسوں میں یہ عام رواج ہے کہ سامعین کے جذبات کو جوش میں لانے مسلمانوں کی موجودہ نسلوں کو ان کی اس ذلت کا جس میں وہ بمقابلہ اپنے نامور بزرگوں کے گر گئے ہیں حال سنانے اور اس طرح اُن کی عملی ہمدردی کو قومی ترقی کی حمایت میں وابستہ کرنے کی غرض سے نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ اس مقصد سے ارفع کوئی مقصد نہیں اور کہ جس نیت سے ہمارے نوجوان شعرا یہ نظمیں تیار کرتے ہیں وہ ہر طرح سے قابل ستایش ہے۔ لیکن ہمارے کام کے طریقوں پر اور قوم کے مذاق پر اُس کا جو عملی اثر ہوتا ہے اُس کو ملاحظہ کیجئے۔ مشرقی اقوام میں تعصّبات کو متواتر تحریک دینے کے اثر سے جو جذبات پیدا ہو جاتے ہیں وہ کم وبیش عارضی ہوتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت سامعین پر ایک تخیّلی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جو بار بار پیدا ہونے کی وجہ سے طبیعت ثانی بن جاتی ہے۔ اور کسی عملی کارگذاری کے اجرا کی قوت جس میں جذبات کو دخل نہ ہو بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ماسوائے ان خاص موقعوں کے جب خطرہ کا احساس یا موقع کی اہمیت مسلمانوں کو کسی کام کرنے پر مجبور کرتی ہے عام طور پر مسلمانانِ ہندوستان اپنی عملی کارروائی کو دل گداز اپیلوں تک محدود رکھتے ہیں اور بحالت سکون ان اپیلوں کے عملی نتائج پر غور نہیں کرتے۔ اس قوم کو جس کے مزاج نے ایسی ترکیب پائی ہو دیگر اقوام سے جن کی طبیعت میں جذبات کو نسبتاً کم دخل ہے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ اس دارالعمل میں اِن اقوام سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کریں تو ان کو بہت کچھ بھلانا بھی پڑے گا۔ ایک بڑی ضرورت آپ کو یہ بات سیکھنے کی ہے کہ اپنے تعلیمی اور دیگر ہر قسم کے کام کو کاروباری اُصول کے مطابق سکون دل و دماغ کے ساتھ آتشِ تخیّل کی اس مضطربانہ شعلہ فشانی کے بغیر سر انجام دیں جس کا نتیجہ صرف دُھواں ہی دُھواں ہے۔ اگر بعض مقامات میں قوم کی خاص ضروریات آپ کو اس بات پر مجبور کرتی ہوں کہ اپنے کام کے پروگرام میں دلچسپی پیدا کریں تو کبھی کبھی شاعری کی چاشنی دینا بیجا نہ ہوگا۔ مگر اس چاشنی کا استعمال حدودِ اعتدال سے متجاوز نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ شاعری براہ راست مفید مطلب اور وہ وقت اور توجہ اس پر ضائع نہ کی جائے جو کسی زیادہ مستحسن مشغلہ میں صرف ہو سکتی ہے۔ تعلیمی تحریکات کو بھی جیسا کہ مغربی اقوام کا طریق عمل ہے کاروباری اُصول پر چلانا چاہئے اور جذبات کو بالکل پس پشت ڈال دینا چاہئے تعلیمی ضروریات کا بہ لحاظ موقعہ ومحل مطالعہ کرنا چاہئے۔ واقعات کو جانفشانی سے

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ شاعری میں نمک مرچ بھی لگایا جاتا ہے لیکن شعرا کی قابلیت کا کافی لحاظ رکھتے ہوئے بھی اس امر واقعہ کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اگر نظم تہذیب اخلاق کے بجائے صرف تفریح کا سامان ہی مہیا کر سکتی ہو تو ایک قوم کے ادبیات کی اعلیٰ ترین غرض مفقود ہو جاتی ہے اور وہی نظم جو روزانہ زندگی کے بے شمار حقایق پر مشتمل ہے اور جسے قوم کے اقتصادی وعملی حصۂ حیات پر عظیم الشان اثر حاصل ہے، بے سود ثابت ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نظم کی توہین نہیں کرنا چاہتا لیکن نظم سے میری مراد وہ مقدس نظم ہے جو براہ راست ہمارے قلوب پر اثر ڈالتی ہے اور ہمیں عوام کالانعام کے دائرہ سے نکال کر روحانی بلندی کی طرف لیجاتی ہے۔ بیماری یا اندوہ کی حالت میں اگر ہمیں ایک شعر یا ایک معنی خیز فقرہ سُنا دیا جاوے تو ہم ایک تازگی اور بشاشت محسوس کرتے ہیں لیکن اخلاقی یا روحانی ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے ایسے مادّی درجات مقرر نہیں ہیں جیسے ایک ظاہری حرکت کے اندازہ کے لئے ہو سکتے ہیں اور نہ یہ ترقی سطحی تازگی اور خوشی کی بنا پر متمیز ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس روحانی ترقی کا امتیاز صرف تبدیل ہیئت سے ہو سکتا ہے جس کی واضح مثال کے لئے میں آپ کو ایک انڈے کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ وہ رفتہ رفتہ ایک کیڑا بن جاتا ہے اور کچھ مدت کے بعد پر و بال نکال کر اُڑنے لگتا ہے۔ جو نظم اس قسم کا روحانی اثر نہ پیدا کر سکے وہ میرے نزدیک محض وقت اور قابلیت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ نظم کو انسانی طبیعت میں بڑا دخل حاصل ہے۔ وہ قلوب کو جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتی ہے، خیالات میں بلندی پیدا کر سکتی ہے اور انسان کو مادّی خود غرضی سے نجات دلا سکتی ہے اور جب اُس کا نصب العین درست ہو تو یہ اعلیٰ ترین طاقت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن بخلاف اس سے مقصود صرف یہ ہو کہ چند کوتاہ بین و پست خیال لوگ تھوڑے عرصہ کے لئے اس کی تعریف و توصیف کے نعرے لگائیں تو یہ یقیناً ایک مجسم بدی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعض اوقات مضمون واحد پر کچھ شعرا کے خیالات سے جماعتوں کے اخلاقی تنزل کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے مسلمانانِ ہند کی کمزوریوں پر ہمیشہ غور کیا ہے اور میرے نزدیک اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اُن میں "عزتِ نفس" کا مادّہ نہیں رہا۔ "قولِ مرداں جان دارد" سے زیادہ ترقی پر اُبھارنے والا اور کوئی مطمح نظر نہیں ہو سکتا، میں بوثوق کہتا ہوں کہ جب تک مسلمانانِ ہند اس دستور العمل پر کاربند تھے ہر قوم اُن کی عزت کرتی تھی اور وہ ہر قسم کی نیکی و شرافت کے مظہر تھے لیکن بعد میں جب اُن کے اس اعتقاد میں تنزل

نتائج کا قیاس ہوسکتا ہے کہ ادھر آگ دکھائی اور اُدھر بارود نے دھواں دے دیا۔ اس کے لئے اول ضرورت ہے پھاوڑے اور کدال سے بہت کچھ کام لینے کی کالجوں اسکولوں اور وظائف کے بہت کچھ کھاد ڈالنے اور تخم ریزی کرنے کی اور زمانہ دراز کے گڑے ہوئے تعصبات کی ناکارہ گھاس کے نرانے کی تب جا کر کہیں ہم کو اپنی محنت و جانفشانی کے پھلوں کے دیکھنے کی توقع کرنا چاہئے۔ جو حضرات اُن تعلیمی رپورٹوں کے مطالعہ کی تکلیف گوارا کریں گے جو مختلف مقامی گورنمنٹوں نے شائع کی ہیں میں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اس امر کو معلوم کر لیں گے کہ تعلیم نے بڑی حد تک ترقی کی ہے۔ لیکن اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جاوے حالانکہ اعداد و شمار کے موجود ہوتے ہوئے یہ نہیں تسلیم کیا جاسکتا کہ تعلیم میں کوئی قابل لحاظ اور قابل پسند ترقی نہیں ہوئی تب بھی مجھکو یہ تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہیں ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کے لئے اس کے بانی کی فہم و ذکا قابل ستایش و شکریہ ہی کم از کم اُن تعصبات کے جڑھ سے اُکھیڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے جو اُس دماغی تنگ دو کے حق میں مخالف رہے ہیں جس کی دور اندیش ہیٹنگز اور مخبر بنٹنک نے بنیاد ڈالی تھی۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ اگر کانفرنس نے اس کے سوا کچھ اور کام نہ بھی کیا ہو تب بھی اُس نے مسلمانانِ ہند کے ممنون اور محبت بھرے دلوں میں اپنے بانی کی اور اُن لوگوں کی یاد کو جاگزیں کر دیا ہے جنھوں نے بعد میں اس کی ترقی کے لئے سعی کی۔

مسلمانوں کا اخلاقی معیار

صاحبان! میں اب ایک مناسب حال مضمون کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو بادی النظر میں اگر مایوس کن معلوم ہو تو آپ مجھے معاف کریں گے۔ اخلاق اور تعلیم کے درمیان میرے خیال میں کوئی نمایاں تفریق کبھی نہیں کی گئی ایک شے دوسری پر موثر ہی اور پھر یہ دونوں خاص انحصار باہمی کی وجہ سے ایسے اجزا پیدا کرتے ہیں جن سے قومی وقار اور قومی خصوصیات بنتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک طرف نصف صدی کے جمود، تساہل اور تذبذب نے اور دوسری طرف تعصبات نے مسلمانانِ ہند کی جماعت کو پراگندہ و منتشر کرنے میں مدد دی ہو لیکن یہ صرف وہ امور ہیں جن سے اس حالت کی تشریح ہوسکتی ہے کہ کس طرح اُس قوم کی اولاد کو جو کسی زمانہ میں شاہی دہلی کی پر شوکت درباروں پر برسر حکومت تھی آج ہندوستان کی صف پائیں میں جگہ ملی یا اب اس وقت اس کا یہ درجہ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہی کہ مسلمانانِ ہند کا اخلاقی معیار بالعموم انحطاط کی طرف رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ کسی قوم کی خصوصیات علی العموم اس کے علم ادب میں منعکس ہوتی ہیں یعنی اُس علم ادب میں جو غیر کا نہ ہو بلکہ خود اسی قوم کا ہو۔

اسلام کے مقامات مقدسہ کے احترام پر نگاہ رکھیں گے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اس یقین دلانی نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے میں بڑا کام کیا ہے اور مسلمانوں کو اس روش پر قائم رکھنے کے قابل بنا دیا ہے جو موجودہ حالت میں صرف ایک ہی صحیح روش ہے۔ میرا مدعا سلطنت برطانیہ کی مستحکم وفاداری اور جاں نثاری کی روش سے ہی۔

سلطنت برطانیہ کے ساتھ ہماری وفاداری کی بنیاد

صاحبان! مجھے یقین ہے کہ کسی متنفس کو بھی ایک لمحہ کے لئے اس میں کلام نہ ہوگا کہ ہم حضور ملک معظم قیصر ہند کی زیر حکومت یکساں امن وامان رہتے اور محفوظ زندگی بسر کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اپنے مذہبی رسوم کی ادائگی میں، جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے، کوئی رکاوٹ یا مزاحمت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ ہم تاج برطانیہ کے ساتھ ایسی روش اختیار کریں جو ہماری غیر متزلزل اور لاجنب فاشعاری پر مبنی ہو

اے حضرات! مجھے یقین ہے کہ ہم سب کو اس بات پر فخر ہی کہ اپنی سلطنت کی حفاظت جیسے مقصد نیک میں ہماری ہندوستانی افواج اپنا مناسب حصہ لے رہی ہیں اور یوروپ کے میدان جنگ میں اپنی شجاعت بُردباری اور جاں نثاری سے یہ ثابت کر رہی ہیں کہ ہمارا اور انگلستان کا مقصد واحد ہی۔ تار برقیوں کے مختصر خلاصوں پر لحاظ کرتے ہوئے میرے خیال میں اس بات کے اظہار کے لئے کسی پیشین گوئی کی ضرورت نہیں ہے کہ خاتمہ جنگ یعنی امن وامان کا حصول کچھ بعید نہیں ہے۔ جرمنی کے جنگی دم خم کی کمر کم از کم اُس وقت سے ٹوٹ گئی ہے جب کہ اُس کو پیرس کی طرف سے پیچھے ہٹ جانا پڑا، اور گو ابھی وہ وقت دور ہے کہ ہم کو ان مشکلات سے نجات ملے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتحادیوں کی متفقہ افواج نے اگر اسی طرح چند اور شکستیں دیں تو یوروپ میں امن وامان پھر قائم ہو جاوے گا۔ موجودہ حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم تاج برطانیہ کے وفادار رہیں اور اس مقصد نیک کے حصول میں جو انگلستان کا ہے تمام امکانی خدمات سے دریغ نہ کریں۔

مجالس تعلیمی کی قدر وقیمت

صاحبان! میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں کہ عجلت پسند نکتہ چیں یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ آخر کانفرنسوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور ان کانفرنسوں نے مسلمانوں کی یا مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کیا خدمت انجام دی ہے؟ صاحبان! تعلیم ایک پودا ہے جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے کسی مشین یا کل کی تیز رفتاری کی طرح سے اس کے نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی اور نہ بارود کی سی تیزی پر اس کے

جو حد بیان سے باہر ہے کہ زمانۂ حال کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابیاں اس کی "مادیت" کے عنصر کا غلبہ اور تمام دیگر خیالات پر مطلب پرستی کے قابل اعتراض عقیدے کو ترجیح دینا ہے۔ ہر ایک تعلیمی تحریک کی پائیداری اس کی مذہبی رنگت ہے۔ ہمارے سادہ مشرقی خیال کے مطابق کوئی تعلیم مکمل نہیں ہوتی تا وقتیکہ اس کی بنیاد انسان کے عقائد مذہبی پر نہ رکھی گئی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں لوگ مادّہ پرستی کی طرف اندھا دھند اور بے بس ہو کر دوڑ پڑے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس بات سے مدبران مشرق و مغرب ڈرتے اور خوف کھاتے تھے آخر کار وہی پیش آئی اور آتش جنگ نے خوفناک طور پر افروختہ ہو کر خدائی زمین کی لہلہاتی بہار کو تہس نہس کر دیا۔ گویا معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسیح کے اُس روایتی ہزار سالہ زمانہ سے جس کو انگریزی شاعر نے ذیل کے دو مصرعوں میں ظاہر کیا ہے اسی قدر بعید ہیں جتنے کہ پہلے کبھی تھے ؎

"جبکہ مجلس بنی نوع انسان اور تمام عالم کے اتحادی دربار میں جنگ و جدل کے علم کھول دئیے جائیں گے"

لیکن اس امر کے تسلیم کرنے میں کلام نہیں ہو سکتا کہ اس عظیم الشان تباہی و بربادی کا حقیقی باعث جرمنی کا اصول "جنگ پرستی" ہے اور لکھو کھا بنی نوع انسان کی زندگیوں کی بے رحمانہ تباہی و قتل و غارت گری کی ذمہ داری خدا اور بندوں کے سامنے صرف جرمنی ہی پر ہے۔ انگلستان کو اگر اس خوفناک غارت گری میں شرکت کرنا پڑی ہے تو اپنے تحفظ حقوق کے لئے اور اس لئے کہ اپنے روایات قدیمہ کی بنا پر اس کو کمزوروں کی حمایت میں جنگ کرنا اور بنی نوع انسان کے مقصد انصاف کی پشت پناہی کرنا ہے۔

انگلستان کا مقصد مبنی بر انصاف تھا

بدقسمتی سے اس مصیبت (جنگ) نے ایک مختلف شکل اختیار کی ہے کہ ٹرکی نے ناعاقبت اندیشانہ طور سے اپنی قسمت جرمنی و آسٹریا کے ساتھ وابستہ کر دی ہے جو انگلستان اور اُس کے حلیفوں کے ساتھ برسرپیکار رہیں۔

صاحبو! اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ معاملہ نہایت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے اور مسلمانان ہند کے لئے یہ موقع نہایت آزمایش کا ہے۔ لارڈ ہارڈنگ بالقابہ جیسے ممتاز مدبر کی فہم و ذکا قابل ستایش ہے جن کے دست مبارک میں اس وقت ہندوستان کی زمام حکومت ہے اور جنھوں نے ہمیں یہ یقین دلایا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ وقوع میں آئے انگلستان اور اس کے اتحادی

بالیقین میں اس کو ایک اعلیٰ اعزاز تصور کرتا ہوں کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت قبول کرنے کے لئے مجھ سے ارشاد کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی اس جگہ، کم از کم اس حیثیت میں، حاضر نہ ہوتا اگر مجھے گزشتہ تجربہ کی بنا پر یہ معلوم نہ ہوتا کہ مسلمان سامعین ایک ایسے شخص کی تقریر کو کس تلطف آمیز طریقہ سے سنتے ہیں جس کی دماغی قابلیتیں خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں لیکن یقین جانئے کہ اس کے دل میں ملک اور قوم کے مشترکہ مقصد کو محسوس کرنے میں اُن حضرات میں سے کسی سے کم تڑپ نہیں ہے جن کے اسمائے گرامی اس طولانی اور ممتاز فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے گزشتہ مواقع پر ایسے اجلاسوں کی کارروائی کی رہ نمائی کی ہے۔

اکابرین قوم کا اثر افسوس ہے کہ اُن اکابر میں سے جو مسلمانانِ ہند کی شاہ راہ تیار کرنے والے اور ''صدہا قرون کے معلمین'' تھے ہم سے جدا ہو گئے۔ لیکن اُن کا اقتدار اب تک قائم ہے اور عرصہ دراز تک قائم رہے گا، تاکہ منازل الحیات میں وہ ہماری رہ نمائی کرے ہمیں روشنی بخشے اور ہماری ہمت افزائی کرے۔ داغ بیلیں جو وہ لگا گئے ہیں اور یادگاریں جو وہ چھوڑ گئے ہیں بکثرت ہمارے سامنے موجود ہیں اور ان سے اُن کی ذکاوت اور ذہانت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

جنگ اے حضرات! ہم آج ایسے زمانہ میں مجتمع ہوئے ہیں جب کہ ہمارے سروں پر ایک مصیبت کبریٰ کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ جنگ جو یورپ میں ہو رہی ہے وہ بلاشبہ ایسی خوفناک ہے کہ جس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتی۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم لفظ ''تہذیب و تمدن'' سے موسوم کرنے کا اشتیاق رکھتے ہیں وہ ایسی کم زور و ناطاقت شے ہے کہ وہ اُس جوع الارض کے طوفان اور حملوں کو نہیں روک سکتی جو ازمنۂ ماضیہ میں کسی نہ کسی شکل میں تباہ کن جنگوں اور حملوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ نہ تو اس کا یہ موقع ہے اور نہ وقت کہ اُن اسباب پر پوری پوری بحث کی جاوے جو اس جنگ کا باعث ہوئے ہیں۔ یہ اسباب نہایت کثیر اور مختلف النوع ہیں، اور میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ایک تعلیمی مجلس ہرگز ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ان کے متعلق کوئی مطول و مبسوط بحث کی جا سکے۔ لیکن بحیثیت ایک ایسے شخص کے جس نے قدیم طرز کی روایات میں پرورش پائی ہو میں اپنی اُس رائے کے اظہار کی جرأت کرنا چاہوں گا جس کو میں ایسے گہرے یقین اور عمیق اعتقاد کے ساتھ محسوس کرتا ہوں

خطبۂ صدارت

خواتین وحضرات! ایسے لمحے بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جب کہ اسکو کام یا فرض کی انجام دہی کے متعلق جواس پر عائد ہوتا ہے اپنی دماغی ناقابلیت کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اس وقت میرے اوپر بھی ایسا یا تقریباً ایسا ہی احساس غالب ہے۔ یہ پنڈال جو سرسید احمد جیسے نیک نہاد و عاقل و فرزانہ، نواب محسن الملک جیسے روشن دماغ فصیح و بلیغ، رائٹ آنریبل سید امیر علی جیسے برگزیدہ فرزند ہند و ممتاز مقنن، مولوی نذیر احمد صاحب جیسے جید عالم، نواب عماد الملک جیسے فاضل و اہل الرائے اور ہمارے پنجاب کے فخر قوم آنریبل مسٹر شاہ دین جیسے ممتاز جج کی فصاحت و بلاغت سے گونجتا رہا ہے بلا اظہار تصنع مشکل سے اس شخص کے لئے جگہ ہوسکتی ہے جس کی مصروفیاتِ زندگی ایک دوسرے دائرہ اور ایک مختلف احاطہ میں رہی ہوں جب اُن معیاروں کا خیال کیا جاوے جن کی بنا پر آپ کے بہت سے صدر نشین منتخب کئے جاچکے ہیں، جن میں سے صرف چند کا میں نے نام لیا ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کا یہ انتخاب کوئی خوش گوار انتخاب نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ میں بھی کالج کا ایک ٹرسٹی ہوں اور میرا تعلق کبھی کسی زمانہ میں کسی نہ کسی طرح پر تعلیمی تحریکات سے رہا ہے لیکن نفس الامر میں میرا تعلق پبلک لائف سے نسبتاً خاموش طرز کا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ حضرات نے یہ خیال کیا ہو کہ ایک ایسے شخص کے خیالات و آرا کو معلوم کریں جو آپ کے حلقہ سے باہر کا ہو، اور میرا گمان ہے کہ آپ کا یہ انتخاب ممکن ہے کہ کسی جدید اور غیر معمولی توجہ اور لحاظ کی بنا پر ہوا ہو، اور آپ کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ ایک تماشائی یا اکھاڑے سے باہر کا شخص بسا اوقات اُس شخص سے بہتر طور پر کھیل کا اندازہ لگا سکتا ہے جو خود کھیل میں شامل ہو۔

صاحبان! اگر آپ کا ایسا ہی خیال ہو تو میں اس عزت افزائی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جو آپ نے اپنی انجمن کا صدر نشین منتخب کرکے مجھے بخشی ہے گو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس ذمہ داری کے بوجھ سے میں دبا جاتا ہوں جو قدرتاً مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

اُنھوں نے ہمیشہ سادہ اور عملی زندگی کو اپنا نصب العین قرار دینے کی کوشش کی وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے پابند مذہب اور با اخلاق مسلمان ہیں۔ جب وہ ریاست میں بااختیار اور ذمہ دار حاکم تھے اُس وقت سے مختلف ملکی انسٹی ٹیوشن اور قومی درس گاہیں اُن کی روشن خیالی فراخ قلبی اور ہمدردی کی رہین منت ہیں اور رہیں گی وہ آج اُس چیفس کالج لاہور کی مجلس انتظامی اور کونسل کے رُکن ہیں جس میں کبھی ان کی حیثیت ایک معمولی مدرس کے درجہ پر تھی وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ و کونسل کے ممبر اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے لائف ممبر ہونے کے علاوہ انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرت سر کے صدر رہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی زندگی میں مرحوم کی تحریک و کوشش سے پچاس ہزار کا سب سے بڑا عطیہ مجلس ندوۃ العلماء کی جماعت کو دارالعلوم ندوہ کی تعمیر میں بھاول پور کی محل سرا شاہی کی جس خاتون محترم نے عطا کیا تھا وہ آپ کی اس عملی دلچسپی کا نتیجہ تھا جو آپ کو اس مذہبی علمی مجلس اور اس کے دارالعلوم کے ساتھ ابتدائے کار سے آج تک مسلسل طور پر وابستہ کئے ہوئے ہے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس و دیگر مجالس ہائے قومی کی صدر نشینی کی عزت بھی بارہا ان کو مل چکی ہے۔

چنانچہ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۹ء کے اجلاس ہائے کانفرنس منعقدہ راول پنڈی و خیرپور اسٹیٹ میں وہ دو مرتبہ صدر بنائے گئے اسی طرح ۱۹۱۵ء میں بمقام لکھنؤ اجلاس ندوۃ العلماء کی صدارت فرمائی ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء میں انجمن مسلم راجپوتانہ پنجاب کی انجمن کے صدر تھے۔ آل انڈیا تنظیم کمیٹی کے عارضی طور سے اور آل انڈیا تبلیغ الاسلام کے مستقل صدر رہیں۔

سال گزشتہ میں اضلاع اودھ اور ممالک متحدہ آگرہ کے اکثر مشرقی اضلاع کا تنظیم کمیٹی کے سلسلہ میں مسلسل طور پر کئی مہینے آپ نے دورہ کر کے قوم کو دعوتِ علم و عمل دینے کی کوشش فرمائی ہم نے بہت سے قومی کام کرنے والوں کے جوشِ عمل کو دیکھا ہے قومی خدمت کے لئے پیرانہ سالی میں اس عظیم جفاکشی اور شہر شہر مہینوں دورہ کرنے کی جو مثال انھوں نے پیش کی ہے یہ مثال ان جیسی حیثیت کے لوگوں میں نظر نہیں آتی غرض بہترین اخلاق اور خصائص عملی کے لحاظ سے سر موصوف کا کارنامۂ حیات قومی ہمدردی " سیلف ہیلپ " اور خودداری کے لحاظ سے قوم میں ایسا زندہ نمونہ ہے جو ہر لحاظ سے قابل تقلید اور لائق عمل ہے۔

کی ملازمت سے وابستہ ہو گئے اور پانچ برس تک پوری وفاداری اور قابلیت کے ساتھ ۱۸۹۷ء میں اس ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی مدت ملازمت کے لحاظ سے وہ مستحق پنشن نہ تھے لیکن ان کی عمدہ خدمات نے خاص پنشن کا مستحق بنا دیا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ اپنے وطن میں خانہ نشیں رہے اس کے بعد ضلع مظفر نگر اور کرنال کی ریاست منڈال کے منیجر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۳ء تک فرائض منیجری انجام دے رہے تھے جو اس دوران میں ہز ہائینس نواب صاحب بھاول پور نے دوبارہ یاد کر کے پرائیوٹ سکرٹری کی خدمت پر طلب کر لیا، اور ایک سال کے اندر ریاست کے چیف جج مقرر ہوئے، اور پھر ۱۹۰۵ء میں فارن سکرٹری کے عہدہ پر ممتاز کئے گئے۔ اُنھوں نے اپنی محنت، دیانت، وفاداری اور اعلیٰ درجہ کی قابلیتِ انتظامی کے لحاظ سے اور اپنے مضبوط کیرکٹر کی وجہ سے اپنے اعتبار اور وقار میں حیرت انگیز ترقی کی یہاں تک کہ جب نواب صاحب کا انتقال ہوا اور ریاست میں انتظامی کونسل کا تقرر گورنمنٹ پنجاب کے زیر نگرانی عمل میں آیا، تو ۱۹۰۷ء میں کونسل آف ریجنسی کی صدارت عظمیٰ کا عہدہ آپ کو پیش کیا گیا۔ جنھوں نے برسوں اس عہدے کے اہم فرائض کو اس وقت تک جب تک کہ رئیس حال بااختیار نہ بنائے گئے پوری خوش اسلوبی پوری وفاداری اور اعتماد باہمی کے ساتھ انجام دینے کی کامیاب اور نیک نام کوشش کی۔ ایک طرف برٹش گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام نے ان کی خوش انتظامی تدبر کو تسلیم کیا تو دوسری طرف وہ رئیس اور ریاست کے پورے وفادار اور خیر اندیش ثابت ہوئے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی بڑی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں رئیس، رعایا اور حکام کی نظروں میں اعتبار اور عزت کی نظر سے دیکھے گئے انھیں خدمات جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۰۹ء میں ان کو سی، آئی، ای کے خطاب سے گورنمنٹ انگریزی نے سرفراز کیا۔

۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے سنٹرل پبلسٹی بورڈ میں بطور ایک مسلمان ممبر کے آپ کا تقرر ہوا اور جنگ عظیم کی خدمات کے صلہ میں جو ریاست نے انجام دی تھیں ۱۹۱۹ء میں کے سی آئی ای بنائے گئے اس کے علاوہ متعدد اسناد و تمغہ جات و نشانات اعزازی بہت سے مواقع پر برٹش گورنمنٹ سے حاصل کئے اور اب زمانہ دراز کے بعد خدمات ریاست سے جدا ہو کر بحصول پنشن و انعام خاص مختلف ملکی و قومی خدمات میں حصہ لے رہے ہیں۔

پیش کئے۔ جس نے تعمیر روضہ ممتاز محل سے انسانی محبت کے نہایت مستقل مظہر کو جاودانی کر دیا۔ یہ روضہ عقیدت۔ امید۔ محبت اور حسن و خوبی کی ایک کامل اور مجسم تصویر ہے۔ جس کی ہستی نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم کے لئے موجب ناز و فخر ہے۔ وہ بے نظیر عمارت جس کا عالی شان گنبد صبح سرما کی صاف اور خوش گوار ہوا میں تلا ہوا ہے اور جس کے بلند مینار آفتاب عالم تاب کی کرنوں میں چمک رہے ہیں۔ آپ صاحبان کے سامنے کھڑا ہے۔ اور اگر آپ صاحبان ایک لمحہ کے لئے غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ عمارت ایک دل فریب ادا کے ساتھ پاکیزگی اور لطافت محبت اور ایثار کے اعلیٰ ترین نصب العین کو جو ہمیشہ حقیقی تعلیم کا مدعا مقصود رہے ہیں اور رہیں گے آپ کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

ایک طرف تو سکندرہ سے اور دوسری جانب روضے سے یہ ہر دو اُولوالعزم شاہانِ مغلیہ آپ صاحبان کی کارگزاری اور روئداد کو ہمدردی اور قدردانی کی نگاہ سے ملاحظہ فرما رہے ہیں اُن کی روحیں آپ صاحبان کے درمیان موجود ہیں۔ اب یہ دکھانا کہ آپ حضرات ان کی طرف سے دعار خیر و برکت لینے کے کس حد تک مستحق ہیں۔ آپ کے اُس طریق عمل پر منحصر ہوگا جس سے آپ اپنی ذمہ داری آج سرانجام دیں گے۔ فقط۔

کرنے سے اسلامی ذہن اور اسلامی شعائر پر ان کو زیادہ تبصر حاصل ہو جائے گا۔ جو آج کل ان کے لئے راز سربستہ بنے ہوئے ہیں اس وقت ذہنی ہمدردی کی کشش اہل مشرق اور اہل مغرب دونوں کو قریب تر لے آئے گی۔ جو دونوں کے فائدہ سے خالی نہیں۔ اور ممکن ہے کہ انگریزی شاعر کی شکیبانہ پیشینگوئی کے خلاف یہ دونوں اقوام ایک دن مل جائیں۔

خاتمہ تقریر | اے حضرات! مسلمانان ہند کے لئے آگرہ جہاں آج ہم جمع ہیں ایک دلکش نام ہے جس کے گرد اسلامی تہذیب و تمدن کی بعض بہترین روایات جمع ہیں اور یہ بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ صاحبان ان تاریخی نظاروں اور منظروں سے جو آپکے گردوپیش ہیں متاثر ہوں۔ اس سرزمین کا چپہ چپہ آپ حضرات کو زمانہ شجاعت کی جوش انگیز یاد دلاتا ہوگا۔ جبکہ ہمارے برادران اسلام نے قابل تحسین تحمل و استقلال کے ساتھ اس زمانہ کی سختیوں اور مصیبتوں کا سامنا کیا اور مضبوط ارادے اور دلیری کے ساتھ فنون جنگ اور فنون امن کو ترقی دی اور مدت مدید تک تمدنی زندگانی کا ایک اعلیٰ معیار قایم رکھا۔ اسوقت جبکہ سلطنت مغلیہ کی طاقت کا جزر انتہائی پستی کو پہنچ گیا تھا۔ شہنشاہ اکبر کی منتظمانہ دانشمندی کی بدولت منتشر عناصر پھر مجتمع ہو گئے۔ اس بدنظمی کی بجائے نظم و نسق کا ارتقا ہوا اور وہ انتظام و اہتمام حکومت وضع ہو کر مکمل ہوا جو آج کے دن تک ہندوستانی مدبرین کے لئے باعث حیرت واستعجاب ہے۔ اُس کی شاہی حفاظت و نگہداشت کے زیر سایہ علوم و فنون نے وہ معراج کمال حاصل کی جس سے مسلمانان ہند پہلے آشنا نہ تھے۔ اور یہ اُسی بادشاہ کا دست اقتدار تھا جس نے اقوام ہند کو ایک بنانے کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس کا قیام اس پریشان کن سرزمین جہاں اب تک مختلف اقوام و مذہب کی جدوجہد اور مخالفت زور و شور پر ہے۔ اقوام ہند کو ایک بنا دینا ایک ایسی خواہش ہے جس کی تکمیل کی آرزو ہر قابل مدبر ملک کو رہے گی۔

کچھ عرصہ بعد تخت مغلیہ پر شاہجہاں سلطان عظیم الشان نے جلوس فرمایا جس نے کہ ہندوستان کو ایسی سلامتی اور امن سے بہرہ یاب کیا جس کی فتوحات جنگ وجدال کی فتوحات سے کم نہیں اس نے راست بازی اور علم و کمال کی سرپرستی کی اور قدیم حسب و نسب اور دولت و ثروت کے مقابلہ میں لیاقت و قابلیت کی قدر افزائی کی جس نے علم و ہنر کو شہزادوں کی تعلیم و تدریس میں داخل کیا اور اہل دنیا کے سامنے حسن و خوبی کے بہترین نمونے

درجہ فوقیت دینے میں میں نے اس مسرت انگیز پہلو کو بھی مدِ نظر رکھا ہے کہ علم کی روشنی رفتہ رفتہ دنیائے اسلام کے دیگر حصص میں بھی پھیل رہی ہے اور ہر چہار طرف اہل اسلام میں ایک عام بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ اور اپنی اصلاح کے لئے اُن میں سچی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔

اسلام کے مستقبل کے لئے یہ ایک مبارک فال ہے کہ ایشیائے روس کے بعض حصوں میں حتیٰ کہ چین کے دور دراز صوبجات میں بھی بیدار مغز اور سربر آوردہ مسلمان اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے قومی مدارس کھول رہے ہیں۔ اور دیگر ہر قسم تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔ جو اُن کی مقامی ضروریات کی تکمیل کے لئے مناسب ہیں۔ ٹرکی نے تعلیم جدیدہ میں پہلے ہی سے نمایاں ترقی حاصل کر لی ہے اور خاص طور پر قابل ذکر یہ امر ہے کہ ٹرکی خواتین تحصیل علم اور اپنے ملک کی اخلاقی اور معاشرتی ارتقا میں شوق سے عملی حصہ لے رہی ہیں۔ مسلمانان مصر بھی رفتہ رفتہ زمانہ جدید کی اعلیٰ تعلیم کے فوائد کی قدر کرنے لگے۔ دارالعلوم الازہر کے طریقہ انتظام میں یورپین طرز عمل پر کاربند ہونے کی نئی تحریک بھی ایک نہایت مفید تعلیمی اصلاح کا آغاز ثابت ہو گی۔ لیکن وہ واقعہ جو علمی نقطہ خیال سے خاص اہمیت رکھتا ہے یہ ہے کہ سلطان المعظم نے حال ہی میں فرمان صادر کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک یونی ورسٹی قایم کی جائے اگر یہ یونی ورسٹی محکم حصول تعلیمی پر قایم کی گئی اور چلائی گئی تو اس کے سنگ بنیاد کی رسم جس کو شیخ شاویش بہ موقعہ نوروز انجام دیا ہے اسلامی ترقی کی تاریخ میں ایک قابل یاد زمانہ کا آغاز ہو گی۔

مدینہ منورہ میں ایک مکمل دار العلوم کے ممکن فوائد یقیناً بہت بڑے ہیں اور عمدہ انتظام کے ماتحت دنیا کے حصوں میں پست حال مسلمانوں میں روشن خیالی کی اشاعت کے لئے زبردست ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ مسٹر برائس جیسے انگریز مدبر اہل قلم نے حال ہی میں اسلامی تعلیمات کا ایک اسکول بمقام قاہرہ جاری کرنے کی ضرورت ظاہر کی ہے اور یہ بات نہایت قابل اطمینان ہے کہ انگلستان اور یورپ کے اہل علم نے بھی اس تحریک کا خیر مقدم کیا ہے۔ اگر مسٹر برائس کی تجویز پر عمل کیا گیا اور قاہرہ میں ایک اسکول اُن اصول پر کھول دیا گیا جن پر ایتھنز میں برٹش اسکول جاری ہے تو وہ مغرب کے طلبا اور مدبرین کے لئے ایک مفید تربیت گاہ ثابت ہو گا۔ کیونکہ اسلامی السنہ اور ادب کا بغور مطالعہ

آیندہ کی عالمگیر تحریکات کے زیادہ مناسب حال نمونہ پیدا کرنے کی قابلیت حاصل کرنے کے واسطے ورکار ہیں ہم مسلمانان ہند کو ترقی کے لئے خاص موزونیت حاصل ہے۔ اول تو یہ بات ہے کہ خوش قسمتی سے ہم ایک شایستہ وستور حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں جس کی باگ مغرب کی نہایت ترقی کن اور عملی قابلیت رکھنے والی قوم کے ہاتھ میں ہے جو ہماری رائے اور قول وفعل کی کامل آزادی کی کفیل ہوگئے ہیں اور جنھوں نے عہد جدید کی ایک نہایت مالامال زبان کی بدولت علم وہنر کی بے بہا خزانوں کی تحصیل کے لئے بہترین وسائل وذرائع تک ہماری رسائی کر دی ہے جن کے مدبرانہ طریقے ہمارے علم۔ وقار۔ اور ضبط کی نہایت سبق آموز مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جو آپ ہی حضرات کے بزرگان دین کے بعض نہایت عمدہ اور شایستہ ارشادات پر کاربند ہو رہے ہیں۔ اور جو نمونہ بن کر ہمیں دکھلا رہے ہیں کہ اقوام مغرب کی عملی ہمدردی خلق اللہ مشرقی اقوام کی محض خیالی روحانیت کے مقابلہ میں کیسے ارفع واعلیٰ ہیں۔ ایسے مہذب قوم کے ماتحت اور رہنمائی میں رہنا سراسر آپ ہی حضرات کے لئے مفید ہے۔ اور میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ خداوند قدیر کا دستِ قدرت اس انتظام میں ایک عظیم منشا کی تکمیل کے لئے کام کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام اہم تعلقات میں ہمیں یہ ایک بے اندازہ فائدہ حاصل ہے کہ مشرق میں ہم ایک نہایت دانشمند متمول اور نکتہ رس قوم کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رکھتے ہیں۔ جن کو زمانہ قدیم کی نادر تہذیب پر فخر حاصل ہے اور جس کا مستقبل عظیم ممکنات اور روشن توقعات سے لبریز ہے۔ فرزندان اسلام کا ایک ایسی قوم کے ساتھ سابقہ پڑنا تاریخ میں ایک نہایت اہم واقعہ ہے اور میں یقین نہیں کر سکتا کہ دو مشرقی اقوام وادیان کا یہ ایک محض اتفاقیہ اجتماع ہے جس کا نسل انسانی کی بہبودیٔ آیندہ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ میرے خیال میں عربی تمدن اور آرین تہذیب کا ہندوستان میں ایک جا جمع ہونا دو نہایت زبردست دماغی چشموں کا اتصال ہے اور مغربی تہذیب کی محرک اور شایستہ تاثرات کے ماتحت مشرقی ذہن کی آیندہ زرخیزی کی توقع ایک ایسا امر ہے جس پر مسلمانان ہندوستان اپنے تئیں مخلصانہ مبارکباد دے سکتے ہیں۔ آج دنیا میں کونسی اسلامی جماعت ہے جس کو ایسے موزوں وسائلِ ترقی حاصل ہیں اور جو ان کی برابر نسل انسانی کی اخلاقی اور ذہنی آزادی میں حصہ لینے کی توقع رکھتی ہے۔

دنیاسے اسلام کی تعلیمی ترقی | مسلمانان ہند کو بہ لحاظ اُن مواقع کے جو اُن کو ترقی کے لئے حاصل ہیں

تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی تا وقتیکہ ایک ایسا طاقتور اور وسیع نظام اُس کی حمایت میں نہو جو ایک کثیر التعداد جماعت کی دلچسپیوں اور کششوں کو مجتمع کرکے اُن سے جلب منفعت کرسکے اور اسی اصول کو مدنظر رکھ کر کانفرنس کو بھی اپنی طاقت اور حلقہ اثر کو تقویت پہنچانی چاہیئے۔ ہر صوبہ میں ایک مستقل تعلیمی کمیٹی قایم ہونی چاہیئے۔ جس کو پراونشل اسٹینڈنگ کمیٹی کہا جائے اور جو براہ راست اور متواتر علی گڑھ سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے زیر اثر ہو اور جس کی سرپرستی میں ہر سال ایک پراونشل کانفرنس منعقد کی جائے جس میں تمام ضروری تعلیمی مسائل پر غور کیا جائے جو خاص اُس صوبہ کے مسلمانوں کے لئے اہمیت رکھتے ہوں۔ ہر پراونشل کمیٹی کے ماتحت اضلاعی کمیٹیاں بڑے مقامات اور مقصلات میں قایم کی جائیں اور مقتدر اور بارسوخ مسلمان اُس کے ممبر بنائے جائیں اور یہ اضلاعی کمیٹیاں پراونشل کمیٹی کی ہدایت کے بموجب پراونشل کمیٹی سے مل کر کام کریں اس طرح تمام ملک میں اسلامی تعلیمی کمیٹیوں کا سلسلہ قایم ہو جائے گا اور اس صورت میں یہ بھی ممکن ہوگا۔ جس کے ذریعہ سے اس کانفرنس کے لئے بیشتر حصۂ ملک پر اثر ڈالنا آسان ہو جائے گا۔ اور اس صورت میں یہ بھی ممکن ہوگا کہ ہم عملی کام کا سلسلہ سال بھر جاری رکھ سکیں جس کے بغیر تعلیم میں قابل امتیاز ترقی کرنا دشوار ہے۔ جو کام ہم اس وقت کر رہے ہیں وہ صرف اسی قدر ہے کہ کسی بڑے شہر میں کانفرنس کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ منعقد کرکے چند تجاویز پاس کر دیتے ہیں۔ آج تک کوئی قوم محض بلند پرواز تجاویز کو کاغذ پر لکھنے سے فلاح کو نہیں پہنچی اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ یہ کانفرنس محض تجاویز پاس کرنے کے بجائے ان کو عملی صورت میں لانے کے لئے زیادہ چستی دکھائے۔

ہمارے نادر مواقع ترقی

اس وقت ہمیں نادر مواقع حاصل ہیں کہ ہم اپنی کوششوں کو اس سمت میں بارآور کریں۔ مسلمانان ہند میں ایک بیداری پیدا ہوگئی ہے۔ اور اگر ہم تعلیم کو اپنے قومی پروگرام میں سب سے اول جگہ دیں اور اپنی قوتوں کو اُس پر مجتمع کریں تو اس ملک میں اپنے مستقل بہبودی کی امید کرنا ہمارے لئے بیجا نہ ہوگا میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ بمقابلہ روئے زمین کے دیگر حصص کی اسلامی اقوام کے بہ لحاظ ان بڑی سہولتوں کے جو قومی تعلیم کا صحیح نظام جاری کرنے اور اُس کو کامیاب انجام پر پہنچانے اور نیز بہ لحاظ اُن سہولتوں کے جو اس نظام کو تمدنی زندگی کے وسیع ترین شعبوں پر اطلاق کرنے اور اسطرح

معمولی سی امداد بھی صحیح اصول اور باقاعدہ طریق پر کی جائے گی تو وہ تمام رکاوٹیں جو اس زبان کی ترقی کے سدّ راہ ہیں دور ہو جائیں گی - اور کچھ عرصہ کے لئے اُردو شاعری کی طرف سے ہم کو اپنی توجہ کم کر دینی چاہئے - اور ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ شعبہ شاعری میں تصنیفات کا سلسلہ کم کر دیا جائے - اور اپنے نوجوانوں کو آمادہ کیا جائے کہ انگریزی زبان کی تصنیفات جو عملی مضامین پر جدید تحقیقات کے متعلق ہیں ان کے تراجم زبانِ اُردو میں تیار کر کے اُردو ولٹریچر کو مالا مال کر دیں - اس مدعا کے حصول کے واسطے یہ ضروری ہے کہ تمام علوم جدیدہ کے اصطلاحات کی ایک مکمل لغات تیار کی جائے یہ اصطلاحات اُن اصطلاحات کا جو زبان انگریزی اور یوروپ کی دیگر زبانوں میں عموماً مروج ہیں یا تو ترجمہ ہوں یا اُن کا اتخاذ ہوں - اس کام کے لئے ماہران فن کی ایک مختصر سی کمیٹی قایم ہونی چاہئے - یہ کمیٹی اس ذخیرہ سے جو لٹریری سیکشن کے بعض سربرآوردہ کارکنوں نے جمع کیا ہے - اور کسی قدر ترتیب بھی دے دیا ہے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اُن لایق نوجوانوں سے بھی مدد لے سکتی ہے جو حبّ وطن کے جذبہ میں اس کام کو شوق اور جانفشانی سے کرنے کو تیار رہوں - اس معاملہ میں ہم کو اپنے مستعد ہندو دوستوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے جنھوں نے ان ہی صوبجات میں اس قسم کی لغات جن کا میں ذکر کر رہا ہوں زبان ہندی میں مرتب کر لی ہے اور جن کی مستقل اور سرگرم کوشش زبان ہندی کی حمایت میں ہماری قوم کے واسطے ایک بیش بہا اور قابل تقلید مثال ہے - مجھے اُمید ہے کہ اِن تمام اُمور کی طرف حامیان لٹریری سیکشن خاص طور پر توجہ فرمائیں گے -

نظام کانفرنس میں اصلاح کی ضرورت

صاحبان - اُن بہت سی اہم ضروریات میں سے جن کی طرف ہم کو فوراً متوجہ ہونا چاہئے - سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم کو اپنے نظام کی اصلاح کرنی اور اُس کو تقویت دینی چاہئے اس وقت کانفرنس کی ایک سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی ہے جس میں تمام صوبجات کے نمایندے شامل ہیں اور کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کے متعلق دلچسپی پیدا کرتے رہنا - اُس کی ساری کلوں کو درست رکھنا - اور ہر جلسہ کی پاس شدہ تجاویز کو حتی المقدور عملی جامہ پہنانا یہ سب کام اسی کمیٹی کے متعلق ہیں ایسی صورت میں اگر کام قابلِ اطمینان طریقہ پر نہیں ہوتا - اور ہم ہر سال جلسوں میں آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی تعلیم پر کچھ معتدبہ اثر نہیں ڈال سکتے تو کونسی تعجب کی بات ہے - آج کل کوئی بڑی

جمع کرنا چاہئے۔ اور ٹھنڈے دل کے ساتھ ان سے نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ ملک کی دیگر اقوام کے طرز عمل پر نظر رکھئے اور اُن کی خوبیاں قبول کر لیجئے۔ اور عیوب ترک کر دیجئے۔ غیر ترقی یافتہ مقامات میں اپنے ہم قوم اصحاب کو آمادہ کیجئے کہ ان سہولتوں سے جو سرکار دولتمدار نے ان کی ترقی تعلیم کے لئے مہیا کی ہیں۔ پورا فائدہ اُٹھائیں۔ اور اس معاملہ میں حسب ضروریات قوم کی طرف سے سرکار کا ہاتھ بٹایا جائے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ تمام ہندوستان میں مقامی مجالس قایم کی جائیں جو ایک طرف تو مقامی مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اور دوسری طرف ایک نمایندہ پراونشل مجلس کے ذریعہ سے اس مرکزی کانفرنس سے مربوط رہیں۔ اس طرح سے آپ قوم میں کام کرنے کے لئے ایک عملی روح پھونک دیں گے اور تعلیمی ترقی میں ایک گراں قدر کامیابی حاصل کریں گے۔

ہمارا شعبۂ ادب اگر آپ حضرات اس امر پر غور فرمائیں گے کہ ہم زبان اُردو کی کیا خدمت کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہمارا سلوک کس قسم کا رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہاں سے آپ کو ہماری قوم میں عملی کوتاہی کا ثبوت ملے گا۔ اس زبان کی نشوو نما کے لئے عرصۂ دراز سے اس کانفرنس کا ایک خاص سکشن جیسے "لٹریری سکشن" یا انجمن ترقی اُردو کے نام سے موسوم کیا گیا ہے قایم ہے۔ اس سیکشن کا کام نہایت بے قاعدگی سے اور بے ضابطگی سے ہوتا رہا ہے۔ اور اُردو کی بہبودی میں جو کوشش گاہ گاہ اس کانفرنس کی طرف سے کی گئی ہے وہ ہماری سالانہ کارگذاریوں کا ایسا حصہ ہے جو سب سے کم مستحسن ہے۔ اُردو جس کو عام طور سے ہندوستانی کہتے ہیں مسلمانان ہند کی بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصہ کی زبان ہے۔ اور اس کو ہندوستان میں وہی رتبہ حاصل ہے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہے۔ اس زبان کے ادبی اور علمی نشوونما میں مدد پہنچانا ہماری کانفرنس کے پروگرام کا خاص اہم جزو ہے۔ اس ذمہ داری کو انجام دینے میں ہماری قوم نے نہایت غفلت دکھائی ہے اور اگر ہماری تغافل شعاری کا یہی حال رہا اور مستعدی اور چستی سے ہم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو ہم کو ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا جو ان مشکلات سے زیادہ سخت ہوں گی۔ جو مسلمانانِ بہار اور صوبجات متحدہ کو پیش آچکی ہیں۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اُردو کو ایسی سہولتیں حاصل ہیں کہ اگر اس کانفرنس کی طرف سے

پیدا ہوگیا تو اُن پر ادبار کی گھٹائیں چھاگئیں۔ پہلے تو وہ "قول مرداں جاں دارد" کے معتقد تھے لیکن اس کے بعد اُن کے اعتقاد میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ اس مصرعہ سے ظاہر ہوتی ہے ؎

"وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے"

یہ مصرعہ ایک بیّن انقلاب کا مظہر ہے لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت اور اختصار کے ساتھ یہ تبدیلی ذیل کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے جو یہ ہیں کہ: ؎

"وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا"

حضرات! میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس انقلاب پر ادبی پہلو سے کامل بحث کی جاوے اور ان فقرات کو مسلمانانِ ہند کے انحطاط و تنزل کے مختلف درجات کا قطعی مظہر قرار دیا جاوے لیکن میرا اعتقاد ہے کہ اگر کسی قوم کے خیالات کا اندازہ اُس کی نظم، اُس کی ادبیات اور روزانہ زندگی کے اعمال سے ہوسکتا ہے تو ان مصرعوں سے اُس مردانگی اور خودداری کے تنزل اور انحطاط کا پتہ چلتا ہے جس نے قرونِ اولےٰ میں ہمارے آباؤ اجداد کو امتیاز بخشا تھا اور احساسِ فرض کا آلہ ہونے کی حیثیت سے جس کی بنیاد مذہبی تربیت یافتہ قلوب میں بڑے استحکام سے قایم تھی۔ مذہبی تربیت اخلاقی جرأت کے حصول پر اُبھارتی ہے اور اخلاقی جرأت و خودداری عزت نفس کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ جن اُردو مصرعوں کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اُن کا قرآن کریم کی اس آیتہ سے مقابلہ کرو۔

وا وفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا

یقین کیجئے کہ ہمارے نصف مصائب کا باعث متانت و عزت نفس کا فقدان ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ صفات ہیں جو تمام اوصافِ حسنہ اور ہمدردی بنی نوع کی جڑ ہیں۔ بے شبہ یہ صفات اس شریف حب وطن کا سرچشمہ ہیں جو ایک جماعت میں قوت تحریک پیدا کرتی ہے اور اس کے خیالات کو بلند بنا دیتی ہے اور جس پر کاربند ہوکر لوگ مردانہ وار اپنے فرائض ادا کرتے اور دیانت و متانت اور انصاف کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے حقداروں کی ترقی کے لئے تمام اُن مواقع سے جو اُنھیں حاصل ہوں پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اوصاف ہمیں اُن بزرگوں کی مثال اور یاد تازہ رکھنے کے قابل بناتے

ہیں جو اگرچہ اب دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن وہ ایک ایسا زبردست اثر اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ وہ ایک لازوال میراث ہے جس کا اثر ہر شے میں جلوہ افگن ہے اور ہمارے لئے نشانِ قدم کا کام دیتی ہے۔ یہ ہماری اور خود اسلام کی خوش قسمتی ہے کہ مسلمانوں میں اپنی اصلی حیثیت کو سمجھنے کا میلان پیدا ہو رہا ہے اور یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اب تمام اقطاعِ ہند کے مسلمان متحدہ طاقت سے نہ صرف خرابیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں بلکہ اُس نقصان کی تلافی کے لئے کوشاں ہیں جو گزشتہ نصف صدی میں اُنھیں پہنچا ہے اس بیداری کی بیّن علامت آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود ہے جو زندۂ جاوید سر سید کی قابلیت اور دوراندیشی سے معرضِ وجود میں آئی اور اسی کے ساتھ شعبۂ نظم کی وہ مخصوص ترقی ہی جو علی گڑھ تحریک کے دوش بدوش شروع ہوئی اور جس کے بانی مولانا خواجہ الطاف حسین صاحبؔ حالی جیسے بزرگ ہیں۔

تعلیمی عقدہ ہنوز حل طلب ہے

حضرات! مسئلۂ تعلیم ایک نہایت وسیع الحدود مسئلہ ہے۔ تعلیم کی نوعیت اور طریق تعلیم یہ دونوں ایسے سوال ہیں جو ترقی یافتہ مغرب میں بھی کوئی قطعی صورت اختیار نہیں کر سکے۔ اس حیران کن عقدہ پر فضلا و ماہرینِ سیاست نے بہت کچھ بحث کی ہے۔ بے شمار نقاد موجودہ طریق کو قابلِ تنسیخ قرار دے چکے ہیں اور ایک کثیر التعداد گروہ ایسا بھی ہے جو اسے اب تک تھامے ہوئے ہے اور جس کے خیال میں یہ بہترین اور موافق ترین طریق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اکثر ماہرینِ فن کی یہ رائے ہے کہ آئندہ تعلیم میں مذہبی اور اخلاقی پہلو غالب رہنا چاہیئے اور اس میں یہ خصوصیت نمایاں ہونی چاہیئے کہ وہ عملی زندگی کی ضروریات کے موافق ہو۔ اس اختلافِ آراء نے ایک بحث کی صورت پیدا کر دی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اب تک بھی کوئی ایسا طریق متیقن نہیں ہو سکا جس کے مطابق آئندہ تعلیم کی نوعیت کا فیصلہ کیا جا سکے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ہماری قوم کے لئے جسے غربت یا افلاس یا ایک ایسی حالت نے جو سیاسی تنزل کے بعد ظہور پذیر ہوا کرتی ہے بڑی سختی سے دبا رکھا ہے۔ مختلف تعلیمی اصولوں کا عملی تجربہ یا جدید اور غیر آزمودہ طریقوں کا اجرا ایک ایسی بدعنوانی ہوگی جس کے بدنتائج کی وہ کسی صورت میں بھی تاب نہیں لا سکتی۔

ہم کو مقررشدہ دستور العمل پر عامل ہونا لازم ہے

ہمیں لازم ہے کہ تمام مقاصد و اغراض کے لئے اُسی دستور العمل پر چلیں جو مقرر شدہ ہے، اُس میں صرف اسی قدر ترمیمات کر لیں

جو ہماری قوم کی خاص ضروریات کے مناسب حال ہوں۔ میرے اس بیان سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ گورنمنٹ کی پالیسی تعلیم کے متعلق درست اور راٹل ہے یا یہ کہ ہم کو پس وپیش کا کچھ لحاظ نہ رکھنا چاہیئے اور یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے ہم پر کیا اثر کیا ہے۔ میرے خیال میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کا لب لباب صاف طور سے اُن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جو انڈین ایجوکیشنل پالیسی (مطبوعہ گورنمنٹ آف انڈیا ۱۹۰۴ء) سے میں اخذ کرتا ہوں:-

"طریقۂ تعلیم میں جس کا اس طرح رواج دیا گیا ہے اُن تمام دماغی ترقیات کے لئے جو ایک مہذب قوم کے شایانِ شان ہوں، مختلف مدارج کے لحاظ سے سامان موجود ہے۔ اس سے تعلیم تفحص (ریسرچ) کے متعلق طلبا کی تمام خواہشات قابل اطمینان طور پر پوری ہوتی ہیں۔ اس سے گورنمنٹ کے لئے متدین اور ہوشیار ملازمین بہم پہنچتے ہیں۔ اس سے ایسے کاریگر تیار ہوتے ہیں جو ہر ایک شعبہ تجارت کے لئے جو ہندوستان میں مستحکم طور پر قایم ہوگئی ہے کارآمد ہوتے ہیں۔ اس سے ملک کے ذرائع ترقی کو امداد پہونچتی ہے اور فنونِ لطیفہ اور صنعت وحرفت کو ترقی ہوتی ہے۔ اس سے ملک کی ہر ایک جماعت کو اُن کی ضروریاتِ زندگی کے مناسب حال تعلیم ہوتی ہے، اور ان اغراض کے حصول کے لئے یہ طریق تعلیم ایسے طور پر مدوّن کیا گیا ہے جس سے تعلیم غیر محدود طور پر پھیل سکتی ہے کیونکہ تعلیم کی مانگ بڑھتی جاتی ہے اور حکومت اور پبلک کی طرف سے ایک بڑے پیمانے پر فیاضانہ امداد ملتی جاتی ہے۔"

یہ پالیسی جناب گورنر جنرل باجلاس کونسل نے ۱۹۰۴ء میں ظاہر کی تھی، اور یہی پالیسی آج کے دن تک چلی آتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کی پالیسی جہاں تک کہ وہ خاص مختص ضروریات پر مؤثر ہے، سخت و درشت نہیں ہے۔

مذہبی تعلیم | یہ صاف عیاں ہے کہ گورنمنٹ بھی اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ اُس کی پالیسی "غیر محدود وسعت" کی محتاج ہے۔ بعض بڑے بڑے اصول کے لحاظ سے البتہ ہم کو اس عام طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا جو ہندوستان میں مروج ہے لیکن اس سے ہمیں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم اس کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیں جس سے کسی ایسی قوم کی ضروریات پوری ہوسکیں

جس کے مذہبی اور اخلاقی خیالات کی بنا اس کی قدیمی روایاتِ قومی پر ہو اور وہی اس کی بہترین پونجی ہو۔ میرا اعتقاد ہے کہ یہ ایک دستور ہو گیا ہے کہ جو شخص اس بات پر زور دیتا ہے کہ طریقہ تعلیم میں مذہبی تعلیم کو ممتاز درجہ اور اونچی جگہ ملنا چاہیئے اس پر خوب لے دے کی جاتی ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جیسا کہ زمانہ موجودہ ہے جس میں فیشن اور دستور کے شور و شغب سے لوگوں کا اکثر ناک میں دم کیا جاتا ہے مجھے شک ہے کہ کہیں میرے اُن مذہبی خیالات پر جو میں نے ظاہر کئے ہیں یہ فتویٰ تو نہیں لگا دیا جائے گا کہ یہ ایک ملّا آدمی کے خیالات ہیں یا ایسے خیالات ہیں جن میں دیوانگی کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانِ ہند کے اوجِ ترقی پر پہنچانے کے متعلق آپ کے کچھ ہی خیالات کیوں نہ ہوں اور اس کے متعلق آپ کی تجاویز کچھ ہی قرار کیوں نہ دی گئی ہوں مجھے یہ عرض کرنے میں کچھ بھی تامل نہیں ہے اور میں نہایت زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہم بہترین عملی انسان اور بہترین فرزندِ قوم اور عظیم الشان سلطنت کے بہترین شہری اُسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہمیں اُس تعلیم کے ساتھ ساتھ جو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ مذہبی تعلیم و تربیت بھی کافی طور پر دی جاوے۔ میری تو یہ قطعی رائے ہے کہ قوی ذہنی کی تعلیم و تربیت جو مذہب سے معرّا ہو یا زیادہ صحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تعلیم جس کی باگ مذہب کے ہاتھ میں نہ ہو وہ زیادہ سے زیادہ ایک قابلِ اعتراض ذہانت و جودتِ طبع پیدا کرتی ہے۔ تعلیم جو مذہب سے معرّا ہو وہ ایسے آدمی پیدا کرتی ہے جو ذہانت کے پہلوان کہلاتے ہیں۔ جس شخص کو اچھی طور سے مذہبی تعلیم دی گئی ہو خواہ وہ کسی فرقہ کا آدمی ہو (کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ تمام مذاہب کے بنیادی اصول جو اچھے طریقے سے سکھلائے گئے ہوں حقیقتاً ایک ہی ہوتے ہیں) وہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جس کے اندر ایک ایسی طاقت کام کرنے والی ہوتی ہے جو اُس کے قلب پر حکمرانی کرتی ہے جو نیک خیالات، صالح ایمان اور نیک زندگی بسر کرنے کی تحریک کی قوت کا منبع ہے۔ اور یہی وہ کارکن طاقت و قوت تھی جو گزشتہ صدیوں میں شہرآفاق بہادرانِ اسلام میں جاری و ساری تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس نے جاں نثارانِ پیغمبر علیہ السلام اور عَلَم بردارانِ اسلام کو ہر بات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے ہر مصیبت کو برداشت کرنے اور ہر طرح کا ایثار کرنے اور اپنے فرض کی انجام دہی میں مذبذب نہ ہونے کے قابل بنا دیا تھا، اور یہی وہ زبردست مذہبی اور اخلاقی جذبہ ہے جس کی بدولت پیروان پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام عام انسانی گروہ سے بڑھ کر ممتاز نظر آتے ہیں اور جب ہم ان کے سوانح اور حالاتِ زندگی پڑھتے ہیں تو اپنے آپ کو ان کے

مقابلہ میں ایسے پست درجہ پر پاتے ہیں کہ ہمارا خون خشک ہوتا ہے، دل بیٹھ جاتا ہے اور اعضا میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہم کو سرتاسر ایسی خوبیوں اور اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں جو کسی قوم کے فخر اور افتخار و اعزاز کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ مثل منور اور روشن تاروں کے ہر زمانے اور ہر وقت میں تاباں اور درخشاں رہیں گے۔ ان کے کارناموں کی تابانی سے تاریخ کے صفحات منور ہیں اور ہم کو اس امر کا پرزور احساس دلاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں اُن کا وجود تھا اور وہ جامۂ حیات میں تھے۔ کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی معقولیت کے ساتھ اس امر کا ادعا نہیں کرسکتا کہ علوم مشرقیہ اور مذہبی تربیت کی کافی استعداد ولایق اور شایستہ افراد پیدا کرنے سے قاصر ہوگی۔ وہ ورکیوں جاتے ہو۔ آپ تسلیم کریں گے کہ سرسید احمد، نواب وقار الملک اور ایسے ہی دیگر بزرگوں نے آپ کی یونی ورسٹی سے کوئی استفادہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ کسی کو اس میں کلام نہ ہوگا کہ یہ لوگ عام انسانوں سے بالاتر ہیں۔ اور ایسے بالاتر کہ جو اپنی شخصیت اور قوت کے نشان ہماری جماعت کے اخلاق پر چھوڑ گئے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کی تعلیم کس قسم کی ہوئی تھی، محض قومی تعلیم یا تربیت یا وہ صحت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خالص مشرقی تعلیم، اور اگرچہ ان کو بجا طور سے ذہانت اور قوت دماغی کے لحاظ سے عام انسانوں سے بالاتر درجہ دیا جاتا ہے مگر اُن کی تعلیم و تربیت کی بنیاد عربی و فارسی ہی پر تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے بعض حضرات مجھکو اس فلسفیانہ معمے سے خاموش کرنا چاہیں گے کہ وہ لوگ زمانہ کے ارتقا کا نتیجہ تھے، لیکن میں عرض کروں گا کہ اُن کی ذہانت وفطانت کی عمارت کی بنیاد میں مشرقی تعلیم اور محض مشرقی تعلیم ہی تھی۔

حضرات! میں اس موقع پر زمانۂ حال کی تعلیم کے برخلاف وعظ نہیں کہتا۔ مجھ کو مغربی تعلیم کے فوائد کا بخوبی احساس ہے حقیقت یہ ہے کہ ممکن نہ تھا کہ بغیر مغربی تعلیم و تہذیب کے مسلمانانِ ہند اپنے تنزل و انحطاط کی روک تھام کرسکتے، جس میں وہ اُن تعصبات اور ضعیف الاعتقادی کی بدولت گرتے چلے جارہے تھے جو اُن کی سیاسی قوت کے جاتے رہنے سے اُن میں پیدا ہوگئے تھے اور جو اُن کی جماعت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح برباد کر رہے تھے میرا درحقیقت یہ اعتقاد ہے اور اس میں تخالف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر ہم بہ حیثیت قوم کے چاہتے ہیں کہ زندگی کی تگ و دو میں دیگر اقوام کے مقابل اپنی ہستی کو قایم و برقرار رکھیں تو ہمارے نظام تعلیمی میں زمانہ موجودہ کی تعلیم و تربیت کو اول جگہ ملنا چاہیئے۔ لیکن میں عرض کروں گا اور پورے اعتقاد کی بنا پر عرض کروں گا کہ من حیث القوم ہم اپنی شخصیت وجداگانہ حیثیت کو کھو بیٹھیں گے اگر

ہم نے اس ضروری مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنی مذہبی تعلیم کو جس کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے کافی طور سے باہم آمیزش نہ کی، ظاہر ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں ہم کو کوئی ایسی تعلیم جو مذہبی ہو نہیں مل سکتی لیکن مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ خود ہمارے قومی کالجوں اور اسکولوں میں ہمارے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم اس کو بہترین شکل میں نہ مہیا کرسکیں، اور اس موقع پر میں اپنا دلی خیال آپ کو بتاتا ہوں، یعنی اُس شخص کا دلی خیال جس نے پُرانی روایات کی بنا پر تعلیم پائی ہے اور جو زمانہ حال کی تہذیب و شائستگی سے بھی کوئی بغض و عناد نہیں رکھتا کہ اگر اس خصوص میں آپ کی مجوزہ یونی ورسٹی انتظام کرنے سے قاصر رہے گی تو وہ اپنے اس حقیقی مطلب و مدعا میں ناکام رہے گی جس کی بدولت وہ قوم کی نظروں میں ہر دلعزیز، مفید اور تمام قوم کے لئے فائدہ رساں اور عملی کام کرنے والی ثابت ہوگی، مزید براں میں عرض کروں گا کہ آپ کی مجوزہ یونی ورسٹی کی مشرقی تعلیم کا پہلو نہایت مستحکم اور مضبوط ہونا چاہیئے اور عربی تعلیم و دینیات کی ڈگری کے لئے وسیع سہولتیں اور سامان مہیا ہونے چاہئیں۔

تعلیم عربیہ بمقابلہ فارسیہ

میں عربی علم ادب کو پیروان اسلام کی تعلیم کے حق میں نہایت قیمتی خیال کرتا ہوں اور میں اس کو فارسی پر جو مغلوں کی حکومت میں عدالتی زبان تھی قطعی طور سے ترجیح دیتا ہوں۔ شاہان مغلیہ کے وقت میں ہماری کتب دینی اور دینیات کا علم فارسی زبان میں نہیں تھا بلکہ عربی زبان میں تھا اور فارسی کی حیثیت اُس وقت وہی تھی جو اس وقت ہندوستان میں انگریزی زبان کی ہے، یعنی ملک کی عدالتی زبان۔ فارسی کا کام اب انگریزی نے لے لیا ہے اور اس لئے میری رائے ہے کہ اسے ترک کردینا چاہیئے اور عربی زبان کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہیئے۔ مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے کہ فارسی نے عربی کے اختلاط سے علم ادب پر بہت عمدہ اثر ڈالا ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے افراد انگریزی اور عربی کو پڑھیں اور کسی دوسری مشرقی زبان کا بوجھ نہ اُٹھائیں، جس کے شمول سے زندگی کی دوڑ میں ہمارے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں اس سوال پر بحث کرنے سے کہ قوم کو مذہب کی اور عربی کی تعلیم کے لئے کن ذرائع اور طریقوں کو اختیار کرنا چاہیئے، بلا ضرورت آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تفصیلات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب مختلف شعبہ ہائے تعلیم کے نصاب کی اسکیمیں مدون ہونگی اُس وقت ان پر مناسب طور سے توجہ کی جائے گی۔ عربی اور مذہبی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے

جو طریقے میرے ذہن میں آتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ دیسی مکاتب اور مدارس قرآنی کی توسیع کی جاوے۔ بنگال میں ڈاکٹر راس کی تحریک پر جو کئی سال سے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل تھے اور اب آخر میں گورنمنٹ ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ سکرٹری ہیں، گورنمنٹ نے بڑے بڑے دیہات میں مکاتب و مدارس قرآنی کے اجرا کا کام کرنا شروع کیا ہے یہ انتظام فی الحال بطور آزمائش کے ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس کا انتظام عمدہ طریقے سے چلایا گیا اور گورنمنٹ کی طرف سے جو تقویت اور امداد مل رہی ہے وہ ملتی رہی تو اس سے مسلمانوں کی مذہب کی ابتدائی تعلیم کی اشاعت اور اُن کی قومی خصوصیات کی تقویت کے لئے عمدہ نتائج مترتب ہوں گے۔

ایک تندرست اور خوددار قوم بننے کی شرائط

حضرات! اگر میں نے مذہبی تعلیم کے متعلق لمبی چوڑی تقریر کی ہے تو محض اس وجہ سے کہ مجھے اس امر کا یقین واثق ہے کہ کسی قسم کی بھی تعلیم سے جو اس نام کی مصداق ہو آخر الامر وہ باتیں نہیں پیدا ہو سکتیں جو ایک قوم کو تندرست مضبوط اور خوددار بناتی ہیں۔ آپ صاحبوں کا جو کچھ بھی خیال ہو وہ ہو، میرا تو یہ خیال ہے کہ جس تعلیم میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہو اس سے اعلیٰ صفات کے انسان پیدا نہیں ہو سکتے۔

چونکہ ایک دن ہماری اپنی یونی ورسٹی ہوگی، اس لئے میرے خیال میں یہ بے محل نہ ہوگا اگر میں چند الفاظ اُن موٹے موٹے اصولوں کے متعلق عرض کروں جن پر یونی ورسٹی کو کاربند ہونا چاہیئے۔ لنڈن ٹائمز کے ایک مضمون سے جو بظاہر ایسے شخص کے قلم سے معلوم ہوتا ہے جو ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے نظام تعلیم کا ماہر ہے۔ میں حسب ذیل الفاظ کا اقتباس کرتا ہوں:۔

> خالص دماغی ذہانت کے نکتہ خیال سے (اور اسی پر آج ہم بحث کرنا چاہتے ہیں) اگر ہندوستانی یونی ورسٹیوں کی حالت کا پورا معائنہ کیا جاوے تو نہایت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ اپنی خواندہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ یونیورسٹی گریجوئیٹوں کی اس تعداد سے بہت زیادہ تعداد رکھتا ہے۔ جو اس کی یا کسی دوسرے ملک کی ہے۔ لیکن اس پیداوار کی قابلیت اوسط کے لحاظ سے افسوس ناک طور پر پست ہے اور مستقل طور پر کم ہوتی جاتی ہے ......

فی الواقع بات یہ ہے کہ ایک طرف تو مصنوعی امتحانات نے ہندوستانی تعلیم کو جو یونیورسٹیوں

میں دیکھاتی ہی کامل طور سے غلبہ پالیا ہے اور نکما کر دیا ہے اور دوسری طرف کتب درسیہ نے جو طلبا کے قوت یادہی کو جانچتے ہیں نہ اُن کی ذہانت کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض طبّاع اور ذہین طالب علم اس غیر مفید اور سخت طریقہ تعلیم کے جکڑ بند توڑ کر اُبھر جاتے ہیں لیکن ایک کثیر تعداد "کتب درسیہ کی غلامی اور امتحانات کے جکڑ بندوں کا آہستہ آہستہ شکار ہو جاتے ہیں۔" مجھے اُمید ہے کہ ہماری یونی ورسٹی موجود الوقت یونی ورسٹیوں کی اندھی تقلید نہیں کرے گی۔ اور جب اس کے مقاصد اور ضوابط کے تدوین کا وقت آئے گا تو موجودہ طریقے کے نقائص وعیوب کو فراموش نہیں کر دیا جائے گا۔

اعلیٰ تعلیم استحکام حاصل کر چکی ہے

یونی ورسٹی کا نظام تعلیم جس سے میری مراد اعلیٰ تعلیم سے ہے، خواہ وہ برا ہے یا بھلا اس ملک میں استحکام پکڑ چکا ہے۔ اس پر صرف خورده گیری کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ اس کے نقائص کا پتہ لگانے، اُس کی اصلاح کرنے، اُسے مضرات سے پاک کرنے اور تہذیب وعلم کی حقیقی ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ معاف فرمائیں گے اگر میں اصل مبحث سے کچھ تجاوز کروں۔ رسالوں اور عام اخبارات میں جو کچھ نکتہ چینی اعلیٰ تعلیم کے ناقص ہونے کے متعلق کی جاتی ہے اس سے بعض لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ گورنمنٹ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم سے دست کش ہونے کا کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گورنمنٹ نہ تو دست کش ہونا چاہتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ جب کہ ایک مرتبہ اُس نے ہمیں ذہنی وعقلی حیثیت سے مغرب کا حصہ دار بنا دیا ہے تو اس کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ ہمارے اس حق کو برقرار رکھے اور اسے وسعت دے۔ نہ کہ اس کو محو کر دے۔ لارڈ میکالے نے (جو ان ایام میں کونسل کے مشیر قانونی اور سررشتہ تعلیم کی مجلس کے صدر تھے) جو پالیسی ۱۸۳۵ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اپنے مشہور مراسلے میں اس پالیسی کو وسعت دی تھی جس میں اُنھوں نے اس فیصلہ کا اعلان کیا تھا کہ گورنمنٹ کو ہندوستان میں مغربی تعلیم کی وسیع اور باقاعدہ ترقی مستعدی کے ساتھ امداد دینا چاہیئے۔ ۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی وائسرائے تھے اُس وقت سر چارلس ووڈ (جو بعد میں وائکونٹ ہیلیفیکس کہلائے) ان کا مراسلہ ہندوستان کے لئے ایک تعلیمی اسکیم پر مشتمل موصول ہوا۔ اس مشہور مراسلہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"....... کثیر التعداد اہم معاملات میں سے کوئی معاملہ مسئلۂ تعلیم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے یہ ہمارا ایک مقدس ترین فرض ہے کہ جہاں تک ہمارے امکان میں

ہے۔ ہم ہندوستان پر اُن کا کثیر اخلاقی اور مادی برکات کے نزول کا ذریعہ بن جائیں جو علوم نافعہ کی عام توسیع و اشاعت سے حاصل ہوتی ہیں اور جو ہندوستان انگلستان کے ساتھ اپنے تعلق سے حاصل کر سکتا ہے۔

اس سے ذرا آگے چل کر مراسلہ مذکور میں نہایت زور کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے کہ:-

جس تعلیم کو ہم ہندوستان میں وسعت دینا چاہتے ہیں اس کا مقصد ترقی یافتہ علوم و فنون، سائنس، فلسفہ اور ادبیات یورپ یا بالفاظ مختصر یوروپین علوم کا پھیلانا ہے ...... "

جب ملک کی عنان حکومت تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آئی تو ۱۸۵۹ء میں اس پالیسی کی جس کی بنیاد وائکونٹ ہلفیکس نے ۱۸۵۴ء میں ڈالی تھی دوبارہ توثیق کی گئی۔ میں آپ کو باور کراتا ہوں کہ اب اس پالیسی سے روگردانی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ برخلاف اس کے تعلیمی مصارف یوماً فیوماً زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ گذشتہ دس سال میں عام اخراجات چار کروڑ سے سات کروڑ تک بڑھ گئے ہیں۔ اس موقع پر مجھے یقین ہے کہ اُن الفاظ کے اعادہ کے لئے مجھے معافی مانگنے کی حاجت نہیں، جو ہزامپیریل مجسٹی حضور شاہنشاہ معظم نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایڈریس کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جنھوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں اُمید کی ایک برقی رَو دوڑا دی تھی، یہ الفاظ اعلیٰ دانش مندی، تدبّر اور فیاضی پر مبنی ہیں اور یہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر طالب ہندوستانی کو سونے کی تختی پر نقش کرا کے اپنے پاس رکھنے چاہئیں اور جو ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کا نشان امتیاز ہیں۔

شہنشاہ معظم ہمارے تعلیمی مستقبل پر

ہز مجسٹی نے ارشاد فرمایا تھا:-

"آج کل کے زمانہ میں کوئی یونیورسٹی مکمل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ علوم و فنون کے تمام اہم شعبوں کے متعلق تعلیمی فیکلٹیاں اور تحقیق و تدقیق کے پورے مواقع اُس میں مہیا نہ ہوں۔ تمھیں علوم قدیمہ کو محفوظ رکھنا ہے اور اسی کے ساتھ مغربی علوم کو ترقی دینا ہے۔ تمھیں کیرکٹر (سیرت) بھی پیدا کرنا ہے جس کے بغیر تعلیم کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تم کہتے ہو کہ تم اپنی عظیم الشان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہو۔ میں اس کام کے لئے جو تم کو درپیش ہے، خدائے تعالےٰ سے کامیابی کی دعا مانگتا ہوں۔ اپنے مطمح نظر کو بلند رکھو اور ان کی مساعیِ تکمیل میں فرق نہ آنے دو اور خدا کے تفضل و کرم

سے تم ضرور کامیاب ہو گے۔ چھ سال قبل میں نے انگلستان سے ہندوستان کو ایک پیغام ہمدردی بھیجا تھا اور آج ہندوستان میں موجود ہو کر میں تمھیں نوید اُمید دیتا ہوں۔ ہر طرف مجھے نئی زندگی کے آثار اور علامتیں دکھلائی دیتی ہیں تعلیم نے تمھارے دلوں میں اُمید پیدا کی ہے اور اعلیٰ اور بہتر تعلیم سے تم کو اعلیٰ و بہتر اُمیدیں حاصل ہوں گی۔ میرے حکم سے دہلی میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ میرا نائب السلطنت با جلاس کونسل ہندوستان میں مصارف و ترقی تعلیم کے لیے بیش قرار رقوم وقف کرے گا۔ یہ میری آرزو ہے کہ ملک میں اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال بچھا دیا جاوے جن سے وفادار، جواں مرد اور کار آمد شہری پیدا ہوں جو صنعت و حرفت، زراعت اور زندگی کے تمام دیگر شعبوں میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

میری یہ بھی تمنا ہے کہ اشاعت و ترویج علم سے میری ہندوستانی رعایا کے گھر روشن و منور ہوں ان کی محنت و مشقت میں خوشی و خرّمی پیدا ہو اور ان میں بلند خیالی، آرام و آسائش اور تندرستی و صحت کے تمام فوائد حاصل ہوں جو علم کے لوازمات میں سے ہیں۔ میری آرزو صرف تعلیم کے ذریعے سے پوری ہو سکتی ہے اور ہندوستان میں اشاعتِ تعلیم کا مقصد ہمیشہ میرے زیر نظر رہے گا۔

اِن سے زیادہ شریفانہ الفاظ اور شریف زبان نہ کبھی سنی گئی اور نہ بیان کی گئی ہے اور نہ گورنمنٹ کا رویّہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ تعلیم کے متعلق یہ بنجالہ رپورٹ جو ہز ایکسلینسی لارڈ ہارڈنگ (یعنی وہ عالیشان اور فراخ دل مدبّر جو اس وقت ہندوستان پر حکمران ہے) اس کے عہد حکومت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں صاف اور صریح الفاظ میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی اس طرح بیان کی گئی ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے نظام میں اصلاح شروع ہو گئی ہے اور پبلک فنڈ (سرمایۂ عام) سے غیر سرکاری تعلیم گاہوں کو جو امداد دی جاتی ہے وہ گزشتہ نو سال میں دو چند کر دی گئی ہے اس میں تحریر ہے کہ:۔

...... اُن عظیم الشان فوائد سے جو تعلیم نے ہندوستان کو بخشے ہیں نہ انکار کرنا

چاہیئے اور نہ اُن کی قدر و قیمت گھٹانا چاہیئے۔ غیر مکمل معلومات کی بنا پر جو تنقیحات کی جاتی ہیں وہ اکثر غلط ہوتی ہیں مثلاً یہ قرینِ انصاف نہیں ہے کہ ہندوستانی طریقوں کا جو ابھی ابتدائی حالت میں ہیں مغربی دنیا کے موجودہ طریقوں سے جو تکمیل کو پہونچ چکے ہیں مقابلہ و موازنہ کیا جائے یا نظام تمدنی اور قوائے ذہنی کے اثرات کو نظر انداز کیا جاوے۔ مزید براں یہ عام الزام کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی بنا عام تعلیم کی نازک اور کمزور بنیاد پر رکھی گئی ہے اور یہ کہ اس کے ذرائع ناکافی ہیں ایک ایسا الزام ہے جو یورپ کے ہر ملک پر کسی نہ کسی وقت میں لگایا جاسکتا تھا۔ ہندوستان ایسے منازل سے گزر رہا ہے جو دوسرے ممالک نے دوسرے زمانوں میں طے کئے ہیں۔

ذرہ الفاظ ذیل پر غور فرمائیے:۔

........اپنی پالیسی میں سب سے پہلے گورنمنٹ زیر تعلیم طلبا و انڈر گریجوئیٹس کے کیرکٹر (سیرت) کی تربیت کی خواہشمند ہے۔ سیرت کے پیدا کرنے میں گھر کے اثر اور معلم کی ذات کو بڑا دخل ہے۔ سابقہ تجربہ کی بنا پر اُس امید کی کافی وجہ موجود ہے کہ جوں جوں بہتر تعلیمی حالات کے زیر اثر تعلیمی آسانیاں بڑھتی جائیں گی سوشیل اصلاح کی صورت پیدا ہوگی۔ تعلیم نسواں پھیلے گی اور بہتر معلمین دستیاب ہوسکیں گے۔ اب تک مذہبی اور اخلاقی کافی امداد بھی دی جاچکی ہے اور اس اصلاح کے بہت وسیع معنی لئے گئے ہیں۔ یعنی بلا واسطہ مذہبی اور اخلاقی تربیت کے علاوہ بالواسطہ طریقوں پر بھی یہ مشتمل ہے جن میں ناصحانہ طریق، اجتماعی زندگی، روایات، انتظام ماحول حفظانِ صحت کی بہتری اور تعلیم کا نہایت ضروری پہلو یعنی جسمانی تربیت اور نظام تفریح بھی شامل ہے۔

اس خیال کی ایک اور عملی تردید کہ گورنمنٹ تعلیمی حوصلہ افزائی کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینا چاہتی ہے اسلامیہ کالج پشاور کے قیام میں موجود ہے۔ جو یہاں سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اور جو سر جارج روس کیپل کی مہربانی اور کشادہ دلی اور صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب کی حب وطن اور محنت کی یادگار ہے۔ پشاور میں اس تعلیمی تحریک کی اہمیت کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے سر ہارکوٹ بٹلر نے فرمایا تھا کہ:۔

درۂ خیبر کے دہانہ کے سامنے ایشیا کے اس مشہور شاہراہ پر کھڑے ہوکر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے تصور اور قوتِ متخیلہ پر اس آیندہ روشنی کا زبردست اثر پڑ رہا ہے جو اس اسکول اور کالج سے نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ ایشیا کے دور دراز گوشوں میں منعکس ہوکر پھیلے گی۔

ہم نہایت جوش کے ساتھ یہ اُمید کرتے ہیں کہ سر ہارکورٹ بٹلر صاحب کا خواب پورا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اس تازہ گراں قدر فیاضی کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا جو اسلامیہ کالج لاہور کے متعلق کی گئی ہے یہ کالج زندہ دلان پنجاب اور بالخصوص انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایثار اور حب وطن کی زندہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانانِ مدراس کی تعلیمی ترقی کے لئے مالی امداد، کلکتہ مدرسہ کو اعلیٰ درجہ کے کالج تک پہونچانے کی منظوری ایک یونی ورسٹی ڈھاکہ میں اور دوسری پٹنہ میں قائم کرنے کا فیصلہ اور رنگون (ملک برہما) میں ایک تیسری یونیورسٹی کے قیام کی تجویز۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا، میں خیال کرتا ہوں کہ یہ اور اسی قسم کی دیگر تحریکات اس غلط فہمی کی تردید کے لئے کافی ہیں کہ گورنمنٹ کی آیندہ پالیسی ہندوستان میں یونی ورسٹی کی تعلیم کی ترقی واشاعت کو محدود اور کم کرنا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ تعلیم پر بڑی بڑی رقوم خرچ کی جاویں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم گراں ہوجائے گی لیکن گورنمنٹ کا منشا یقیناً یہ نہیں ہے کہ تعلیم کو مٹا دیا جاوے، برخلاف اس کے یہ ظاہر ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو بہت اہمیت دی جارہی ہے، اور نہ اعلیٰ حکام اور ماہران تعلیم کی رائیں ایسی تعلیم کی موافقت میں ہیں جو مذہب سے معرّا ہو۔ سر اینڈرو فریزر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمیں ایک اعلیٰ تر طریق کی خواہش ہے یعنی ایک ایسے طریق کی جو انسان کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کے دوش بدوش ذہنی اور جسمانی تعلیم کو بھی حاوی ہو"

(ماخوذ از نائنٹینتھ سینچوری اکتوبر ۱۹۰۶ء)

مشہور مذہبی عالم اور ماہرانِ فنّ تعلیم ڈاکٹر ویلڈن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے انتہائی وثوق کے ساتھ جس کا اظہار مشکل ہے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ محض دنیاوی تعلیم جہاں اور جس شخص کو بھی دی جائے گی اس کا نتیجہ قابلِ افسوس ناکامی کی صورت میں رونما ہوگا۔

اے حضرات! ملک معظم کی تقریر سے، مختلف سرکاری رپورٹوں کے اقتباسات سے اور ممتاز عہدہ دارانِ سرکاری کے آراء سے صاف ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے متعلق قدم ہرگز پیچھے

نہیں ہٹایا جا سکتا۔ یہ تمام رائیں جس عقیدے پر متحد و متفق ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی تعلیم جو مذہبی اور اخلاقی تربیت سے معرّا ہو وہ ضرور ناکام رہے گی۔ اس لئے میری یہ پختہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی قوم کو جنھوں نے یونیورسٹی کی تحریک سے اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم کی خصوصیت اور تربیت کے حصول کا فیصلہ کر لیا ہے تو مذہبی تربیت کو نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ اب گزشتہ حالات کی طرف مراجعت نہیں ہو سکتی، لیکن جیسا کہ میں پیشتر عرض کر چکا ہوں، اس امر میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آئندہ تعلیم گراں تر ہوتی جائے گی۔ بہتر مکانات، بہتر ساز و سامان، بہتر عملہ اور بہتر ماحول بلاشبہ آخرالامر تعلیم کی خاصیت کو ترقی دینے والے ثابت ہوں گے۔ اور اس سے اُس چیز کا حصول زیادہ آسان ہو جائے گا جسے گورنمنٹ نے اپنی پالیسی کا "مقصد اولین" قرار دیا ہے۔ لیکن یہ صورت مسئلہ بہ نسبت سابق زیادہ اخراجات کی موجب ہوگی اور یہ امر مسرت خیز ہے کہ گورنمنٹ نہ صرف اس حیثیت سے واقف ہے بلکہ ان روایات کے مطابق جو ایک روشن ضمیر، فیاض اور ترقی کن حکومت کے لئے مخصوص ہوتی ہیں وہ اس سوال کے مالی پہلو پر توجہ کرنے کے لئے بھی تیار رہے۔

اب میں اس حالت کے متعلق عرض کرتا ہوں جو اعلیٰ تعلیم میں ہماری ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ ابتدائی تعلیم میں من حیث القوم ہماری حالت کسی قدر بہتر ہے لیکن اعلیٰ تعلیم میں ہم دیگر اقوام کے مقابلہ میں بہت پس ماندہ ہیں۔ تلافی مافات کی سخت ضرورت ہے۔ آرٹس کالجوں میں ہمارا اوسط صرف ۴ء۱۰ ہے یعنی کالج کے ہر سَو طالب علموں میں سے صرف دس مسلمان ہیں۔ کسی پیشہ کی تعلیم دینے والے کالجوں میں یہ اوسط اور بھی کم ہے یعنی صرف دس ہے۔ ثانوی تعلیم میں بھی ہماری حالت کچھ اچھی نہیں ہے، اور تعلیم کے مدارس میں ہر سَو میں صرف ۱۹ طلبا مسلمان ہیں۔ عام تعلیم گاہوں میں بھی مسلمان طلباء کی تعداد دیگر اقوام کے مقابلے میں حوصلہ افزا نہیں ہے۔ صوبہ وار تفصیل پر اگر غور کیا جائے تو صوبہ مدراس میں ہر سَو طالب علموں میں سے مسلمان نو ہیں، بمبئی میں ۱۶، بنگال میں تقریباً ۱۸، ممالک متحدہ میں ۱۵، پنجاب میں ۲۸، برہما میں ۲، مشرقی بنگال و آسام میں ۵۲، ممالک متوسط و برار میں ۹، کرگ میں ۲ اور صوبہ شمال و مغرب سرحدی میں ۶۳ صرف شمال و مغرب سرحدی و مشرقی بنگال و آسام ہی وہ صوبے ہیں جس میں مسلمانوں کا اوسط زیادہ ہے اور اس طرح پر یہ امر ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں ہنوز ہماری

حالت بہت پست ہے اور ضرورت ہے کہ تلافی مافات کرنے اور دیگر اقوام ہند کے دوش بدوش ہونے کے لئے مستقل اور زبردست جد وجہد سے کام لیا جاوے۔

حضرات! ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے جو اگرچہ ابتدائً تعلیم سے علاقہ نہیں رکھتا لیکن بالآخر اس سے گہرا تعلق رکھتا ہے وہ یہ کہ تعلیم کی مجموعی اور آخری صورت کیا ہونا چاہیئے، میں یہاں اس امر کے فلسفے پر بحث کرنا نہیں چاہتا کہ علم کو علم کی خاطر حاصل کیا جاوے۔ یہ ایسا مبحث ہے جس کو میں دیگر حضرات کے لئے چھوڑتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک جب ایک شخص کو خوراک کی حاجت ہو تو فلسفہ اس کے لئے وجہ تسلی نہیں ہوسکتا اور اگر ہم ایک بھوکے اور قحط دیدہ گرسنہ کے دل کو افلاطون کے اصول فلسفے کے بیان سے تسلی دینا چاہیں تو یہ وہ بات ہوگی کہ ایک گداگر کے ہات میں جو روٹی کے لئے چلاّ رہا ہو ہم پتھر کا ٹکڑا رکھ دیں۔ میں دوسرے ممالک کی بابت تو جانتا نہیں کہ وہاں حالات مختلف ہیں، لیکن ہندوستان کی حالت کے لحاظ سے بالعموم ہمارے لئے سوائے اس کے اور چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم اُس قسم کی تعلیم کے حصول کی جد وجہد کریں جو طنزاً "دال روٹی" کی تعلیم کہلائی جاتی ہے۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوتا ہے تو میرے خیال میں اس کا سبب نتائج تعلیم کے متعلق فلسفیانہ خیالات کی کمی نہیں ہے بلکہ اس قسم کے اقتصادی حالات ہیں جو دیگر معاملات کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ناقابل تسخیر ثابت ہوئے ہیں۔ ہندوستانی تعلیم کے اس پہلو کے متعلق لارڈ کرزن کی جو رائے تھی وہ گورنمنٹ ہند کے رزولیوشن مورخہ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۴ء میں بالتفصیل مذکور ہے اور اس رزولیوشن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"......... مختلف اسباب نے، جن میں سے کچھ تو تاریخی اور کچھ اجتماعی ہیں، باہم مل کر بہ نسبت انگلستان کے ہندوستان میں نمایاں صورت میں یہ نتیجہ پیدا کیا ہے کہ اکثر طلبا، جن سے اعلیٰ مدارس اور یونی ورسٹیاں معمور ہیں، اپنے تئیں حصول معاش کے قابل بنانے کی غرض سے داخل ہوئے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ سرکاری ملازمت کو زیادہ قابل وثوق، زیادہ معزز اور زیادہ پسندیدہ طریق معاش خیال کرتا ہے اور طلبا کی طرف سے ان کثیر التعداد منافع کی آرزو ان اسکولوں اور کالجوں کو اپنے اُن مناسب فرض کی ادائگی کے مانع آتی ہے جو آزادانہ تعلیم کے مخزن کی حیثیت سے اُن پر عائد ہے۔ اِن وجوہ کی بنا پر بارہا اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ

ہندوستان میں تعلیم کے اعلیٰ فوائد کو اس رائج الوقت طریق سے سخت نقصان پہنچ رہا ہے کہ سرکاری ملازمت کے امیدواروں کا انتخاب یونیورسٹی اور اسکول کی سندات پر منحصر رکھا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس پہلو میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ اُن کے خیال میں اگر سلطنت سے یہ مادّی تعلقات منقطع ہو سکیں اور انگلش سول سروس کمیشن کے طریق پر ایک خاص بورڈ کے ماتحت پبلک سروس کے متعلق الگ امتحانات مقرر کئے جا سکیں تو تعلیمی معیار بہت بلند کیا جا سکتا ہے۔۔۔"

لارڈ کرزن کی گورنمنٹ نے اس رائے کو قبول نہیں کیا لیکن مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میری اس رائے سے متفق ہوں گے کہ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال ضرور قابل بحث ہے کہ آخر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان کیا کرنے والے ہیں؟ یہ تو محال ہے کہ سب کے سب سرکاری ملازمت اختیار کریں۔ ان میں سے اکثر قانونی پیشہ اختیار کر سکتے ہیں، جس میں اگرچہ پہلے ہی سے بہت کچھ اژدحام ہے۔ تاہم مسلمانوں کے لئے جگہ نکل سکتی ہے۔ بہت سے انجینیری کے پیشے میں جا سکتے ہیں، جس میں ہماری معدومیت شہرۂ آفاق ہے اور بہت سے طب کے پیشے میں داخل ہو سکتے ہیں جس میں ہمارا وجود برائے نام ہے۔ لیکن بایں ہمہ ایسے گریجویٹس کی ایک کثیر تعداد باقی ہے گی جنھیں مناسب جگہ ملنے کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی، اور جوں جوں ہر سال مختلف یونی ورسٹیاں تعلیم یافتہ طبقے میں اضافہ کرتی جاتی ہیں اُن سب کے لئے حصول معاش کا مسئلہ نہایت ضروری اور سخت مشکل صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس سوال نے پہلے ہی ہمیں بہت کچھ متفکر کر رکھا ہے۔ اور اگر ہم نے اسے حل کرنے کی کوشش نہ کی تو عنقریب سخت مشکل حالات کا مقابلہ ہو گا۔ میں مایوس نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ہمیں زندگی کے دوسرے طریقوں کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیئے اور اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے میری رائے میں ضروری ہے کہ تعلیم کو ایسی صورت میں لایا جائے جو زیادہ تر عملی ہو اور ضروریات زندگی کے لئے زیادہ موافق ہو۔

صنعتی و حرفتی تعلیم ہم دماغی قابلیت کے انعام جیتنے کی سعی و کوشش میں اس قدر منہمک ہیں کہ صنعت و حرفت کے متعلق ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن کی طرف سے قطعاً غافل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مسٹر ٹاٹا اور دیگر ملک التجار حضرات کے ہم ممنون احسان ہیں جو ہندوستان کی سب سے زیادہ حوصلہ مند قوم یعنی پارسیوں سے تعلق رکھتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک صنعتی تعلیم گاہ کے قائم کرنے کے

علاوہ لائق اور منتخب ہندوستانیوں کو صنعت و حرفت و دستکاری و فنون کی تعلیم کے لئے ممالک غیر میں بھیجنے کی غرض سے متعدد انتظامات کر رکھے ہیں۔ پنجاب میں ہندو جوبلی ٹیکنکل انسٹیٹیوٹ قائم ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ اس کے مقابلہ میں ہمارا ابھی کوئی اسکول ہو۔ بنگال میں رائے بہادر نریندر ناتھ سین اور سر چندر مادب گھوش کے فرزند بابو جے سی گھوش جیسے اصحاب کی مسلسل مستعدی کی بدولت صنعتی تعلیم کی ترقی کے لئے ایک انڈین ایسوسی ایشن قائم ہے جو مفید کام کر رہی ہے اور جو ہر سال طلبا کی جماعتیں صنعت کے متعلق علمی اور عملی معلومات حاصل کرنے اور آخر الامر حرفت کا کوئی شعبہ اختیار کرنے کی غرض سے انگلستان، امریکہ اور جاپان بھیجتی رہتی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک من حیث القوم نہ ہمارے پاس کوئی اس قسم کی درس گاہ ہی اور نہ کوئی اس قسم کی انجمن ہے اور نہ اپنے نوجوانوں کو جن پر ہماری آئندہ اُمیدوں کا انحصار ہے، اس شعبہ کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کی ہے، جو آئندہ ہمارے ان بیکار افراد کے لئے میدانِ جد و جہد کی صورت اختیار کرنے والا ہے جو سرکاری ملازمت کے دروازے اپنے لئے مسدود پائیں گے۔ میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بمبئی کے ممتاز لکھپتی سر ابراہیم کریم بھائی کی شاہانہ فیاضی کے طفیل سے علیگڑھ میں ایک کالج کی بنیاد پڑ چکی ہے، جو پرنس آف ویلز سائنس کالج کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن جو رقوم جمع ہوئی ہیں وہ نہ صرف بہت قلیل ہیں بلکہ اس کالج کو عملی صنعت کے محکمہ کے درجہ تک پہونچانے کی غرض سے جس وسعت کی ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں سراسر غیر مکتفی ہیں۔ اُس زمانہ میں جبکہ بقول ایک ممتاز مصنف کے (ترقی صنعت مصنفہ ایچ گھوش) اس ملک کے باشندے "قدرت کی فیاضیوں" کی بدولت صنعت و حرفت کے زیادہ محتاج نہ تھے اور زراعت ہی ان کے لئے ہر طرح سے کافی تھی، صورتِ حال آج سے مختلف تھی۔ لیکن جوں جوں آبادی بڑھتی گئی زمین کی زرخیزی میں فرق آتا گیا۔ آزاد تجارت کے اصول رائج ہو گئے۔ ہندوستان کے حالات میں ایک مہتم بالشان تبدیلی واقع ہو گئی اور اب اس ملک کی اقتصادی تجارت اگر تمام تر نہیں تو ایک بڑی حد تک ضرور محض زمین کی پیداوار پر نہیں بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت پر منحصر ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ مغربی تعلیم کی طرح ہمارے ہندو بھائی صنعت و تجارت میں بھی ہم سے سبقت لے جا چکے ہیں۔ تیس سال کا عرصہ گزرا ہے کہ مسلمانانِ ہند بڑی یاس و ناامیدی کی حالت میں نوحہ زنی کرتے تھے کہ ہم انگریزی تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تیس

چالیس سال بعد ہمیں پھر یہ شکایت لاحق ہوگی کہ صنعت وحرفت اور تجارت کے زیادہ پُرامن شعبوں میں ہم دیگر اقوام کے مقابلے میں بالکل پس ماندہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں من حیث القوم سرکاری ملازمت کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کرلینا چاہئیں یا مختلف آزاد پیشوں کی طرف مثلاً قانون، طب اور انجنیری کی طرف مائل نہ ہونا چاہئے بلکہ ہم میں ایک کثیر تعداد کو چاہیئے کہ ان شعبوں میں داخل ہو۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بمقابلہ دیگر اقوام کے سرکاری ملازمت میں ہمارا حصہ بالکل قلیل ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ مختلف سرکاری ملازمتوں کے متعلق ہمارے جائز حقوق پر ہماری تعداد کے لحاظ سے ضرور توجہ کی جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ کسی قوم کے تموّل کا اندازہ سرکاری ملازمت میں اس کی نیابت سے نہیں کیا جاسکتا انگلستان یا حقیقت میں یورپ کے کسی اور ملک کی دولت اور ثروت، اُن کے مصنوعات کی وسعت اور اُن کی تجارتی ترقی اور قابلیت پر منحصر ہے۔ اس کشمکش حیات میں جو ہمارے گرد جاری ہے میں اپنے نوجوانوں کو زیادہ آزاد اور سودمند پیشوں کی طرف متوجہ ہونے کی نصیحت کرتا ہوں۔ انھیں چاہئے کہ اپنے تئیں تجارت اور صنعت وحرفت کے کاموں میں لگائیں اور ملک کے اُن ذخائر کی تلاش کریں جو مشترک سرمایہ اور باقاعدہ محنت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اُنھیں باہر جاکر بڑے بڑے کارخانوں اور عظیم الشان تجارتی دوکانوں میں کام سیکھنا چاہیئے اور پھر خود اپنا کاروبار جاری کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں تجارتی کاروبار کے لئے کافی سرمایہ مہیّا کرنا مشکل ہے۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ہم تھوڑی بہت شروعات ہی نہیں کرسکتے یا تجارت کے کاموں میں ہمیں بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے پیشے کچھ کم نہیں ہیں، جن کو ہم قلیل سرمایہ سے چلاسکتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے معقول آذوقہ حاصل کرسکتے ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ کسی قوم کی صنعتی دولت کی تاریخ دراصل اس کے کاموں کی معمولی ابتدا کی تاریخ ہوتی ہے اور قناعت استقلال اور محنت ومشقت کے اوصاف اُس کامیابی کے لئے کچھ کم ضروری اوصاف نہیں ہیں جو تموّل ودولت وثروت کا باعث ہوتی ہے۔ سرزمین ہند میرے خیال میں ایسے وسائل اور ذرائع سے بھرپور ہے جن کی اب تک کسی کو خبر نہیں اور جن سے اب تک کسی نے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ بہت سی خام پیداواریں ہیں جو ممالک غیر کو جاتی ہیں اور جو وہاں سے اشیاء درآمد اور نفیس فیشن ایبل اشیائے تجارت کی شکل میں واپس آتی ہیں۔ جن کو ہم اصلی قیمت سے سوگنا زیادہ دام دے کر

خریدتے ہیں بے شبہ ایسی دستکاریاں بھی ہیں جو بغیر سرمایہ کثیر کے نہیں چلائی جا سکتیں مثلاً لوہا، کپڑا بننے اور کاغذ بنانے کی کلیں لیکن ایسی دستکاریوں کی تعداد بھی بے شمار ہے جن کی چلانے کے لئے سرمایہ کی اس قدر ضرورت نہیں ہے جس قدر محنت اور استقلال کی۔ افسوس ہے کہ شکّر سازی کی صنعت جو بالکل دیسی صنعت ہے اب بہ نسبت سابق رو بہ تنزل ہے اور ظروف سازی کی قدیم صنعت بھی سرمایہ اور محنت کی کمی کی وجہ سے پژمردہ ہو رہی ہے۔

سیوان اور کھلنا واقع بنگال۔ اعظم گڈھ۔ آگرہ۔ چنار۔ لکھنؤ اور میرٹھ واقع ممالک متحدہ اور دہ سلیم مدورا واقع احاطۂ مدراس اور ہالا وبمبئی واقع احاطہ بمبئی کی منقش ظروف سازی کی صنعت آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی ہے۔ روغن دار ظروف سازی جو ایران کے قدیم ظروف کی نقل تھی اور جس کی نسبت سر جارج برڈوڈ کا قول ہے کہ افغان مغلوں کے ذریعہ سے ملک چین سے ایران میں تیمورلنگ کی چینی ملکہ کے اثر سے داخل ہوئی تھی وہ ایک زمانہ میں دہلی، پشاور لاہور اور ملتان میں خوب رائج تھی اور یہ نامور مقبروں، قبروں اور محلّات کی صنّاعی کے کاموں کی خوبی کو بڑھانے اور دیرپا رکھنے کے کام میں لائی جاتی تھی۔ مگر اب یہ فن اپنی جاں کنی کی حالت میں ہے۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی آرٹس یا فنون کا خاصہ ہے کہ یا تو وہ ایک خاص حالت پر آکر رک جاتی ہیں یا اُن میں تنزل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ معدوم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قدیم زمانے کے رتھ کو لیجئے کہ کسی نے اس کی جائے نشست میں ترقی کرنے یا رفتار میں تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس مغرب کی صنعت وحرفت کے نت نئے اصول اور نمونوں کی ترقیات کے مقابلے میں یہ صنعتیں قدرتی طور پر معدوم ہوتی جائیں گی۔ اب حالت یہ ہے کہ بجائے دہلی، لاہور اور ملتان کے روغن دار ظروف کے ریلوے اسٹیشنوں کے مسافرخانوں کے کمروں یا مشاہیر کے محلّات میں مغربی ممالک اور انگلستان کے ظروف نظر آتے ہیں۔ لیکن ظروف سازی کے لئے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مصالحہ ارزاں اور آسانی دستیاب ہو سکتا تھا اور کاریگر بھی بلا تکلف مہیا ہو سکتے تھے۔ ایک شخص جس میں عملی کام کرنے کا مادّہ ہو اور حرفت سے کسی قدر واقفیت اور انتظامی قابلیت ہو وہ اس صنعت کو سرسبز اور کاروبار کی حالت میں پہنچا سکتا ہے۔ ماسوائی اس کے شیشہ سازی کی حرفت ہے جس کو زمانہ حال کے طریقے پر نہیں چلایا گیا۔ راجپوتانہ اور دیگر ریگستانی علاقہ جات میں بغیر کسی کثیر سرمایہ کے اس کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ شیشہ سازی کی حرفت کے صرف دو کارخانے قابل ذکر ہیں ایک تو اپر انڈیا گلاس ورکس انبالہ میں

جس کی بنیاد ۱۹۵۸ء میں پڑی تھی اور دوسرا ممالک متحدہ میں بمقام نینی میں ہے۔ ایک کارخانہ کلکتہ میں بھی ہے لیکن اس کا مال ایسا اچھا نہیں کہ جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ دوسرے مقامات میں بھی شیشہ سازی کی غیر منتظمانہ جد و جہد کی گئی مگر وہ یا حالتِ نزار میں ہیں یا بند ہو گئے ہیں اور اس طرح پُرانے شیشہ گروں یا چوڑی گروں کو روٹی کمانا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس قسم کے خانگی ضروریات کی اشیا جیسے بچوں کے آئینے۔ لمپوں کی چمنیاں۔ فانوس اور شیشے کے گلاس، ان چیزوں تک کے لئے ہمیں بلجیم، آسٹریا اور جرمنی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ دروازوں کے پردوں کے لئے موتی اور پوتھ وینس اور وائنا سے منگوانے پڑتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کی پژمردہ صنعتوں کے متعلق آپ کی سمع خراشی صرف اس لئے نہیں کی کہ ہم ان کی طرف سے بے پرواہی کرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ کیسے ظلم کی بات ہے کہ ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ ہندوستان کے دوکاندار پیدائشی دوکاندار ہوں۔ اور کمہار پیدائشی کمہار ہو۔

قصہ کوتاہ ہماری حالت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے تجارتی کاروبار اور دوکانداری میں پہلے ہی سے ہم ہندو دوستوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور سرمایہ مشترکہ کی کمپنیوں کے مقابلے میں بھی ہم میں اور ابناء وطن میں اس سے کچھ کم بُعد و فصل نہیں ہے۔ میں یقین نہیں کرتا کہ یہ بات محض ہمارے افلاس اور تنگدستی کے سبب سے ہے۔ بے شک ہم غریب ہیں اور غریب اس لئے ہیں کہ بمقابلہ اپنے متحمل اور سرسبز اور کفایت شعار ہندو بھائیوں کے ہم غیر مآل اندیش اور مسرف ہیں۔ تجارتی معاملات میں ہمارے مقابلتہً پیچھے رہ جانے کے اور بھی وجوہات ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ ہم باقاعدہ کاروبار کے طور طریق سے نا آشنا ہیں۔ دوسرے ہم کو یہ ایک مہمل شک رہتا ہے کہ شاید اس کام کے کرنے میں فائدہ ہو یا نہ ہو اس لئے ہمارے صاحبِ جائداد اور متمول لوگ بہت سے ایسے ہیں جو تجارتی کاروبار میں ہاتھ ڈالتے جھجھکتے ہیں۔ بہت سے ہندو والیانِ ریاست، مالکان آراضی اور زمیندار تجارتی کمپنیوں میں ہمیشہ حصہ لیتے رہتے ہیں جیسا کہ ہز ہائینس راجہ صاحب ناہن، رائے بہادر لالہ رام سرن داس صاحب اور ایسے ہی بہت سے دیگر اصحاب ہیں لیکن کوئی نواب یا کوئی اور بڑے مسلمان صاحبِ آراضی کسی تجارتی کمپنی میں شرکت کرنا اپنی شان کے خلاف تصور کرے گا انگلستان اور دیگر ممالک مغربیہ میں لارڈز اور دوسرے بڑے بڑے آدمی تجارتی کاروبار میں نمایاں حصہ لیتے ہیں لیکن من حیث القوم ہماری سمجھ ہی میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ طبقہ متوسطہ کے تعلیم یافتہ اور کاروباری لوگوں کے ساتھ

ارباب دولت کے کام کرنے سے ایک قسم کی ساکھ قائم ہوتی ہے۔ جس کے بغیر بہت ہی تھوڑے تجارتی کاروبار ہوں گے جو شروع کئے گئے ہوں۔

حضرات! ہندوستان میں تعلیم عامہ کے ہم پلہ تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی ہے آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ ایک بڑا نازک مسئلہ ہے کیونکہ اس کا اثر ہندو اور مسلمان دونوں کی عزیز مقدس رسوم پر پڑتا ہے یا پڑنے کا احتمال ہے۔ اختلاف آرا، صرف اس سوال کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس سوال کے متعلق بھی ہے کہ عورتوں کے درس کے لئے کس قسم کی کتابیں ہونا چاہئیں جو اُن کے اور جماعت نسواں دونوں کے حق میں سودمند ہوں۔ پس اس سوال کے دو شق ہیں۔ (۱) یہ کہ طریق تعلیم کیا ہو؟ - (۲) نصاب تعلیم کیا ہو جو عورات کے لئے سودمند ہو؟ طریق تعلیم کے متعلق آزادی پسند جماعت کی تو یہ رائے ہے کہ جب تک پردہ کا رواج قائم رہے گا عورتیں تعلیم نہیں پاسکیں گی اور پاسکیں گی تو وہ تعلیم کافی نہ ہوگی۔ قدامت پسند یا وہ لوگ جو زیادہ صحیح طور پر کنسرویٹو کہے جاسکتے ہیں اس کے بالکل مخالف ہیں کیونکہ اس سے پردہ کی جس کو وہ دل وجان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں بے حرمتی ہوتی ہے۔ وہ اس امر کو نہایت تباہ کن سمجھتے ہیں کہ آزادی پسند جماعت کا یہ خیال ہو کہ زنانہ اسکول کی چاردیواری میں گویا اصلاح کی بمب کا گولا پٹکا جائے تجربہ اور (بہترین استاد) زمانہ شاید بتلائے کہ ہم اپنے جسم کے بہترین حصے کو (عورات کو) کس طریق سے بہترین تعلیم دے سکتے ہیں۔ لہذا میں نہیں چاہتا کہ اس امر کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار سے میں آپ کی سمع خراشی کروں مگر صاحبان۔ ایک بات کا تو مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارا مذہب صاف طور پر تعلیم نسواں کا ممد و معاون ہے طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مُسلم و مُسلمۃٍ - میں باور کرتا ہوں کہ اس امر میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو تعلیم دی جانی چاہئے۔

گھر جہاں بچے پرورش اور تربیت پاکر مرد اور عورت بنتے ہیں اُس طاقت کے لحاظ سے اچھے یا برے ہوتے ہیں جو وہاں حکمراں ہوتی ہے اور جو طاقت گھروں پر حکمرانی کرتی ہے وہ ماں ہوتی ہے۔ سب سے پہلا اور بڑا معلم مثال ہوتی ہے اور یہ مثال ماں ہی کی ہوتی ہے جو ہمیشہ بچوں کے پیش نظر ہوا کرتی ہے اور اُن کی زندگی پر اس کا ہی اثر پڑا کرتا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں جو بہت اثر پذیر اور تقلید کا زمانہ ہوتا ہے یہ ماں ہی کا سانچہ ہے جس میں نوزائیدہ بچہ ڈھلتا رہتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرا یہ کہنا بجا ہوگا کہ رنج یا راحت، روشن دماغی یا جہالت مزاج اور طبیعت اور عادات کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا انحصار جن کے ساتھ پرورش پاتا ہے ایک بڑی حد تک اُن اختیارات کے استعمال پر ہوتا ہے جو عورت کو گھر کی خاص بادشاہت میں

حاصل ہوتے ہیں عورتیں ہمارے نیک و بد اور رنج و راحت کی شریک حال ہوا کرتی ہیں۔ جب صورت حال یہ ہی تو ہم پر مذہبًا اخلاقًا اور مجلسی قواعد کی رو سے واجب اور لازم ہی کہ ہم ان کو تعلیم دیں اور اس قابل بنائیں کہ زندگی میں وہ ہمارے لئے ایک رفیق اور ہمدم ثابت ہوں۔ اب سوال یہ ہی کہ وہ تعلیم کونسی ہی جو دی جائے۔ حضرات! اگرچہ میں اس امر میں مخالفین تعلیم نسواں کے ہم رائے نہیں ہوں کہ عورتوں کو جغرافیہ کی اتنی تعلیم ہو کہ وہ گھر کے مختلف کمروں کو جان لیں کیمسٹری کی اسقدر کہ پانی کا اُبلنا جانیں اور تاریخ کی اسقدر کہ اپنے والدین کے مختلف رشتہ داروں کو معلوم کر لیں تاہم برخلاف اس کے میں اس تعلیم کا بھی سخت مخالف ہوں جو عورت کو اس کے دائرہ سے نکال دے یا اس کو گھر کی چار دیواری کو اس سے چھڑا دے۔ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے اسکیم میں میں مذہبی تعلیم اور کامل مذہبی تعلیم کو سب سے اول جگہ دونگا۔ اس کے بعد سینا پرونا، سوزن کاری اور خانہ داری کی تھوڑی تعلیم حفظان صحت کا علم ان کے علاوہ انگریزی سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہو تاکہ دوائی شیشیوں کے لیبل اور دوسری ضروریات خانہ داری کی چیزوں کے ناموں کی شناخت ہو سکے۔

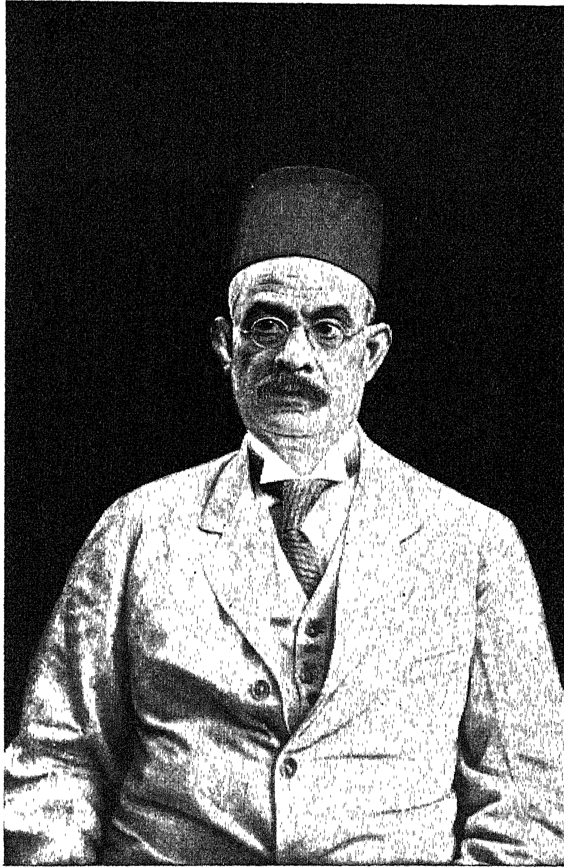
حضرات! اس بارے میں آپ کے کچھ ہی خیالات کیوں نہ ہوں کہ ہماری مستورات کو کس طریق پر تعلیم دی جائے اور میں جانتا ہوں کہ ابھی اس پر سب کا اتفاق رائے بھی نہیں ہوا ہی لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہی وہ یہ کہ اگر آپ تعلیم نسواں کی مخالفت بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اصولاً بھی ہم کو یہ تعلیم دلانا چاہیئے اور اس کی طلب اور ہم رسانی کے اعتبار سے ہم پر لازم ہی کہ ہم تعلیم دلائیں۔ زمانہ اس کی تائید میں ہی اور جس طرح ہم آبشار نگرا کو روک نہیں سکتے اسی طرح ہم اُن کی تعلیم کی بھی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ ٹرکی اور مصر میں پہلے ہی سے تعلیم نسواں کی بابت ایک فیصل شدہ تحریک موجود ہی۔ ہندوستان میں بھی دیگر اقوام اس خصوص میں سرگرمی دکھلا رہی ہیں بنگال میں ہندوؤں نے اور حیدرآباد میں مسلمانوں نے اس میں بڑی ترقی کی ہی۔ بمبئی اور مدراس میں نوجوان لڑکیوں کی تعلیم کا خوب بندوبست ہو گیا ہی اور بھوپال میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی فیاضی کی بدولت ایک بہت عمدہ درس گاہ نوجوان خواتین کے لئے جاری کی گئی ہی۔ مجھے معلوم ہی کہ مستورات کو تعلیم یافتہ بنانے کی مخالفت ہی لیکن مجھے یقین ہی کہ اگر ہم اس کی تعلیم کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو سب سے اول جگہ دیں تو یہ مخالفت جاتی رہے گی۔

حضرات! ایک بات مجھے سب سے زیادہ کھٹکتی ہی اور جس پر اس قدر غور نہیں کیا گیا جس قدر کی وہ مستحق ہی۔ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو میٹرکیولیشن کا امتحان پاس کر لینے کے بعد بوجہ نہونے کافی ذرائع کے تعلیم آگے جاری نہیں رکھ سکتے۔ ہم نے اپنی قوم کے اُن نادار غیر مستطیع طلبا کی امداد کے لئے ابتک کچھ نہیں کیا۔ مسلمانوں کی بڑی ضرورت ہی کہ چند وظائف کا اہتمام کیا جائے جن سے غریب اور مستحق طلبا کو مدد مل سکے۔ یہ ضرورت نہیں ہی کہ سارا ہندوستان مل کر ایسے وظائف مقرر کرے اور اگر ایسا ممکن ہو تو مجھے کوئی وجہ مخالفت نہیں ہوگی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ عملی طور سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہر ایک صوبہ یا ضلع میں اس مطلب کے لئے علیحدہ علیحدہ فنڈ ہوں۔ کام کرنے والوں کی ایک شریف جماعت

نے جس کا نام انجمن ترقی تعلیم امرتسر ہے اس بارہ میں نہایت عمدہ تحریک جاری کی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ دوسرے اضلاع میں بھی اس کی تقلید کی جائے گی اور جہاں جہاں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اس جگہ ایک ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل فنڈ کے قائم کرنے کے متعلق وصولی چندہ کے لئے ایک کارکن کمیٹی کے قائم کرنے میں دریغ نہ ہوگا۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو مجھے یقین ہے کہ اپنی قوم کے تعلیمی درجہ کو دیگر اقوام کے پہلو بہ پہلو کرنے کے اہم مسئلہ میں ہم کامیاب ہوں گے

ایک اور معاملہ بھی ہے جس پر اسی طرح کم توجہ کی گئی ہے۔ یعنی علوم قدیمہ کی استواری جس کا حوالہ نمایاں طور سے حضور ملک معظم نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایڈریس کے جواب میں دیا تھا۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے ترقی دینے میں بہ حیثیت ایک قوم ہم نے یا تو بہت کم جدوجہد کی ہے یا عملاً کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد میں اس کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔ لیکن کسی ملک میں بھی حتیٰ کہ اُن ممالک میں جہاں یونیورسٹیاں بکثرت ہیں قدیم علوم کی اشاعت کرنے کا کام یا السنہ قدیم اور قدیم فلسفہ اور تاریخ کو ترقی دینے کا کام محض یونیورسٹیوں پر بلا امداد و معاونت نہیں چھوڑا گیا۔ سوسائٹیاں، تعلیم گاہیں، مدارس اور انجمنیں اس کے کام میں امداد اور تقویت دیتی ہیں۔ لیکن اس میں مجھے شبہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی کوئی ایسی سوسائٹی ہے یا اُس کے پاس اس کام کے لئے سرمایہ ہے کہ متلاشیان علوم کے لئے ترجمہ اور اخذ مطالب سے وہ خزانۂ علوم بہم پہنچائے جو عربی یا فارسی السنہ میں یا نایاب قلمی نسخہ جات میں بکھرے پڑے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کوئی ایسی انجمن قائم کرنے کی سرگرمی کے ساتھ سعی کریں جو السنہ مشرقیہ کے تراجم و اشاعت کا کام کرے تو ہماری یہ کوشش حق بجانب ہوگی۔ پنجاب میں سردار سندر سنگھ مجیٹھ کی سعی و کوشش سے اس قسم کی ایک تحریک کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ بنگال میں ہندوؤں کی ایک سبھا ساھتیا پاریشاد نام کی قائم ہے۔ بمبئی میں بھی اس قسم کی انجمن ہے جس کی کامیابی رانا ڈے اور تلانگ جیسے اصحاب کے طفیل میں ہوئی ہے۔ الٰہ آباد میں نہایت مفید کام پنینی کے دفتر میں تراجم اور طبع کے ذریعہ سے ہو رہا ہے لیکن ہمارے یہاں اس قسم کی کوئی انجمن نہیں ہے۔

اے حضراتِ کانفرنس! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا جس کے لئے میں خواستگار معافی ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے صبر اور توجہ سے میری تقریر کو سنا جس کو میں صرف ایک بات اور کہہ کر ختم کرتا ہوں۔ آپ کا مقصد درحقیقت نہایت اعلیٰ اور شریفانہ مقصد ہے۔ میری مراد اس مقصد سے ہے جو آپ اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم کے لئے سرانجام دے رہے ہیں۔ تعلیم مثل خیرات کے ہے اس کو برکت دیتی ہے جو اُسے لیتا ہے یا دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے لئے اس کو ایثار، استقلال اور اس قوت ارادی کی ضرورت ہے جو ہم اس کے لئے صرف کر سکیں، اور اس لئے میں دست بدعا ہوں کہ آپ کو اُن مقاصد میں جو آپ کے پیش نظر ہیں اعلیٰ طور پر کامیابی حاصل ہو۔



آنریبل جسٹس سر عبدالرحیم کے سي آئی ای
صدر اجلاس بست و نہم (پونا سنہ 1915ع)

اجلاس بست و نہم

(منعقدہ پونا سنہ ۱۹۱۵ء)

صدر جسٹس سر عبدالرحیم کے سی آئی ای

حالات صدر

جسٹس عبدالرحیم سنہ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے ان کے باپ مولوی عبدالرب صاحب ضلع (مدناپور) بنگال کے زمیندار تھے اور ان کے دادا زمیندار ہونے کے علاوہ ڈپٹی کلکٹر بھی تھے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے لئے عزت ' ذمہ داری ' اور حکومت کا بڑا عہدہ خیال کیا جاتا تھا اور اس لحاظ سے ممدوح کا تعلق ایک شریف ' امیر اور تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ جنھوں نے مدناپور ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ میٹرک کے بعد پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوئے اور بیس برس کی عمر میں اعلیٰ قابلیت کے ساتھ بی اے کی سند حاصل کی۔ بی اے کے علاوہ انگریزی زبان میں ایم اے کی سند لی اور صوبہ بھر میں سب سے اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہوئے۔ ایم اے پاس کرکے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوئے ' قانونی تعلیم کے واسطے ہر ہائنس بیگم صاحبہ خلد آشیاں نواب شاہجہاں بیگم بھوپال کی طرف سے ان کو اسکالرشپ عطا کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں بیرسٹر بن کر ہندوستان آئے اور اسی سال کلکتہ میں پریکٹس شروع کردی۔ اپنے دوران تعلیم انگلستان ہی میں موصوف نے شرع محمدی اور قانون فوجداری کو سمجھنے کی خاص طور پر کوشش کی تھی اور انھوں نے اس وقت سے بحیثیت ایک مسلمان کے قانون اسلامی کا مسلم فقیہہ بننے کا تہیہ کرلیا تھا اور اس لحاظ سے انھوں نے عربی اردو فارسی کی فقہی کتابوں کا

اور ان پر جو حواشی ہیں ان کا خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

فوجداری کے مقدمات میں اُن کی ذہنیت اور نکات قانونی کے عبور نے تین چار ہی سال کے اندر ان کو ماہر قانون بنا دیا جس کی وجہ سے اُن کی پریکٹس کو اتنا فروغ ہوا کہ گورنمنٹ اور حاکمان اعلیٰ کی توجہ نے ان کو اپنی طرف سمیٹ لیا اور وہ ڈپٹی لیگل (ریمبرنسر) یعنی مددگار قانون بنا دیئے گئے۔ اس خدمت کو انھوں نے اٹھارہ مہینے تک انجام دیا اور پھر ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی جس کے بعد ان کی مزید کامیابی اور شہرت نے بلدۂ کلکتہ کے شمالی حصّہ میں بطور پریسیڈنسی مجسٹریٹ کے اُن کا تقرر کرایا۔ یہ عہدہ اس وقت عموماً ہندوستانیوں کو نہیں دیا جاتا تھا اس عہدہ پر یہ تین سال (سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۳ء) تک قائم رہے اور بعد ازاں پریکٹس کے شوق میں انھوں نے پھر وکالت شروع کر دی۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں محمڈن جوراس پروڈنس (اصول قوانین) ٹیگور لا کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔ لیکچر مذکور سنہ ۱۹۱۱ء میں بصورت کتاب شائع ہو گئے ہیں جو قانون محمدی پر ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔

مسٹر عبدالرحیم کے ٹیگور لا لیکچروں نے ہی اُن کی آیندہ ترقی کے لئے راستہ کھول دیا اور جب سنہ ۱۹۰۸ء میں مدراس ہائی کورٹ کو ایک مسلمان جج کی ضرورت لاحق ہوئی تو قرعۂ فال ان ہی کے نام نکلا سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں جولائی سے اکتوبر تک اور سنہ ۱۹۱۹ء کے انھیں مہینوں میں چار چار پانچ پانچ مہینے تک وہ مدراس ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس بھی بنائے گئے اور بنگال میں ممدوح کا تقرر ہونے سے پیشتر عام طور پر یہ خیال تھا کہ جسٹس موصوف مدراس ہائی کورٹ کے مستقل چیف جج ہو جائیں گے۔

قانونی دنیا کے باہر بھی انھوں نے تعلیمی معاملات میں بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا اور عرصہ تک موصوف مدراس یونیورسٹی کی سنٹ اور سنڈیکٹ کے ممبر رہے مدراس اور میسور یونیورسٹیوں میں کنووکیشن ایڈریس دینے کا فخر بھی انھیں حاصل ہو چکا ہے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں ندوۃ العلما اور سنہ ۱۹۲۰ء میں مجلس العلما منعقدہ تنجور کی استقبالیہ کمیٹیوں کے صدر منتخب ہوئے۔

مدراس ہائی کورٹ کی ججی کے تقرر سے پہلے انھوں نے مسلم لیگ کے احیاء میں خاص کوشش کی تھی اور اُس کے قواعد بنانے میں ان کی دلچسپی اور توجہ کا بڑا حصّہ شامل تھا۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں جو آل انڈیا ڈیپوٹیشن لارڈ منٹو کی خدمت میں شملہ گیا تھا اس کے ارکین میں سے ایک یہ بھی تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مدراس محمڈن ایجوکیشنل ایسوسی ایشن، انجمن اسلام مدراس کے ٹرسٹی اور ممبر ہیں

مدرسہ اعظم اور گورنمنٹ محمدن کالج مدراس کے بورڈ آف وزیٹرز کے صدر ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں دوسرے درجہ کا تمغۂ قیصر ہند ان کو ملا۔ چونکہ جسٹس عبدالرحیم کی توجہ قومی تعلیم پر زیادہ مائل تھی۔ اس لئے ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کے انتیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ پونا کے صدر منتخب ہوئے اس وقت مسلم یونیورسٹی کے سوال نے مشکل صورت اختیار کرلی تھی اور یونیورسٹی کے بہت سے اختیاری مسائل پر مابین گورنمنٹ ہند قومی نقطۂ نظر سے اختلاف آرا تھا اس وجہ سے کانفرنس کا یہ اجلاس خاص خصوصیت رکھتا تھا جس کو صدر محترم نے بہت قابلیت کے ساتھ قابو میں رکھا۔

ان کے چیف جسٹس مدراس ہونے کے عام گمان اور خیال کو گورنمنٹ کی مصلحتوں نے نظر انداز کردیا اور بجائے چیف جسٹس ہونے کے بنگال کی انتظامی کونسل میں ان کو جگہ دے کر اشک شوئی کردی گئی۔ اس کونسل میں رہ کر موصوف نے گورنمنٹ کو قابل قدر مدد دی کیوں کہ یہ زمانہ حکومت کے لئے سخت ترین زمانہ تھا ایک طرف تو جنگ عظیم نے جنگی مشکلات کی وجہ سے سلطنت کے ارکان کو فکر مند کردیا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں حقوق طلبی کا سوال تھا۔ خود گورنمنٹ نے اس جائز خواہش پر بارہا اپنی ہمدردی کا اظہار کرکے ان خواہشات پر کامیابی کا یقین دلانے کی کوشش کی تھی لیکن وعدہ وعید کی حقیقت موثر نہ ہونے کی صورت میں ہندوستانیوں کے جذبات کو فطرتاً ٹھیس لگی اور یہ خیال یقین کے درجہ تک عام طور پر پھیلتا گیا کہ ہندوستان کے حقوق کا وعدہ وعدۂ فردا سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ لہذا نتیجہ میں عام سیاسی بے چینی کا رونما ہونا لازمی بات تھی۔ چنانچہ عام طور پر ایجی ٹیشن کی آندھی اس زور سے اٹھی جس نے تمام ہندوستان کی فضا کو یک لخت مکدر اور خاکستر بنادیا۔ ادھر رولٹ ایکٹ پاس ہوا ادھر نان کوآپریشن کی تحریک عالم وجود میں آئی ہزارہا فرزندان ہندوستان نے آزادی کے دیوتا پر نثار ہوکر اپنے آپ کو جیل خانوں میں ڈالدیا۔ ایسے پر آشوب زمانہ میں مسٹر عبدالرحیم نے اپنی دماغی ذہنی اور اپنے عام اثر کی قوت سے بے نظیر مدد گورنمنٹ بنگال کی کی۔ مگر ان کو اس خدمت کا کیا صلا ملا۔ انھیں دنوں جب گورنر بنگال چند مہینوں کے لئے بحصول رخصت انگلستان جا رہے تھے تو عام طور پر یہ خیال قایم تھا کہ ان کی قائم مقامی سر عبدالرحیم سینیر ممبر ایگزیکٹیو کونسل کریں گے اور اس خیال کی تائید ملک کے ہر خیال ہر مذہب کے اخبارات اور لیڈروں نے کی اس قسم کے اظہار خیال و عام تائید سے یہ پوری توقع تھی کہ گورنمنٹ کی حکمت عملی میں اب تغیر ہوگا اور وہ اعلیٰ قابلیت کے ہندوستانیوں کو صوبہ داریاں دے کر ملک کی فضا میں ایک خوش گوار اثر پیدا کرنے کی کوشش

کرے گی ادھر ملک میں یہ خیال آرائیاں ہو ہی رہی تھیں کہ لندن کے ایک تار نے چیف کمشنر آسام کے قایم مقام گورنر ہونے کی اطلاع دی جس نے تمام امیدوں پر اور تمام خیالات پر پانی پھیر دیا۔ اور وہ دوسری مرتبہ بھی اپنے حق سے اس طرح محروم کر دیئے گئے۔ گورنر بنگال کی انتظامی کونسل سے علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے پھر پریکٹس شروع کر دی۔ بنگال میں (۵۶) فیصدی مسلم آبادی کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر انھوں نے قوم کے ملکی حقوق سے اپنی توجہ کا اظہار شروع کیا تھا کہ بنگال نیز بیرون بنگال کے ہندو پریس نے متفقہ طور پر ان کی مخالفت میں آواز بلند کی اور آرٹیکل لکھنے شروع کر دیئے ان کو اس بات کی کہاں تاب تھی کہ کوئی مسلمان اپنے قومی حقوق کی حفاظت یا اپنے جائز سے جائز مطالبہ کا بھی اظہار کر سکے۔

ہندوستان میں مسلمانان ہندوستان کی سلامتی کے لحاظ سے مسٹر عبدالرحیم اس رائے اور عقیدہ کے شخص ہیں کہ اگر ملکی حقوق و استحقاق خدمت میں تاوقتیکہ مسلمانوں کی جداگانہ نیابت نہ ہوگی وہ ہندوؤں کے ہمیشہ لقمہ بنے رہیں گے اور اپنی پس ماندگی اور کمزوری سے کبھی نہ ابھرنے پائیں گے۔ بدیں وجہ وہ تناسب و آبادی کے لحاظ سے گورنمنٹ کے ہر صیغہ اور ہر شعبہ میں مسلمانوں کا واجبی حصہ لینے کے خواہشمند ہیں۔ بنگال میں جہاں مسلمان میجارٹی میں ہیں کیا بلحاظ سرکاری خدمات کے اور کیا بلحاظ تعلیمی کیفیت کے وہاں ان کی بری گت ہے۔ سر عبدالرحیم کے اس قصور نے جب کہ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں میں ان کی پست حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش شروع کرنے کا عزم کیا ہی تھا ہر ہندو لیڈر ان کو بدنام کرنے کی فکر میں مصروف ہو گیا۔ اور بدقسمتی سے سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں نے باجے اور مسجد کا سوال کلکتہ میں پوری قوت کے ساتھ اٹھایا۔ اور اس وجہ سے کلکتہ میں ہولناک خوں ریزی اور تجارتی کاروبار کی بربادی کے واقعات پیش آئے۔ ان ہنگامہ آرائیوں اور ان پر آشوب واقعات کی ذمہ داری بھی ابنائے وطن نے انھیں کے سر تھوپی۔

ابنائے وطن کی اس کھلم کھلا مخالفت اور دل آزار طریقوں نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ کونسل کی جملہ پارٹیوں سے علیحدہ ہو کر آزاد مسلم پارٹی بنائیں۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں صوبہ بنگال کی کونسل کے انتخاب میں کوئی مسلمان سوراجسٹ پالیسی اور پارٹی میں شامل ہو کر منتخب نہیں ہوا۔ نتیجہ میں صوبہ مذکور کی کونسل میں مسلم پارٹی سر عبدالرحیم کی صدارت میں بہت زیادہ طاقتور بن گئی اور سوراج پارٹی اپنے گزشتہ اقتدار کو کھو بیٹھی۔ رفیا رم کی چند ناگفتہ بہ حالت

پچھلے تین سال میں رہی تھی وہ ایک حد تک سکون کی حالت میں آ گئی۔ حسب دستور وزراء کی تنخواہوں کے مقرر کرنے میں دشواریاں پیدا کی گئیں لیکن حکومت کے اور مسلمانوں کے اشتراک عمل نے مل جل کر تنخواہیں منظور کرا دینے میں کامیابی حاصل کی۔ اب وزارت کا معاملہ پیش تھا سر عبدالرحیم نے اخبارات میں ایک بیان شائع کیا اور دو وزیروں کے بجائے تین وزیروں کے تقرر کا مطالبہ پیش کیا۔ اور اس مطالبہ کو با اثر کرنے کے لئے اور اپنی رائے کو منوانے کے لئے صوبہ متحدہ اور صوبہ پنجاب کی مثالوں سے طاقتور کرنے کی کوشش کی۔ مگر بایں حکومت نے اس رائے سے بے اتفاقی برتی۔ کچھ عرصہ تک یہ مسئلہ پردۂ خفا میں رہا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو لارڈ لٹن نے سر عبدالرحیم سے خواہش کی کہ وہ ترتیب وزارت میں ان کی مدد کریں۔ ہز اکسیلنسی کی خواہش پر سر موصوف سر پی سی مترا سے ملے۔ اس کے بعد سر پی سی مترا اور مسٹر چکرورتی کی گورنر سے ملاقات ہوئی اور ہز اکسیلنسی گورنر نے فرمایا کہ مسٹر پی چکرورتی نے بہ حیثیت وزیر مشترکہ ذمہ داری پر کام کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے۔ سر عبدالرحیم کو اس شرط پر وزارت دی گئی کہ وہ اپنے دوسرے ساتھی کو قبول وزارت کے لئے آمادہ کریں۔ انھوں نے وزارت کا چارج لے لیا اور خوش خوش مسٹر پی چکرورتی سے ان کے مکان پر ملنے گئے تاکہ وہ ان کے ساتھ عہدۂ وزارت قبول کر کے دونوں یک دل ہو کر اور دست و بازو بن کر وزارت کو مضبوط بنائیں۔ لیکن اس ملاقات کا نتیجہ ناامیدی اور مایوسی کی شکل کے سوا اور کچھ نہ نکلا اور مسٹر پی چکرورتی نے سر پی سی مترا کی صلاح سے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے اور اس حالت میں عہدۂ وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا اس اختلاف اور عدم اشتراک عمل کا انجام کار یہ نتیجہ نکلا کہ سر ممدوح گورنر کی خدمت میں کسی ہندو ساتھی کو پیش نہ کر سکے جو ان کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہوتا۔ اور بالآخر وہ ہندوؤں کی ذہنیت خود غرضی اور تعصب کی وجہ سے ناکامیاب ہوئے اور ان کو حسب ایما گورنر مستعفی ہونا پڑا۔ غرض اس بازی میں سر عبدالرحیم کو شکست ہوئی اور اب وزارت کے دوسرے مہرے مسٹر اے کے غزنوی اور مسٹر پی چکرورتی کی شکل میں نمودار ہوئے جنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کر کے وزارت قبول کر لی۔

اس سلسلہ میں سر عبدالرحیم نے اپنا ایک اہم بیان اخبارات کو دیا ہے جو بدقسمتی سے اس ملک کی سیاسی فضا پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

وہ کہتے ہیں

"کچھ عرصہ سے اس طبقہ کے ماہرین (سر پی سی مترا) و مسٹر چکرورتی کی سیاست میرے خلاف

مسلسل طریقہ سے محض اس وجہ سے پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ میں اپنی قوم کے نمائندوں کو متحد کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ متفق ہو کر اپنی قوم کے جائز مفاد کو حاصل کر سکیں اور ملک کی سیاسی ترقی محفوظ اور واضح لائنوں پر قایم ہو سکے۔"

وزارت کو مضبوط بنانے کے متعلق بھی جو اظہار خیال اُنھوں نے کیا ہے وہ بھی بہت کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اگر لارڈ لنلتھگو اس طرح گمراہ نہ کئے جاتے اور مجھ کو کافی وقت دیا جاتا تو میں اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں ان کے لئے ایک مضبوط وزارت قایم کر دیتا اور ان کے عہد گورنری کے اختتام پر ان کی ان ناکامیوں کے آنسو پونچھ جاتے جو ان کی گزشتہ کوششوں کے سلسلہ میں ان کو برابر پیش آتی رہیں۔ اسی سلسلہ میں سر عبدالرحیم اور سر پی سی رائے کی خط و کتابت کے کچھ اقتباسات آگاہی و بصیرت کے لئے غالباً مفید ہوں گے جن سے متعصب ابنائے وطن کی ذہنیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ سر پی سی رائے اپنے ایک خط میں بنام سر عبدالرحیم لکھتے ہیں۔

"کہ میری پارٹی کے ممبران اور ہندو پبلک کے ایک بڑے طبقہ کے یہ خیالات ہیں کہ آپ نے ہندو جماعت کی اس طرح سخت توہین کی ہے کہ آپ نے ہندوؤں کا وزیر منتخب کرنے کی ذمہ داری بہت جلدی کر کے اپنے سر لی ہے۔ وہ ناگوار فضا جو آپ کے اس طریق عمل سے پیدا ہو گئی ہے اس کی بدولت آپ کی تجاویز ان کی حقیقی نوعیت کے لحاظ سے بحث و مباحثہ دشوار امر بن گیا ہے۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

میری جماعت کے بہت سے ممبران اور میں خود یہ خیال کرتا ہوں کہ جذبۂ ملی کے وسیع مفاد امن و امان قایم کرنے کے تمام اہم مسائل اور ہندو مسلمانوں میں ایک دوسرے کی بہتری کی خواہش پیدا کرنے کے لئے یہ امر مناسب ہے کہ دونوں جماعتوں میں ایک سمجھوتہ ہو جائے اور اسی کے مطابق عمل درآمد کیا جاوے۔ اگر ہم اس کا عملی انتظام کر سکے تو ہماری جماعت کے کسی ممبر کو آپ کے یا غزنوی صاحب کے ساتھ کام کرنے میں دشواری نہ ہوگی جو دونوں فرقہ دارانہ خیالات رکھنے والے اور اس طرح جذبہ قومیت کے مخالف خیال کئے جاتے ہیں۔

اس مسئلہ کی دشواریوں اور اہمیت کا خیال کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ایک کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا جاوے۔ جب عارضی سمجھوتہ ہو جائے تو اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو تیار کیا جائے کہ وہ وزارت قبول کر لیں۔ مذکورہ بالا خط کے اقتباسات کے متعلق جو جواب

سر عبدالرحیم نے دیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

آپ اچھی طرح پر واقف ہیں کہ مسٹر چکرورتی نے میرے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کرکے اور رضامند ہو کر عہدہ قبول کیا تھا اور صرف تعلیم محکمہ جات وزارت کا کام باقی رہ گیا تھا۔ آپ کے اور دوسرے ان حضرات کے مشورہ سے جن کا نام میں لینا نہیں چاہتا مسٹر چکرورتی اپنی پوزیشن سے علیحدہ ہو گئے۔ آپ اور مسٹر چکرورتی تھے جنھوں نے بظاہر میرے ساتھ کام کرنے سے انکار کرکے میری قوم کی سخت ترین توہین کی ہے اور یہ شرط پیش کردی کہ آپ اس وقت تک میرے ساتھ مل کر کام نہ کریں گے تاوقتیکہ میں آپ کی پیش کردہ شرائط کو نہ منظور کرلوں۔ یہ وہی شرطیں ہیں جن کا آپ نے حوالہ دیا تھا۔ اور وہ شائع ہو چکی ہیں۔

میں اس بیان کی پُر زور طریقہ سے تردید کرتا ہوں کہ میرا یا مسٹر غزنوی کا نقطۂ نظر فرقہ وارانہ یا مخالف جذبات ملی ہے۔ آپ کے خط سے صاف ظاہر ہے کہ یہ الزامات نہایت صحیح طور پر آپ کے موافق ہیں۔ نیز آپ کی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کے متعلق میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کانفرنس میں شریک ہونے اور اس میں حصہ لینے کے لئے میں ہر وقت تیار تھا۔ لیکن ایک دفعہ سے زیادہ آپ سے گوش گزار کر چکا ہوں کہ میں کسی خفیہ سمجھوتہ میں شریک نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی شرط اور وعدہ خفیہ طور پر کر سکتا ہوں جو کچھ بھی ہونا چاہیئے وہ پورا مباحثہ ہو لینے کے بعد اور اس کو عام کر دینے کے بعد ہونا چاہیئے۔

مذکورۂ بالا واقعات پیش آنے کے بعد ہندوؤں کے تعصب نے مسلمانوں میں تہلکہ ڈال دیا اور تمام اسلامی پریس نے ابنائے وطن کی فطرت پر نفرین کی کلکتہ میں مسلمانوں کا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں اے کے غزنوی سے وزارت کے استعفےٰ دینے کی خواہش کی گئی تمام مدارس اور کالجوں کے مسلم طلبہ نے صدائے احتجاج کے طور پر عام بازاروں میں بڑے بڑے جلوس نکالے اور مسٹر غزنوی کے اس فعل پر شرم کے نعرے بلند کئے ان عظیم الشان مظاہروں نے خاص جوش کی صورت اختیار کرلی۔ طلبہ اور طبقہ ذکور سے گزر کر خواتین اسلام نے علیحدہ جلسے کئے اور مسٹر غزنوی کو غیرت دلائی اور ان سے واپسی استعفےٰ کی درخواست کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسٹر غزنوی کو اپنی جان کا خوف پیدا ہوا۔ پولیس ان کے مکان کی حفاظت کے لئے مقرر ہوئی۔ چوں کہ سر عبدالرحیم انتظامی اور عدالتی قابلیتوں کا وسیع تجربہ رکھنے کے علاوہ ہوش مند اور پختہ کار ہیں۔ وہ گورنمنٹ کی مشنری کے ہر پرزے کے ماہر خیال کئے جاتے ہیں۔ اور وہ ان کے ہات کی کٹ پتلی نہیں بنائے جاسکتے

چونکہ مسٹر غزنوی کے ساتھ ہونے میں کسی مداخلت اور اثر کا خوف نہیں تھا۔ ان کو اپنا شریک کار بنانے میں کچھ پس وپیش نہ ہوا۔

واقعات بالا نے سر عبدالرحیم کے درجے اور عظمت کو ان کی ملت میں بہ نسبت پہلے کے بہت بلند اور باوزن کر دیا ہے۔ اور اس لحاظ سے بلاشبہ وہ اس وقت مسلمانان بنگال کے واحد رہنما اور لیڈر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں چونکہ انھوں نے اپنے ہم قوموں کے حقوق کی حفاظت پر زور دے کر صفائی کے ساتھ اظہار خیالات کیا تھا اس قصور کی بنا پر اب یہ کیسے ممکن تھا کہ ہندو وزارت ان کے ساتھ مل کر کام کرتی۔ ان کے اس عہدہ وزیر منتخب ہونے سے یہ امید کہ وہ ہندوستان کے مفاد کو بہترین اصول اور عمل کے تحت میں مدنظر رکھیں گے منقطع ہو گئی اور یہ ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ کونسل کو ان جیسے قابل اور ماہر سیاست سے جدا ہونا پڑا۔

ان کی قومی ہمدردی اعلیٰ قابلیت فضیلت علمی نے سنہ ۱۹۲۶ء میں پھر ان کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ دہلی کی صدارت کے لئے منتخب کیا۔ ان کا خطبۂ صدارت اپنی جامعیت اور تعلیمی نکات کے حل میں قابل مطالعہ اور لائق غور ہے آپ نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اب مسلمانوں کو کتابی تعلیم سے زیادہ جسمانی نشو و نما حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

نوٹ ۔ سر عبدالرحیم کے حالات بنٹن سیریز سے اور مابعد کے واقعات اخبار ہمدم وغیرہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔

خطبۂ صدارت

حضرات! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس کو اپنی بہت بڑی عزت تصور کرتا ہوں کہ آپ نے اس موقعہ پر مجھ سے صدارت کی خواہش کی۔ آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی ذمہ داریاں یوں تو ہمیشہ ہی ہوتی تھیں لیکن اس اجلاس میں خاص طور پر زیادہ ہیں۔ ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے مشکل مسئلہ کے متعلق کسی قسم کے فیصلہ پر پہونچنے میں ہم قوم کی امداد کریں گے۔ میں صفائی کے ساتھ آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ جس وقت میرے دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کی جانب سے صدارت قبول کرنے کی نسبت مجھ سے استمزاج کیا ہے تو گو میں نے اسے

قبول اس وقت بھی تذبذب کے ساتھ کیا تھا تاہم اُس وقت مجھے اپنے عہدہ کی حقیقی دشواریوں کا کامل احساس نہ تھا مجھے ایسا کوئی موقع یاد نہیں آتا جب کہ ہماری قوم کی حالت ایسی ہیجان کی ہو نہ مجھے ہندوستان کے اندر کوئی اور قومی مسئلہ ایسا نظر آتا ہے جس کے ساتھ اس قدر پر جوش دلچسپی ہو جیسی آج کل یونیورسٹی کے مسئلہ سے آپ صاحبان کو ہے۔ میں دعویٰ نہیں کرتا کہ میں اس نازک موقعہ پر آپ کے مباحث کی رہنمائی کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں ہوں۔ لیکن چونکہ آپ نے مہربانی کرکے مجھ پر اعتماد کیا ہے اس لئے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میرے اس قول کو باور فرمائیں کہ میں جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کروں گا وہ نہایت عمیق دلسوزانہ اور غیر جانبدارانہ غور کا نتیجہ ہوگا۔ علاوہ خود اس مسئلہ کی ذاتی اہمیت کے مجھے زیادہ تعلق خاطر اس جوش کی وجہ سے ہے جو اُس سے ہمارے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ اور جس کا صحیح اندازہ صرف اُنھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کو قوم کے اندرونی حالات پر عبور رہے کسی معاملہ میں مسلمانوں پر آسانی سے اثر نہیں ہوتا۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ انھیں اپنے خیالات اور جذبات کو عام طور پر موثر طریقہ سے کس طرح ظاہر کرنا چاہئے۔ کم از کم وہ اس اسلوب سے محض نابلد ہیں جو اس زمانہ میں خیالات کے عام طور پر اظہار کا واحد باضابطہ اسلوب تصور کیا جاتا ہے۔ درحقیقت بیرونی لوگوں پر یہ اثر پڑتا ہے کہ اہم سے اہم مسائل کی نسبت بھی (جنھوں نے اُن کے قلوب کی اندرونی سے اندرونی سطح کو متزلزل کر رکھا ہے) اُن میں سخت اختلاف ہے۔ لیکن چوں کہ میں مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کی پوری اہمیت سے واقف ہوں یہ میرا فرض ہے کہ آپ کو بتادوں کہ ایسے اور بھی تعلیمی مسائل ہیں جو ملک اور قوم کے لئے کامل اہمیت رکھتے ہیں۔ اور (بشمول مسلمانان ہند) باشندگان ہندوستان کی ترقی کے فوائد کے لحاظ سے آپ کی نہایت عمیق اور مستعدانہ توجہ کے محتاج ہیں۔

زمانہ کی پُر آشوب نوعیت

ایک اور سبب جس کی بناء پر میں اس کانفرنس کے مباحث کی صدارت کی خاص ذمہ داری کے احساس کی فکر میں مبتلا ہوں۔ مجھے آپ سے یہ عرض کرنے کی بمشکل ضرورت ہے کہ وہ زمانہ کی پُر آشوب نوعیت ہے۔ یہ زمانہ گورنمنٹ اور ہم دونوں کے لئے غایت فکر اور تردد کا ہے۔ لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ اس وقار اور متانت سے سر موتجاوز نہ کریں جو اسلامی مجالس کا خلاصہ ہے اس ملک کے باشندے (مسلمان اور ہندو) وفاداری کے ساتھ برٹش قوم کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑے ہوئے ہیں اور ایسی دور اندیشی کے ساتھ اور بے لوث طریقہ سے جان و مال سے اُن کی مدد کی ہے جس نے دنیا کو

حیرت زدہ بنا دیا ہے۔ بہت مبالغہ ہوگا اگر اس واقعہ کو چھپایا جاوے کہ اس خونریز جنگ نے مسلمانوں کے دلوں کو خوب ٹٹولا ہے۔ میں اس امر پر اپنی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری قوم نے اس امر کا یقینی ثبوت بہم پہونچا دیا ہے کہ وہ نازک سے نازک موقعوں پر بھی مآل اندیشی اور اعتدال سے کام لے سکتی ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے زیادہ اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ خود ہندوستان کے اندر وہ اپنے ہندو بھائیوں سے مل کر وہ اپنی مشترک قسمت کو سنوار سکتے اور انجام کار ایک قوم کے قدرتی منزل مقصود پر پہنچ سکتے ہیں جن کی تاریخ اس قدر مشہور ہے اور جن کے قوا فطری باشندگان ہند کے جیسے ہیں۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ برٹش سلطنت کے زیر سایہ ہم یہ مقصد حاصل کر سکیں گے۔ باشندگان ہند کی نسبت خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہا جاوے لیکن ان کا سنگ دل سے سنگ دل نکتہ چیں کم از کم غداری کا الزام ان پر عائد نہیں کر سکتا۔ ہم سب کی تمنا اور دعا ہے کہ نہ صرف انصاف اور تہذیب کی فتح ہو بلکہ اس جنگ کا نتیجہ یہ بھی ہو کہ یوروپین اقوام اپنے اب تک کے اصول زندگی پر نظر ثانی کریں۔ اگر نہیں تو موجودہ جنگ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آئندہ اور زیادہ تباہ کن پیمانہ پر جنگیں ہوں گی۔ پہلے جنگوں کے اسباب اکثر افراد کی حرص و طمع ہوا کرتے تھے مگر اب اس کی جگہ قوموں کے رشک و حسد نے لی ہے۔ اب خواہ اس کو آفتاب کے زیر سایہ جگہ کی خواہش سے تعبیر کیا جاوے یا اسی سلسلہ ارتقا کا نتیجہ قرار دیا جائے اور یا توازن طاقت کی ضرورت تسلیم کی جاوے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ خون آشام نفرت اور اس کے ساتھ غلط سمجھی ہوئی قومیت نے انسانیت کے مفہوم کو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اندر بالکل جذب کر لیا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا پختہ عقیدہ ہے کہ نوع انسان کا عروج کامل سے کامل تر ہونے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ موجودہ رستخیز کے بعد بھی قایم رہے گی اور یہ جنگ انسانی ترقی کی محض ایک منزل ثابت ہوگی بشرطیکہ اس سے وہ مصنوعی حدود دور ہو جاویں جو ایک طبقہ نوع انسان کو دوسرے سے جدا کئے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے ایک قطعہ زمین والوں کو اپنے قریب کے قطعہ زمین والوں سے مشرق کو مغرب سے ابیض کو احمر سے اور اصفر کو اسود سے دور کر رکھا ہے۔

سرسید اور اُن کے پُرجوش رفقاء۔

آپ اس کانفرنس کی تاریخ سے واقف ہیں کہ جب ابتدا میں اس کی بنیاد قایم ہوتی ہے تو اس کے بانی قوم کے محسن اعظم سرسید احمد خاں کا مقصد اصلی یہ تھا کہ قوم کے بیجا تعصب کا مقابلہ کیا جائے اور اس کو مغلوب کیا جاوے جو اس وقت کل مسلمانان ہند کے دلوں میں تعلیم جدید کی جانب سے

تھا اُنھوں نے اور اُن کے رفقائے پرجوش جماعت نے جن میں ایک سے زیادہ افراد ایسے تھے جن کو اعلیٰ ترین دماغی اور علمی قوتیں عطا ہوئی تھیں اس عظیم الشان کام کو نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے لہذا کانفرنس کی تاریخ کا یہ باب ختم ہے اور قوم کو اپنے آپ کو مبارک باد دینی چاہیئے کہ وہ ایسی کامل کامیابی کے ساتھ تمام ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے حضرات سوائے ایک قابل ذکر استثنا کے تمام وہ اصحاب جو اس کامیابی کے حقیقی موجب تھے۔ تقریباً سب کے سب ہمارے درمیان سے اٹھ گئے اس ایک استثنا سے میری مراد قوم کے قابلِ احترام جواں ہمت بزرگ مشتاق حسین نواب وقار الملک سے ہے خدا ان کو اپنے فضل سے صحت و عافیت کے ساتھ عرصہ دراز تک زندہ رکھے منجملہ ان لوگوں کے جن کی دائمی مفارقت کا آج ہم ماتم کر رہے ہیں۔ میں خاص طور پر شاعر وطن پرست شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا نام پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جن کی نظموں نے مسلمانان ہند کے دلوں میں اس درجہ اپنی حالت اور تلافی مافات کا صحیح احساس پیدا کر دیا ہے قوم کو سر خواجہ سلیم اللہ نواب بہادر ڈھاکہ کی وفات سے بھی شدید نقصان پہنچا ہے جن کا نام خصوصاً مشرقی بنگال میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رکھا جائے گا جہاں اُنھوں نے نہ صرف تعلیمی لحاظ سے بلکہ کئی دوسری حیثیتوں سے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ موت نے خواجہ غلام الثقلین کو بھی ہم سے چھین لیا۔ جن کی تعلیمی اصلاح تمدن کے انہماک اور بین ادبی قابلیتوں سے قوم نے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ میجر سید حسن صاحب بلگرامی بھی اب ہم میں نہیں ہیں جنھوں نے علی گڑھ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا اور جن سے قوم کو بہت مفید کام کی توقع تھی اور اب سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ ہم خدا سے دعا کریں کہ اُن کی ارواح کو عیش دائم اور قوم کو اُن کے قابل جانشین عطا فرمائے۔ قدرتی طور پر تعلیم کے متعلق جو نہایت دور رس مسائل ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں سے متعلق ہیں بلکہ دیگر اقوام ہند سے بھی ان کا تعلق ہے بلاشبہ کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو تنہا ہماری قوم سے وابستہ ہیں۔ اس کانفرنس کا یہ فرض ہے کہ وہ دونوں جماعتوں کے مسائل پر بحث کرے اور اس سے زیادہ کوئی مہلک غلطی نہ ہوگی کہ ہم اپنے آپ کو مطلق یا زیادہ تر انھیں مسائل کے اندر محدود رکھیں جو خاص طور پر مسلمانوں سے وابستہ ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ عام اور خاص ہر دو نوعیتوں کے اہم تر مسائل کی جانب توجہ مبذول کراؤں۔

گورنمنٹ اور تعلیم

حضرات! ایک زمانہ میں تعلیم کے متعلق قوم اور گورنمنٹ کے فرائض کی نسبت بہت کچھ بحث تھی۔ میری رائے میں یہ معاملہ محض خارج میں بحث کرنے کا نہیں ہے تعلیم اپنے تمام درجوں میں قوم کی ایک بنیادی ضرورت ہے وہ جس طرح اور جن ذرائع سے بھی ہوسکے پوری ہونی چاہئیں۔ بعض ممالک میں رعایا اس لائق ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم کا اہتمام خود کرسکتی ہے۔ اور بعض حیثیتوں سے شاید گورنمنٹ بہتر کرسکتی ہے لیکن دوسرے ممالک میں (مثلاً جیسے ہندوستان) جہاں گورنمنٹ وسیع تر ذرایع پر قابض ہوتی ہے اور بہ نسبت پرائیویٹ کوششوں کے قومی تر نظام بہم پہونچا سکتی ہے۔ رعایا کی ابتدائی تعلیم کا بار گورنمنٹ کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ میرا یہ منشا ایک لمحہ کے لئے نہیں ہے کہ رعایا یا کم از کم اُس کا وہ حصہ جو اس اہم اجتماعی فرض کو اپنے ذمہ لے سکتا ہے وہ اپنے آپ کو اس بار سے سبکدوش خیال کرے۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جس حد پر پہونچ کر رعایا اپنی مدد نہ کرسکے وہاں گورنمنٹ سے امید ہوتی ہے کہ وہ ضروریات لاحقہ کو پورا کرے گی۔ اولین فرض والدین کا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دلائیں لیکن جو والدین خود جاہل اور غریب ہیں اُن سے یہ توقع نہیں ہوسکتی ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دیں گے۔ گزشتہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں خواندوں کی فی صدی تعداد ۹ر۵ ہے اور خواندہ لوگوں میں بھی اس فرض کی ادائیگی کی بھی ان لوگوں سے توقع ہوسکتی ہے جنھوں نے خود اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کئے ہیں کام کی وسعت اور مشکلات کے اعتبار سے ایسے لوگوں کی تعداد بمنزلہ غیر محسوس کے ہے۔ ہندوستانی والدین کے مادی ذرائع کی نسبت مجھے یقین ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو ۵۰ فی صدی والدین کی حالت میں اُن کی کُل کائنات قوت ما لایموت کی حد سے متجاوز نہیں ہوتی۔ ملک کے ان حالات کے اندر غیر سرکاری انتظام کی مشکلات بالکل ظاہر ہیں یہی وجہ ہے کہ رعایا کے نہایت غیور افراد بھی اس بات پر مجبور ہوئے کہ تعلیم کے قومی انتظام کے لئے اُن کی نگاہ زیادہ تر گورنمنٹ پر پڑے اور مجھے یقین ہے کہ اس حالت کی ذمہ داری روز بروز گورنمنٹ پر بھی زیادہ روشن ہوتی جاتی ہے۔ تعلیم کے جس میدان کو دیکھئے غیر آباد اور اچھوتا حصہ اس سے بدرجہا زیادہ اچھا ہے جس کو ابھی ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا۔ اور میری دانست میں یہ بحث محض فضول ہوگی کہ تعلیم کی مختلف شاخوں میں سے زیادہ اہمیت کس کو دی جاوے اصلی مقصد پیش نظر یہ ہونا چاہئے کہ افراد قوم کے مختلف قوائے اور قابلیتوں کو پوری پوری نشو و نما دی جاوے اور یہ امر ہمیں بادنیٰ تامل معلوم ہوسکتا ہے کہ جب تک تعلیم کی مختلف شاخوں اور شکلوں پر پورا زور

نہ دیا جاوے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا یعنی عوام الناس (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) کی ابتدائی، ثانوی، صنعتی، حرفتی، تجارتی سائنٹفک اور ادبی تعلیم کی بعض شاخوں میں مثلاً اعلیٰ درجہ کی ادبی تعلیم میں اور فزیکل سائنس کے چند شعبوں میں خاص ابتدا ہو چکی ہے لیکن دوسرے شعبوں میں مثلاً تعلیم عامہ میں یا تعلیم نسواں میں جو کچھ ترقی حاصل ہوئی ہے وہ بالکل تشفی بخش نہیں ہے اس کے مقابلے میں حرفتی فنون' اور تجارتی تعلیم کا دروازہ قطعی مقفل ہے تعلیم کے شعبے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں مثلاً اگر پبلک ناتعلیم یافتہ ہو تو علم ادب کی کمال ترقی نہیں ہو سکتی کیوں کہ جب پڑھنے والے ہی لوگ زیادہ نہوں تو انشا پردازی کی مناسب ترقی کس طرح ہو۔ دیگر یہ ہے کہ جب تک قابل و ہونہار طالب علم ہر درجہ سے اور ہر فرقہ سے دستیاب نہ ہوں تو ملک بلکہ دنیا قومی دماغی خزائن سے مالا مال نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ہذا القیاس حرفتی فنونی اور تجارتی تعلیم کی کسی مناسب تجویز میں اعلیٰ درجہ کی رہ نمائی اہل سائنس سے پہنچتی ہے۔ نہ صرف سائنٹیفک تعلیم بلکہ جب تک کسی فنونی اور حرفتی تعلیم کا ملک کے تمام حصوں میں پورا رواج نہ ہونے پائے اس وقت تک اقتصادی بہبودی ہم کو حاصل نہیں ہو سکتی جو مکمل قومی تعلیم کے لئے جزو لاینفک ہے اسی طرح جب تک ہماری مستورات جو بچوں کی تربیت کرتی ہیں۔ خود تعلیم یافتہ نہوں گی تب تک ملک میں مکمل پیمانے پر تعلیم کی روشنی کا پھیلانا طول عمل ہے۔

تعلیم عامہ

شاید ہی دنیا کے کسی اور قطعہ میں لوگوں کی تعلیمی حالت اس قدر پستی میں ہو گی جس طرح ہندوستان میں ہے۔ ساڑھے پچپن کروڑ کی آبادی میں سے صرف ڈیڑھ کروڑ لوگ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں بس اس کی نظیر اور کہیں مل نہیں سکتی مجھے یقین ہے کہ خود گورنمنٹ کو ہماری طرح اس حالت سے اطمینان نہیں۔

ایسی حالت میں اطمینان و تشفی کیونکر ہو سکتی ہے جبکہ ان کی ناخواندگی کی وجہ سے ان کی ذلیل اور تباہ کن حالت ہے اس کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں لوگوں کی ناخواندگی اُن کی افسوس ناک جہالت اوہام پرستی جرائم اور حماقتوں کی کارگزاریوں سے پوری طرح نمایاں ہے جو محکمہ عدالت میں ہر روز دریافت کی جاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ امپیریل لیجسلیٹیو کونسل میں مسٹر گوکھلے آنجہانی نے ایک خاص بل جبری اور مفت تعلیم دینے کا پیش کیا تھا مگر افسوس ہے کہ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ رائے عامہ اس موقع پر اس قدر صاف اور قطعی طور پر معروف نہ تھی۔ اب اس امر میں لوگوں کی رائے میں بہت سرعت کے ساتھ یہاں تک ترقی

ہوئی ہے کہ آج کے روز جبری اور مفت تعلیم کی مانگ عالمگیر ہے۔ تجربہ کی رو سے یہ ناممکن ہے کہ ایک لخت اس کا رواج سارے ہندوستان میں پھیل جائے مگر اس کے اصول کو تسلیم کرنے اور بعض منتخب مقامات میں اس کی اجرا یا جاری کرنے میں کوئی مشکل حائل نہیں بڑے بڑے شہروں کے میونسپلیٹیوں کو ایک خاص تعلیمی ٹیکس اس تعلیم کے لئے وصول کرنے کا اختیار دیا جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر قسم کے لوگ اس کو خوشی کے ساتھ قبول کریں گے۔ اور اس کی اعانت دل سے کریں گے جس وقت اس تجویز کا بڑے بڑے شہروں میں تجربہ کیا جائے ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلیٹیوں کو کثرت سے ابتدائی مدرسے کھولنے کے لئے جو ہر ایک شہر اور قریہ کے تعلیمی ضرورت کے لئے مکتفی ہوں کافی اعانتی رقم دی جائیں ہیں اس ضمن میں گورنمنٹ اور اس کے لیجسلیٹو کونسل کی خاص توجہ کو سندھ بیبیسس بل کے مسودہ کو قانون بنا دینے کی ضرورت کی طرف مبذول کراتا ہوں کیونکہ یہ مسودہ ۱۹۰۸ء میں مسلمانان سندھ کی عام تعلیمی ترقی کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ مسلمانان سندھ کو ایسے قانون کی بہت سخت ضرورت ہے۔ صوبہ بمبئی کے مسلمانان تائیں کل متفق ہیں کہ یہ قانون بہت ضروری ہے اور عام مسلمانوں کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ اگر ہز اکسیلنسی لارڈ ولینگڈن اور ان کی کونسل لوگوں کی خواہش کو پوری کریں تو یہ نہایت مہربانی ہو گی۔

مجھ پر اس حقیقت کا بڑا اثر پڑا ہے کہ غریب لوگ اپنے بچوں کو ایک حد تک تعلیم دینے کے لئے اس قدر خواہشمند اور کوشاں ہیں جس قدر اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں۔ میرے خیال میں اکثر اوقات میں جبر کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی مگر ناخواندہ والدین کے دلوں میں اپنے فرائض کا پورا احساس پیدا کرنے کے لئے اس جبر کا اختیار رکھنا بہت ہی مفید ہوگا۔ اگر بالفعل کافی مدارس کھول دیئے جائیں تو ہم کو آئندہ غور کرنے کے لئے وقت ملیگا۔ کہ جبر کرنے کی قانون کی ضرورت ہے یا نہیں۔ حساب کے تختوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لڑکے عمر کے لحاظ سے مدارس میں داخل ہونے کے قابل ہیں اُن لڑکوں میں سے صرف ۱۷،۷ فی صدی مدرسوں کو جاتے ہیں۔ اسی طرح سے قریب ۱۷،۴ مسلمان طلبار مدرسوں میں پڑھتے ہیں۔ اس صیغہ میں مسلمانوں کی حالت دوسری اقوام کی حالت سے زیادہ پست نہیں۔ سب کی حالت یکساں قابل تاسف ہے۔

اس صیغہ تعلیم میں مسلمانوں کو خاص کر جو بڑی مشکل پیش آتی ہے وہ یہ مسئلہ ہے کہ کس زبان

میں تعلیم دی جائے۔ کل ہندوستان میں مسلمانوں کی عام خواہش ہے کہ ابتدائی تعلیم اُردو کے ذریعہ سے دی جاوے۔ کیوں کہ اُردو صرف قومی زبان ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی زبان ہے جس کے ذریعہ مذہبی اور اخلاقی احکام مسلمانوں کو سکھلائے جاتے ہیں جس کی تعلیم ہمارا مذہب دیتا ہے۔ قطع نظر اس کے اردو زبان عربی اور فارسی الفاظ سے مالا مال ہے اور ان تاریخی واقعات سے وابستہ ہے جو مسلمانوں کے لئے بہت ہی عزیز اور بیش بہا ہیں۔ مگر اس کا بھی ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ ملک کے کئی حصوں میں اُردو مسلمانوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ اور وہ اپنے روزانہ کاروبار دوسری زبان میں چلاتے ہیں۔ اس لئے ہم اس پر کوئی قطعی حکم نافذ نہیں کر سکتے۔ ہر ضلع اور قریہ کی مقامی جماعت کی خواہش پر اس معاملہ کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر جہاں کہیں اردو مدارس کی ضرورت ہوتی ہے وہ قائم کئے جائیں۔ اور دوسرے ابتدائی مدارس میں مسلمان بچوں کو اُردو میں اسلام کے روزمرہ کے احکام کی تعلیم دینے کو موقعہ دیا جانا چاہیئے۔ عام طرز تعلیم کے ساتھ کوئی نہ کوئی حرفتی یادگاری تعلیم بھی دینے کا عملی یا ضروری مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو کاشتکاروں کے اور کاریگروں کے بچے مدرسوں میں زیادہ مدت پڑھ کر نفع اُٹھا نہیں سکیں گے۔

ہم کو اس کا بھی انتظام کرنا چاہیئے کہ طلباء نے جو کچھ مدرسوں میں سیکھا ہے وہ یاد رکھیں۔ کیوں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مدارس چھوڑنے کے بعد جو کچھ اُنھوں نے پڑھا لکھا تھا وہ سب بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور ان کا شمار ناخواندوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک علاج یہ ہے کہ ان کی تعلیم جاری رہے کیوں کہ عام تعلیم کا اثر اسی وقت ہی عمیق ہو سکتا ہے جب تک کہ قریوں میں کتب خانے کھولے جائیں جہاں اخبارات پرچے اور آسان رسالہ جات وغیرہ میسّر ہوں۔ اس کے ساتھ اگر ہم واعظین اور ایسے لوگوں کو جو وقتاً فوقتاً عربی مدرسوں سے کامیاب ہو کر نکلتے ہیں مقرر کریں تو قوم کے عام افراد کی بہبودی ترقی پزیر ہو گی۔

اسلامی مشنری مساعی

نہایت افسوس کی بات ہے کہ کچھ عرصہ سے ہماری قوم کی واعظانہ مساعی تنزل پر ہیں۔ اس وقت میری مراد فقط اشاعت اسلام سے نہیں ہے گو کہ اس ملک میں اس کی بھی بڑی گنجائش اور ضرورت ہے بلکہ اس تعلیمی کارگزاری کی طرف میرا روئے سخن ہے جو سلف کے واعظین کیا کرتے تھے۔ اب کسی بڑے واعظ کا نام بہت کم سننے میں آتا ہے کہ وہ سفر اختیار کرے۔ پردیس میں جا کر اُن اسلامی اصول کی تعلیم و تلقین کرے۔

جن کی بدولت ایام سلف میں اسلام باعث ترقی تہذیب بنا تھا۔ ان واعظین کی عدم موجودگی کی وجہ سے جوش و عادات اسلامی کی کمی نمایاں ہے۔ اس بارہ میں آپ کو خوب غور و خوض کرنا چاہیئے کیوں کہ علماء کے ذریعہ سے اُس کی رسائی خلایق عامہ تک ہو سکتی ہے۔

سکنڈری تعلیم

جب ہم سکنڈری تعلیم پر غور کرتے ہیں تو مسلمانوں کی حالت بہت ہی پست نظر آتی ہے۔ اس پستی کو دور کرنے کے لئے ہم کو سرعت کے ساتھ اس کا علاج تلاش کرنا چاہیئے۔ کسی قوم کی ترقی کا اندازہ اس کی سکنڈری کی حالت سے لگتا ہے۔ ہر طرف سے یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ سکنڈری اور ہائی اسکولوں کی کمی ہے گورنمنٹ خود یہ مدارس نہیں چلاتی ہے۔ ان کا وجود میونسپلیٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈ میں نج کی کوششوں پر موقوف ہے۔ فی الحال ۲۲۸ مدارس میونسپل ہیں ۹۹۲ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہیں اور ۱۰۱۴ نج کے مدارس ہیں۔ وہ مدارس جو مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں خواہ وہ سرکاری ہوں یا مسلمانوں کے ان کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ حالاں کہ مسلمانوں کی ضروریات بہت ہی وسیع ہیں۔ سکنڈری اور اعلی مدارس کی تعداد بڑھانے کی کوشش ضرور ہونی چاہیئے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر اس بار کو صرف ہماری غریب قوم پر چھوڑ دیں تو یہ ضرورت پوری ہو سکے گی میونسپلیٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈ اور بالآخر گورنمنٹ کی تائید پر ہماری سکنڈری تعلیم کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں کے مقامی حالات کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے علیحدہ سکنڈری اسکولوں کی اشد ضرورت ہے۔ دوسرے مقامات کے لئے ہم کو اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ تنگی جا یا افلاس کسی مسلمان لڑکے کا مانع داخلہ سکنڈری مدارس نہ ہو۔ یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ بمبئی میں لوگوں کی عام خواہش ہے کہ کم از کم ہر دو ڈویزن کے لئے اینگلو اردو ہائی اسکول قایم کیا جائے اور پونا کا اردو کیمپ اسکول ہائی اسکول بنا دیا جائے۔ بعضے صوبجات میں بہت سارے سکنڈری مدارس میں فارسی اور اردو کے استاد موجود نہیں جس کی وجہ سے مسلمان بچے سکنڈری تعلیم سے محروم رہتے ہیں بعض مقامات میں اس امر کی ضرورت ہے کہ ایک مقررہ تعداد مسلمان لڑکوں کے واسطے مخصوص کر دی جائے مسلمان بچوں کے لئے سکنڈری مدارس میں مقررہ تعداد مخصوص کرنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ دوسری اقوام کے بچے اُن مدارس سے باز رکھے جائیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر فرقوں کے بچوں کو ان مدارس میں داخل ہونے کے لئے سہولت ہو اس غرض کے لئے سکنڈری

مدارس کافی ہونے چاہئیں۔ اس ضمن میں مختلف حصص کی تعلیمی گرانٹ ان ایڈ ون کے قواعد پر عمیق غور وخوض کی ضرورت ہے تاکہ گورنمنٹ گرانٹس میں وسعت ہو اور سرکاری امداد فیاضی کے ساتھ دی جائے اور غیر سرکاری مساعی سے جو سکنڈری تعلیم دی جاتی ہے اس کو کافی سرکاری مدد ملے۔ ہماری قوم کی حالت سکنڈری تعلیم میں اس قدر پست ہے کہ بغیر خاص تدابیر کے اس کا تدارک نہیں ہوسکتا خود گورنمنٹ اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ مسلمانوں میں سکنڈری تعلیم کی ترقی نہایت ضروری ہے یہ امر ہمیشہ ہماری مدِنظر رہتا ہے کہ اس غرض کے لئے خاص انسپکٹروں کی ضرورت ہے۔ بنگال میں اس امر میں کسی قدر کارروائی ہے۔ اور صوبجات متحدہ میں بھی اسی طرح کی تجاویز ہو رہی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ کافی مسلمان تعلیمی انسپکٹر مقرر کئے جاویں اور سررشتہ تعلیم کے ناظم کا ایک خاص مسلمان مددگار ہو جو مسلمانوں کی تعلیمی ابواب کی تحقیقات و تلاش کرے اور اس کو ڈائرکٹر کے روبرو پیش کرے۔ بعض لوگ اس تجویز کی نسبت کیا فرمائیں گے کہ ہم گورنمنٹ سے ترجیحانہ برتاؤ چاہتے ہیں۔ مگر ہماری غرض یہ نہیں ہے۔ کسی ایک قوم کے ایک حصہ کی تعلیم کا خیال رکھنا اگر مہربانی ہی سمجھی جائے تو دوسری اقوام کے لئے بھی نعمت سے کم نہیں۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر تنگ دلی اور حماقت کوئی نہ ہوگی کہ پس افتادہ قوموں کی ترقی کی تدابیر پر ناراضگی ظاہر کی جائے۔

سکنڈری تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارے عربی مدرسوں میں انگریزی کی تعلیم کے اجراء کا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ جب انگریزی زبان ہند میں ملک گیر ہوگئی ہے اور روزمرہ کے معاملات انگریزی زبان میں طے پاتے ہیں تو خود عربی متعلمین کو کسی قدر انگریزی زبان کا سیکھنا یقیناً مفید ہوگا۔ کیوں کہ ان کو بھی تو آخر اپنی معیشت کا دھندا لگا ہوا ہے۔ جن طلباء نے زبان عربی میں اعلیٰ درجہ تک عبور کیا ہے۔ انگریزی میں ایک حد تک مہارت پیدا کرنا مشکل کام نہیں۔ کیونکہ عربی کا مقابلہ کرتے ہوئے انگریزی کوئی مشکل زبان نہیں۔

دیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم

یہاں پر یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ آیا اعلیٰ درجہ کی تعلیم صرف انگریزی زبان کے ہی ذریعہ سے ہو یا دیسی زبانوں کے ذریعہ سے دی جائے۔ حال میں سر رابندرا ناتھ ٹاگور نے جن کی شاعری پر ہندوستان کی ساری قوموں کو ناز ہے یہ رائے دی کہ کلکتہ یونیورسٹی دیسی زبان میں بعض تعلیمی مضامین پر لیکچرار مقرر کرے۔ ایسے مستند ماہر کی یہ رائے قابلِ غور ہے اور انجمن ترقی اردو کو اس پر غور کرنا چاہئے جب تک کہ ہماری خاص زبان اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینے کے قابل تسلیم نہ کی جائے تو ملک میں

اعلیٰ قوم کی ترقی ہمیشہ سُست رہے گی۔ اُردو جو مسلمانوں کی مادری زبان ہے بڑی ترقی کر رہی ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اس میں بغیر سوچے سمجھے ٹھونسے جارہے ہیں۔ اس موقعہ پر میں رائے دیتا ہوں کہ زبان اردو میں کثرت سے عربی الفاظ کا یا تعریب کا استعمال کیا جائے۔ کیوں کہ اس سے بہتر کوئی طریقہ ہماری زبانوں کو مالا مال کرنے کا نہیں ہے۔

مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی حالت

چوں کہ مسلمان طلبا کا خاتمہ سکنڈری تعلیم کے درجہ میں ہی ہو جاتا ہے ان کی اعلیٰ تعلیم کی حالت نہایت قابل تاسف ہوتی ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ مسلمان گریجوئٹس کی تعداد میں آخر ۹ سال کے اندر ۸۰ فی صدی ترقی ہوئی ہے۔ با ایں ہمہ ہمارے گریجویٹوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ اس سے قوم کی ترقی پر نمایاں اثر نہیں ہوتا ہے مسلمانوں میں گریجویٹس کی وجہ سے جو ضرر تمام طرز تعلیم اور ملک کی اقتصادی ترقی پر پڑتا ہے اس کا اندازہ چند واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ہر کہیں تعلیم یافتہ مسلمان کی ہندوستان میں مانگ اور پکار ہے۔ میڈیکل کالجوں کا شمار انگلیوں پر ہی ہو سکتا ہے۔ انجنیرنگ کالجوں میں اور مدرسہ جنگلات دیرہ دون اور پوسا، سابنھر، لائل پور اور ناگپور، کوئمبوتر، پونا وغیرہ کی زراعتی کالج۔ ارضیات اور ویٹاری کی تعلیم میں کوئی مسلمان لڑکا نظر نہیں آتا۔ ان مدارس میں داخلہ کے لئے یونیورسٹی تعلیم خاص کر ہندوستانیوں کے لئے ضروری ہے۔ میں اولاً بہ سبب مسلمان گریجوئٹس کی تعداد کم ہونے کے اور ثانیاً سائنٹفک اور فنون کی تعلیم کے مصارف کا بوجھ اُٹھا نہ سکنے کے باعث اُن کی تعداد سرکاری خدمات میں اور کار آمد و منفعتی پیشیوں میں بہت قلیل ہے۔ مگر سب سے زیادہ قابل تاسف امر ماہر اور ٹرینڈ معلموں کا نہ ہونا ہے جن کے بغیر سکنڈری یا ابتدائی تعلیم حسب دلخواہ سرعت کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ تجویز کہ مسلمانوں کے لئے ایسے ٹرینینگ اسکول قایم کئے جائیں جن کی ابتدا میں معقول وظائف سے امداد کی جائے ایسی ہے جس پر آپ کو بخوبی توجہ کرنی چاہیئے۔

یونیورسٹی کی تعلیم

اس ملک میں کسی تعلیمی مسئلہ پر اتنا مباحثہ نہیں ہوا جتنا کہ یونیورسٹی کے مسئلہ پر۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں بہت کچھ اختلاف آرائی کی گنجائش ہے۔ مگر میں چند امور فرض کئے لیتا ہوں وہ یہ کہ گورنمنٹ کی مسلمہ پالیسی ہے کہ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم کو ترقی دی جائے دربار کے موقع پر خود حضور ملک معظم کی زبان فیض ترجمان سے اس کا صاف صاف اعلان ہوا تھا اور اگر میں ہز اکسیلنسی وائسرائے کی ان تقریروں کا انتخاب کروں جنھوں نے اُنھوں نے کل ہندوستان کے اندر اس درجہ

ہر دل عزیز بنایا ہے تو میں اُن کی اُن تقریروں کو لوں گا جن میں انھوں نے صیغۂ تعلیم کو ترقی دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ علیٰ ہذا ہم سب واقف ہیں کہ حضور ملک معظم پارلیمنٹ والیسرائے اور گورنران کا کام آزادانہ اصلاحی تجاویز کا قایم کرنا ہی۔ اور یہ بالکل ایک مختلف سوال ہی کہ حقیقی عمال کی جانب سے ان کا نفاذ کب اور کس طریقہ سے ہوتا ہی ہندوستان کے اندر کچھ تو ذاتی رجحانات کی وجہ سے جس کے لئے بے حد گنجائش معلوم ہوتی ہی اور کچھ عمال سرکاری کی جلد جلد تبدیلیوں کے سبب سے رفاہ عام کی بہت سی تدابیر جن پر توجہ۔ غور۔ محنت اور میں کہوں گا کہ زر کثیر صرف ہو چکا ہوتا ہے اکثر ان کے نفاذ میں اس قدر تاخیر ہو جاتی ہے کہ اُن کا اثر بہت کچھ زائل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات وہ طاق نسیاں کے حوالہ کر دی جاتی ہیں۔ قانون پیشہ لوگوں میں مثل ہی کہ جیتنے والے مقدمہ باز کی اصلی مشکل شروع اس وقت ہوتی ہی جب کہ وہ ڈگری حاصل کر کے اُسے جاری کرانا چاہتا ہی۔ اس طرح ہندوستانی پبلک کی مشکلات اس وقت شروع ہوتی ہیں جب کوئی اصلاحی تجویز نفاذ کے درجہ پر پہونچتی ہی۔

زائد یونیورسٹیوں اور کالجوں کی مانگ اور ضرورت

ڈھاکہ بانکی پور اور ناگپور کی یونیورسٹیوں کے ساتھ معاون یونیورسٹیاں قایم کرنے کے متعلق بار بار تجاویز شائع ہو چکی ہیں ان کے متعلق کیا وقوع میں آیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے بار بار اعلان فرمایا ہے کہ ہندوستان کے واسطے بہت زیادہ تعداد میں یونیورسٹیوں کی ضرورت ہی اور اگر میں بھی باادب یہی گزارش کروں تو یہی ہوگا کہ اس سے زیادہ ایمان داری کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔ ہم کو محض زیادہ یونیورسٹیوں ہی کی ضرورت نہیں ہی بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کثیر التعداد کالج اور اسکول قایم کئے جاویں۔ بغیر اس کے معاون یونیورسٹیاں جن میں کہ تعلیم اور رہائش دونوں کا انتظام ہو۔ ان کے خیر مقدم کے واسطے نہایت خوشی سے تیار ہی بمقابل موجودہ یونیورسٹیوں کے ہم کو ہر نوع اپنے آپ کو ایسے لوگوں کو بہکانے والی تنقیحات سے جو کہ ہندوستانی رسم و رواج کو مورد الزام بنانے سے کبھی نہیں چوکے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی حفاظت کی کوشش کرنا چاہئے۔ ہماری موجودہ یونیورسٹیوں نے نہایت اہم کام کیا ہے اور کامل یقین ہی کہ یہ یونیورسٹیاں عرصۂ دراز تک قایم رہکر ملک میں تعلیم اور روشن خیالی کی ترقی دیتی رہیں گی۔

علاوہ امتحانات کے اب یہ یونیورسٹیاں دیگر فرائض بھی انجام دے رہی ہیں اور دوسرے طریقے بھی اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ مثلاً تعلیم جو ہمہ جہت مفید ہے اور ہم پورے طور پر اُن کی

جانب مائل ہوگئے ہیں اور ہم میں وہ میلان پایا جاتا ہے جو بظاہر ایک انسان کی طبیعت میں جاگزیں ہے اور وہ چیزیں جو باعتبار اپنی نوع اور خاصیت کے یکساں ہیں اُن کے مقابلہ کی قابلیت پیدا ہوگئی ہے۔ اور دانستہ اور نادانستہ طور پر ہم اپنے اغراض و میلان کو اُس شئے پر معطوف کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک اکمل ہو شاید یہ ایک اظہار ہے ہماری خواہش ترقی کا لیکن اکثر اس میلان میں ایک پہلو ایسا پایا جاتا ہے جو ہم کو ان تدابیر سے مانوس کر دیتا ہے جو فی نفسہ کامل نہوں مگر مفید مطلب ضرور ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ معمولی سامان سے جو ان کے قبضہ میں ہو پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس بات کو نہیں سمجھتے کہ وہ کیا شئے ہے جو اُن کے نصب العین کے قریب تر ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک یہ فعل حکمت عملی کا اقتضا ہے اور اول الذکر محض جذبات کا نتیجہ۔ میں یہ فرض کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں کلکتہ و بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیوں سے کہیں بہتر ہیں۔ لیکن صحیح تعلیم دینے والی اور ایسی جن میں کریورڈنگ بھی ہوں۔ گورنمنٹ نے ابھی تک تیار نہیں کیں اور اعلیٰ تعلیم کا تمام تر بار اُنھیں پہلے کندھوں پر ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کی ضرورت بے انتہا بڑھ گئی ہے لیکن اُس کے پہلو بہ پہلو تعلیمی مصلحتوں کی ایک پرجوش جماعت بھی وجود میں آگئی ہے جو اس ضرورت کو نظر انداز کر کے یہ چاہتے ہیں کہ اعلیٰ کے بجائے صحیح قابلیت پیدا کی جاوے۔ میں ایک حد تک تو قابلیت کے پیدا کرنے کا قائل ہوں لیکن اس کی غیر ضروری خصوصیت کو میں تسلیم نہیں کرتا ہوں یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ انسانی درس گاہوں کو "قابلیت" کے پرزوں کے ساتھ ساتھ چلا سکتے ہیں اور پھر آپ کو انسان کے بعض مہتم بالشان جذبات اور اعلیٰ اولوالعزمیوں کو کچلنے جانے کا اندیشہ نہو میں بے اعتدالی کا قائل نہیں ہوں اور قابلیت کو مستثنیٰ بنانے کا حامی نہیں ہوں قابلیت ایک دیوی سمجھ لی گئی ہے جس کی ہر کس و ناکس پرستش کرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہم اُن قوانین کے اثر کو پورے طور سے محسوس کریں جو مخصوص طور پر مسلمانوں پر پڑ رہا ہے۔ نیز ایک طرف اُن قوانین کو جو روز مرہ وضع کئے جاتے ہیں اور طلبہ کے داخلہ کو موجودہ کالجوں میں محدود کرتے ہیں اور دوسری طرف اُن درس گاہوں پر زیادہ سخت قیود عاید کرتے ہیں جو یونیورسٹیوں سے الحاق کے متمنی ہیں۔

حال ہی میں مسٹر سندر لال وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی نے کھلے الفاظ میں شکوہ کیا کہ متعلمین ہر روز عدم گنجائش کی وجہ سے واپس کئے جاتے ہیں۔ یہ امر کچھ صوبجات متحدہ کے لئے

خاص نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں یہی بات ہے۔

میرے خیال میں نہیں آتا کہ کیا امر گوارا کیا گیا ہے وہ لوگ جو اوپر بیان کی ہوئی تدابیر پر زور ڈالتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک زیادہ کالج کھولے نہ جائیں جو یونیورسٹی میں داخل ہونے والوں کی ضروریات کو کافی ہوں وہ تدابیر کام میں لائی نہیں جاسکتیں۔ وہ ضرب المثل کہ آدھا سارے سے ہے۔ راست ہو یا نہ ہو یونیورسٹی تعلیم پر تو صادق نہیں آتا۔

موجودہ حالت مسلمانوں کے لئے سخت تر مشکل ہے کیوں کہ اُن کی اعلیٰ تعلیم زیادہ تر قابل نگرانی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں صرف علی گڑھ کالج اور اسلامیہ کالج لاہور و پشاور مسلمانوں کے لئے موجود ہیں۔ اس مقام پر میں آپ کی طرف سے شکریہ ساری قوم کا حاجی محمد یوسف صاحب کی خدمت میں ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے آٹھ لاکھ کا فیاضانہ عطیہ مسلمانان بمبئی کی تعلیم کے لئے عطا فرمایا جو اقامتی کالج کھولنے کے لئے بخوبی کام آسکتا ہے۔ ہندوستان کے سب صوبوں میں صرف بمبئی ایک مقام ہے جہاں علی گڑھ کے طرز پر ایک کالج کھولا جاسکتا ہے اور یہ امر وہاں کی فیاض طبیعت تاجروں پر موقوف ہے۔ اگرچہ مسلمان متعلمین کی تعداد جو یونیورسٹی کو جاتے ہیں بہت کم ہے باایں ہمہ اُن کو بھی داخلہ میں دقت پڑتی ہے۔ خاص کر گورنمنٹ کالجوں میں کالج اور اسکولس کھولنے کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ مقابلہ کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ یہ بات اب گورنمنٹ کو معلوم کرانا چاہیئے اور در صورت ضرورت اُن سے زیادہ کالج کھولنے کے لئے بھی درخواست کی جاوے تاکہ وہ لڑکے جو قابل اور شایق یونیورسٹی تعلیم کے ہیں موقع کو نہ کھو دیں۔ میں اس مقام پر گورنمنٹ آف انڈیا سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ ہر سال ایک قریب الفہم نقشہ چھاپ کر شائع کرے جس سے معلوم ہو کہ کس قدر مسلمان لڑکے موجودہ تعلیم گاہوں میں عدم گنجائش کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

اس واقعہ کے انکار سے کوئی فائدہ نہیں کہ اس ملک میں بہت سے یوروپین اور بعض ان میں سے صیغہ تعلیم اور یونیورسٹیوں سے گہرا تعلق رکھنے والے ایسے موجود ہیں جو گریجویٹس کی تعداد کو محدود کرنا چاہتے ہیں۔

وہ چاہتے ہیں کہ اسی قدر گریجویٹس کامیاب ہوکر نکلیں جو سرکاری خدمات میں یا دوسرے پیشوں میں کھپ سکیں ورنہ اُن کو خوف ہے اگر کوئی راہ ان کے واسطے نہ نکالی جائے تو ملک میں ناراضی پھیل جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لئے اس ملک میں

بہت کم ذرائع ہیں اور یہی سبب ملک میں بے چینی کا ہے۔ مگر اس کا علاج اعلیٰ تعلیم کو روک دینا
یا لائق لوگوں کی تعداد گھٹا دینا نہیں اور گورنمنٹ اس خیال کو پسند نہیں کرے گی۔ مگر مجھ کو
اس کا ذکر یہاں کرنے کی یہ وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسی نیت سے ہماری
طرز تعلیم اور تعلیم یافتہ لوگوں پر اعتراضات کی بوچھار ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کو بھی اس
ملک کے باشندوں کے ذرائع وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

مگر اس مسئلہ پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں میں ہرگز ایسا کچھ نہ کہوں گا جو اس قومی عظمت کے
مسئلہ میں خلل انداز ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ مسلمان اور ہندوؤں
میں صرف دنیوی منفعت حاصل کرنے کے لئے علم کا شوق نہیں ہے بلکہ بہ نسبت یورپین کے ہندوستانیوں
میں روحانی اخلاقی اور تمدنی پہلو اعلیٰ تعلیم کا زیادہ تر مدنظر رہتا ہے۔ مجھے اس قسمت کے پھیر پر تعجب ہوتا
ہے کہ وقتاً فوقتاً یورپین سامنے ہو کر ہم کو اس اعلیٰ مقصد کا سبق دیں کہ علم کو صرف علم کی خاطر سے پڑھنا
چاہیئے۔

ہم اُس روز کے انتظار میں ہیں جب کہ اعلیٰ تعلیم کی تیز رفتاری سے ہندوستان کی ہر قوم علم سے
بہرہ یاب ہو اور وہ پیشے اور معیشت کے راستے جو اب اُن کی قدرت کے باہر ہیں اُن کو حاصل ہوں
جب تک ہم اس درجہ کو نہ پہنچیں کہ ہماری ہر قوم سے ایک ایسی جماعت لائق نوجوانوں کی نکلے جس سے
حکمت۔ علم ادب اور فنون کو ترقی ہو تب تک یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ہندوستان کو اس کی وسعت اور گزشتہ
کارناموں کے موافق قابو علم پھیلانے کا دیا گیا۔ اس کام کے لئے اب اعلیٰ تعلیم کا جال چو طرف پھیلانا چاہیئے۔
ایک معاملہ جس کی نسبت لوگوں کو بڑی شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اسکول

اضافہ شدہ معیار

کالج اور یونیورسٹی امتحانات کا پیمانہ برابر بڑھ رہا ہے اس سے یہ مطلب ہے
کہ امتحانات سخت کرنے سے وہی لوگ کامیاب نکلیں گے جن میں قابلیت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ہے
یہ ایک مشہور بات ہے کہ بعض لوگوں میں قابلیت دیر سے آتی ہے اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لائق لوگ
جن میں قابلیت کا جوہر ہنوز نمایاں نہیں تھا ابتدائی درس گاہوں سے روکے جاتے تو علمی دنیا بہت
غریب ہو جاتی۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ ہندوستانی لڑکوں سے ان کی جسمانی اور دماغی طاقت سے
بڑھ کر کام لیا جاتا ہے۔ یہ صحیح واقعہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی لڑکے اس عمر کو پہونچے ہیں جو عمر یا دماغی
قوتوں اور تجربہ کے قابل پختگی کے ہوتی ہے تو وہ اکثر کسی مہلک مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کسی مشقت
کے کام کے لائق نہیں رہتے۔ ایک بڑا حصہ ان کا بے وقت مر جاتا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں آپ کو

یاد ہیں مگر میں آپ کو ایک حال کا واقعہ یاد دلاتا ہوں یعنی گوپال کرشنا گوکھلے کا جس کی معظم یاد اور مقدس خاک پونا کے خوشنما شہر کو تازہ شہرت بخشتی۔ اگر گوکھلے خیریت کے ساتھ اور دس سال زندہ رہتے تو ہندوستان کے لئے کیا کچھ بہتری نہ ہوتی۔ دو سال قبل مجھے یاد ہے جب وہ ایک مہلک بیماری کے پنجے میں تھے ان کو کس قدر رنج انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی جسمانی تباہی کا تھا۔ اگر بغور تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے لئے یہ ایک قومی خطرہ ہے۔ یہ تو اس وقت کی حالت ہے جب کہ لڑکوں سے اسی قدر کام نہیں لیا جاتا تھا جیسا کہ اب جب کہ ہمیں پریشانی ہوتی ہے کہ خدا جانے کہ جدید طرز تعلیم کا اثر ہماری آنے والی نسلوں پر کیا ہوگا جن کی صحت کے ہم جواب دہ ہیں۔ کم عمر بچوں سے زیادہ کام لینا اچھا نہیں سالہا سال ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ اندر ہی اندر ان کی صحت پر کیا صدمہ ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج کل ورزش کا خیال زیادہ رکھا جاتا ہے۔ اس سے لوگ خوش ہیں خدا کرے کہ نیا انتظام موجودہ حالت کو کم کرے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حد سے زاید جسمانی ورزش دماغی محنت کا علاج ہو نہیں سکتا بلکہ دونوں کے ملنے سے اور بھی نقصان کا اندیشہ ہے۔ یوروپین معلّمین جو عمدگی آب و ہوا میں پائے گئے اور اپنی خاص مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم پائی اس امر کا احساس نہیں کر سکتے کہ ہندوستانی لڑکوں پر جو کم راحت بخش آب و ہوا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ کس قدر دماغی بوجھ پڑتا ہے۔ اکثر ہندوستانی لڑکوں کو نہ غذا برابر ملتی ہے نہ لباس اور نہ رہنے کے لئے مکان اچھا اور ان کو ایک اجنبی زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ جس کا اُن میں رواج ہے اس پر بھی ایک ہندوستانی گریجوئٹ تعلیم میں ایک اوسط درجہ کے انگریزی گریجویٹ سے کم ہے۔ انگریزی یونیورسٹی کے گریجویٹ کے پاس مفید عام علم کا ذخیرہ ہے مگر یہ اُس کی ذاتی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ صحبت کا اثر ہے۔

فیسوں کا اضافہ

جو لوگ اعلیٰ درجہ کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اب اُن کی نظر لڑکوں سے جو اسکول میں فیس لے جا رہی ہے اس پر پڑ رہی ہے۔ برطانیہ اعظم باوصف تمام ممالک عالم سے مالدار ہونے کے وہاں کی فیس اکثر یہاں سے کم ہے۔ ہندوستان کی غربت مسلّم ہے اور یہاں فیس زاید لگانا یا غریب لڑکوں کی بڑی جماعت کو تعلیم سے روک دینا ہے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم خوشحال لوگوں کے لئے ہے یہ بات ہمارے قیاس کے خلاف ہے۔

مشرقی ممالک میں کبھی ایسا نہیں سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم مالداروں کا ہی حصہ ہے بلکہ دولت علم

اور قابلیت کے ساتھ اکثر جمع نہیں مشرقی اور مغربی تاریخ تعلیم میں یہ فرق ہے کہ یہاں علم ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں حال تک علمی جماعت کو زیادہ وقر حاصل نہیں تھا۔ لائق لوگ نوکروں کے درجے میں شمار کئے جاتے تھے۔ ہمارے مذہب شرع کی رو سے علماء کو انتظام مملکت میں بڑا دخل ہے۔ ہم میں جن لوگوں نے علم کی میراث پائی ہے وہ اکثر مالدار نہیں ہیں بلکہ وہ وسطی درجہ کے لوگ ہیں جن کا نام شرفا ہے جب تک کہ ان لوگوں کی اولاد کو یونیورسٹی تعلیم کے لئے آمادہ نہ کیا جاوے قوم کی ترقی کی امید بہت کم ہے درمیانی طبقہ ہے جو انگریزی تسلط کے قبل سول روینیو اور فوجی خدمات پر مامور تھا اور انھیں میں مورخین شعرا مدبرین سلطنت فیلسوف ماہرین فن عمارت وغیرہ نکلے۔ یہ خاندان اب بہت ہو گئے ہیں۔ ہم کو کوشش کرنا چاہئے کہ غربت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم میں اُن کے لڑکوں کی تعداد کم نہ ہو جاوے مسلمانوں میں اس امر کی بھی شکایت ہے کہ سینٹ میں سنڈیکیٹ میں اور فی کلٹیز (یعنی یونیورسٹی مجموعوں میں) ان کے نائب بہت کم رہتے ہیں۔ اس بات پر خاص توجہ ضرور ہے جو لوگ کہ اعلیٰ تعلیم منفعتی نظر سے دیکھتے ہیں میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ اگر اسی بات پر عمل ہوتا تو آج انسانی تہذیب کا کیا حشر ہوتا۔ آج کل برطانیہ اعظم میں تعلیمی وظیفوں کا عمل اس قدر وسیع پیمانہ پر جاری ہے کہ بہت سے اوسط سے بڑھ کر قابلیت رکھنے والے لڑکوں کو باوصف غریب ہونے کے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پانے کی گنجائش ملتی ہے۔

ہندوستان میں اور مشرقی ممالک میں قدیم طرز تعلیم کا یہ طریقہ تھا کہ غریب لڑکوں کی تعلیم کے واسطے بڑا فایدہ اور وسعت دی جاتی تھی۔ جدید طریقہ میں یہ انداز بالکل مفقود ہو گیا۔ اگر اسی قسم کی وسعت جو غریب لڑکوں کے لئے آ گئی تھی اب بھی نہ دی جاوے تو مجھے بہت اندیشہ ہے کہ ہندوستان علم کی ناموری کو جو برائے تاریخ اس کا حصہ ہے کھو بیٹھے گا۔

وظائف

علی الخصوص ہم مسلمانوں کے لئے وظیفوں کا وسیع طریقہ بہت ضروری ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ نہیں کہ ہم کو ایک فیاضانہ طریقہ وظائف کی ضرورت ہے جو سب مدارج یعنی ابتدائی ثانوی اور یونیورسٹی میں کام آوے ہم کو ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ ابتدائی درجہ سے ماتحتی اسکولوں سے یونیورسٹیوں کو غریب مگر ہونہار لڑکے منتخب کر کے بھیج سکیں لایق لڑکوں کو متفرق پیشے اور فنون سیکھنے کے لئے بھی وظایف کی ضرورت ہے۔ اور ان دونوں تعلیم کے مصارف زیادہ ہیں اور جب تک ہم ایک باقاعدہ وظائف کا انتظام نہ کریں بہت کم امید ہے

کہ مستقبل میں طب - انجنیری - زراعت کان کنی - جنگلات - ارضیات - اور بیطاری وغیرہ سے جیسے علوم و فنون کی ہمارے اندر ترقی ہو سکے اور اس سے مسلمانان ہند کا جو مالی نقصان متصور ہے - اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے - گورنمنٹ سے یہ درخواست کرنا قرین صواب ہے - کہ وہ فی الحال سب سے زیادہ اس مقصد کی جانب توجہ فرمائے - خود ہمیں حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے کہ اپنی خیرات و مبرات کو ایسے طرز پر جاری کریں کہ ہماری قوم کے دولتمند افراد کی فیاضی سے وظائف کی مد کو خاطر خواہ امداد حاصل ہو -

سرکاری خرچ ہم پر شکریہ کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا فرض ہے کہ ہز اکسیلنسی لارڈ ہارڈنگ کے عہد میں تعلیم کے لئے فیاضانہ پیمانہ پر یکمشت اور دوامی عطیات ملے ہیں جس سے غرض یہ ہی کہ اس ملک کے اندر تعلیم کو اور زیادہ ترقی ہو - لیکن حال میں یہ افواہ اڑی ہے کہ جنگ کی وجہ سے تعلیم کا خرچ کم کیا جائے گا - اس افواہ سے پبلک کے دلوں میں گونہ اضطراب پیدا ہو گیا ہے - میری رائے میں گورنمنٹ کو اس باب میں پبلک کو اطمینان دلانا چاہئے - پبلک کو اس امر کا یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ گو کسی اور مد میں تخفیف کر دی جائے یا ضروریات کو کسی دوسرے ذرایع سے پورا کیا جائے - مگر تعلیم کے پروگرام میں کسی قسم کا ہرج واقع نہ ہونے دیا جائے گا -

ممالک غیر میں تعلیم ایک اور نہایت اہم سوال ہے جو آپ کی خاص توجہ کا محتاج ہے اور وہ ان مواقع کی نسبت ہے جو یورپ اور امریکہ میں صنعتی و حرفتی یا عام تعلیم کے متعلق ہمارے نوجوانوں کو حاصل رہتے ہیں - سب کو معلوم ہے کہ ہندوستانی طلبا کو جو مشکلات وہاں پیش آتی ہیں اُن کی سخت شکایت ہے جن دقتوں کا پہلے علم بھی نہ تھا وہ اُٹھانی پڑتی ہیں - اور آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیوں میں اور طبی تعلیم کی تکمیل کے لئے بہت سے ہسپتالوں میں ہندوستانی طلبہ کو بار نہیں ملتا - میں یہ نہیں کہتا کہ اس دشواری کا حل آسان ہے لیکن کئی پہلوؤں سے اس کا حل اشد ضروری ہے - ہندوستانی طلبہ پر یورپ کی تعلیم کا جو مفید اثر پڑتا ہے اس پر میرا بے حد اعتقاد ہے - جب تک خود مغربی ماحول کے اندر تکمیل تعلیم کا موقع نہ دیا جائے اس وقت تک اکثر صورتوں میں مغربی تعلیم کوئی فائدہ نہیں دے سکتی - علاوہ بریں یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ پیشوں اور اقتصادی علوم کی تعلیم کے لئے جو آسانیاں مغربی ممالک میں میسر ہیں وہ ہندوستان میں نہیں اور ہندوستانیوں کو یہ امید رکھنے کا حق ہے کہ جب تک خود ہندوستان میں اس قسم کی تعلیم کا خاطر خواہ اہتمام نہ ہو جائے

ہمارے نوجوانوں کی یورپ میں تکمیل تعلیم کی آسانیوں کو سلب نہ کیا جائے۔

تعلیم نسواں

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں تعلیم نسواں کا مسئلہ نہایت درجہ دشواریوں سے پُر ہے گو مختلف مقامات میں ان دشواریوں کی نوعیت مختلف ہے۔ تاہم بعض امور مشترک بھی ہیں مثلاً ماہر استانیوں کا ہر جگہ فقدان ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اول استانیوں کے پیدا کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہو تو عورتوں کی تعلیم کی رفتار نہایت سست رہے گی۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان استانیاں کافی تعداد میں بہم پہونچ سکیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ معلمی پیشہ اختیار کرنے کے لئے بہت کم لوگ آمادہ ہوتے ہیں۔ میری قطعی رائے ہے کہ ہمیں اس طبقہ کی جانب توجہ کرنی چاہئے جس سے استانیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کو ٹریننگ حاصل کرنے کی ترغیب دینی چاہئے مگر ان کو تعلیم دینے کے لئے جلد آپ کو استانیوں اور شاگردوں دونوں کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا ان میں سے ایک کے لئے یعنی استانی گری کے لئے ہمیں شروع میں غیر مسلم خواتین (مثلاً برہمو یا عیسائیوں) کو رکھنا پڑے گا۔ اگرچہ کام سست ضرور ہوگا مگر عمدہ کوشش اور استقلال کی شدید ضرورت ہے۔ اس جانب عملیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال قدم بڑھا چکی ہیں۔ مسٹر سید کرامت حسین صاحب نے لکھنؤ میں ایک پردہ کا اسکول قائم کر رکھا ہے۔ ایک اس قسم کا مدرسہ علی گڑھ میں جاری ہے۔ دو حوصلہ مند خواتین نے ایک مدرسہ کلکتہ میں جاری کر رکھا ہے جو بخوبی چل رہا ہے۔ اس بارہ میں پنجاب میری رائے میں سب سے آگے ہے اور مجھے امید ہے کہ بمبئی بھی پیچھے نہیں رہیگا یہاں پردہ کا جس قسم کا رواج ہے اس سے کم سن لڑکیوں کی تعلیم میں بہت مدد ملیگی۔ مجھے افسوس ہے کہ مدراس اس معاملہ میں بہت پھسڈی ہے۔ اگرچہ وہاں "ہوبرٹ ٹریننگ اسکول" نامی ایک تعلیم گاہ موجود ہے اب تک تمام تر وسائل قوم کی غریب بچیوں کو ابتدائی تعلیم دینے پر صرف کئے گئے ہیں۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں بہت دشواری نہیں ہو سکتی ہے کہ تعلیم نسواں کی جانب گورنمنٹ کو بھی توجہ ہے۔ سر دست ہمیں گورنمنٹ کی خدمت میں اس قدر درخواست کرنے پر اکتفا کرنا چاہئے کہ وہ موجودہ زنانہ مدارس کی فیاضانہ امداد فرمائے اور صوبہ میں کم از کم ایک ایک پردہ اسکول سکنڈری تعلیم کے لئے قائم کرے۔ ممکن ہے کہ کلاسوں کے پُر ہونے میں کچھ وقت صرف ہو جائے گا۔ لیکن یہ تجربہ اس قابل ہے کہ اگر ابتدا میں اس پر تھوڑا صرف بیجا بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ اور ہر پریسیڈنسی میں استانیوں کی ٹریننگ کے لئے مدارس ہونے چاہئیں۔

مسلم یونیورسٹی

آپ جانتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ بمشورہ گورنمنٹ ہی طے ہو سکتا ہے آپ یا میں بہ حیثیت آپ کا نائب ہونے کے صرف اس مسئلہ کے سلجھانے میں مدد دے سکتے ہیں اور ایسی تجاویز پیش کر سکتے ہیں جو ہماری رائے میں قومی ترقی کے لئے ہوں

چونکہ آپ اس تحریک تاریخ سے آگاہ ہیں مجھ کو اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ حال ہی کی بات ہے کہ سارے ہندوستان اور برہما میں مسلمانوں نے جس عالمگیر جوش و خروش سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اس کی نظیر مسلمانان ہند کے اخیر زمانہ کی تاریخ میں نہیں ملتی لیکن اب کہ یہ مسئلہ اس درجہ پر پہونچ گیا ہے اس امر کا فیصلہ صرف گورنمنٹ کے اختیار میں رہ گیا ہے کہ اس معاملہ کے متعلق مسلمانوں کی خواہش کس حد تک اور کس شکل میں پوری کی جائے قوم میں ایک قسم کی مایوسی پیدا ہو گئی ہے۔ اُن کے سینوں سے جوش جاتا رہا ہے۔ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ جو بلا شبہ نہایت قلیل تعداد میں ہیں نظر بر حالت موجودہ اس تجویز ہی سے دست بردار ہوں اور جو زر قوم یونیورسٹی کے لئے جمع ہوئی ہیں وہ ایسی دوسری تعلیمی کاموں میں خرچ کی جائیں جس سے اُن کی رائے میں بہتر نتیجے نکلیں۔ میں اس خیال کو اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ بغیر معطیوں کی اجازت کے ہم اس خیالی تجویز پر عمل نہیں کر سکتے اس اجازت کے ملنے میں بہت سے لوگوں کو شبہ ہے کہ میری نظر میں ایسے واقعہ کے خیال کرنے کی ضرورت نہیں مجھے معطیوں کی عالی ہمتی سے ہرگز یہ امید نہیں کہ بالفرض نائبین قوم باتفاق یا بکثرت آراء زر قوم جمع شدہ کو دوسری تعلیمی ابواب میں خرچ کرنے کا فیصلہ کریں تو کوئی معطی اپنے عطیہ کو واپس لینے کا خیال کرے گا۔

حدیث شریف میں صاف وارد ہے کہ عطیہ دے کر واپس لینا گویا اُگلی ہوئی چیز کو نگلنا ہے۔ اس مبارک قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کو اسلام کس قدر نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی عام رائے قوم کی یہی ہے کہ ہم یونیورسٹی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جس سے ہمارا مدعا بر آئے۔ ہمارا مدعا یہ تھا کہ آزاد اور خود مختار یونیورسٹی علی گڑھ میں قائم کی جائے جس سے اور صوبوں کے مسلمان بھی مستفیض ہوں۔

ہم گورنمنٹ سے اس مقدمہ میں خط و کتابت کر رہے تھے کہ ہندو یونیورسٹی کی تحریک پیدا ہو گئی۔ اب یہ مسئلہ کہ جب کہ بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ منظور ہو چکا تو اس کا کیا اثر ہماری امیدوں پر ہو گا۔

اوّل یہ سوچنا چاہیے کہ ابھی ہم کو گورنمنٹ سے کچھ گزارش کرنا باقی ہے یا نہیں۔ کیا بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ نے ہماری یونیورسٹی کا بھی فیصلہ کر دیا ہے۔

میں نے بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ اور مسلم یونیورسٹی کے متعلق خط و کتابت کو بغور پڑھا ہے میری نظر میں مشکل لاحقہ کی اصل وہ بعض جملے ہیں جو سر ہارکورٹ بٹلر کے خط بنام راجہ محمود آباد

مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۵ء میں درج ہیں وہ یہ کہ مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے وفد سے وہ اس شرط پر ملاقات کریں گے کہ وہ اس بات پر قانع ہوں کہ ہندو یونیورسٹی کے اصولی مسئلوں کے متعلق جو فیصلے ہوئے ہیں اسی بنا پر ان کو بھی ایک چارٹر (اجازت نامہ) دینے کی درخواست کی جائے۔ اس سے یہ سمجھا گیا کہ ہندو یونیورسٹی کے حامیوں اور گورنمنٹ کے باہمی تجاویز میں مسلمانوں کی شرکت نہ تھی۔ گو ہندوؤں کی مساعی سے بہت پیشتر مسلمان اپنی یونیورسٹی کے لئے کوشش کر رہے تھے اور اگرچہ مسلمانوں کے اغراض جیسا کہ علی گڑھ کالج سے ظاہر ہیں بنارس کالج سے زیادہ اور وسیع تر ہیں۔ یا ایں ہمہ مسلمانوں کو بغیر کسی شرط کے بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ کے شرائط کو تسلیم کرنا ہوگا۔ تاکہ اس ایکٹ کے حصے بجنسہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں داخل نقل کر دیئے جائیں۔ اس قیاس پر نائبین قوم نے سمجھا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں کیا گیا اور انھوں نے تعلیمی ممبر کے روبرو اپنے لبوں پر مہر لگا کر اور ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر جانا پسند نہیں کیا۔ اس خط کے بعد پھر کوئی خط و کتابت فونڈیشن کمیٹی اور گورنمنٹ کے مابین نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ سر ہارکورٹ بٹلر کی مراد یہ تھی کہ یہ مسئلہ دوبارہ غور و لحاظ کے قابل نہ رہا۔ اگر حقیقت میں گورنمنٹ آف انڈیا کا یہی انداز ہو تو مجھے خوف ہے کہ کثرت رائے اس کو بالکلیہ تسلیم کرنے میں رضامند نہ ہوگی۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایسی ہٹ دھرمی کرے گی۔

میری رائے میں گورنمنٹ کو یہ کہنے کا کوئی سبب نہیں ہے کہ مشوروں کا دروازہ بند ہو چکا۔ یہ بہت ضروری ہے کہ درصورت امکان اس کا تصفیہ بہت جلد ہو جائے۔ مگر یہ تصفیہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ دونوں جانب کم و بیش کو مان لینے پر راضی نہوں۔ اب دیکھئے مسلمانوں کی آرزوئیں کیا کیا ہیں آپ کو یاد ہوگا کہ ابتدا سے وہ ایسی یونیورسٹی لینے کے لئے کارروائی کر رہے تھے جسے موجودہ یونیورسٹی کے طرز پر علاوہ علی گڑھ کالج کے دوسرے تمام کالجوں کو ملحق کرنے کا اقتدار حاصل ہو۔ علی گڑھ اس یونیورسٹی کا مرکز ہوتا اور چند دنوں کے لئے مدرسۃ العلوم علی گڑھ ہی یونیورسٹی کا ملحق شدہ کالج ہوتا۔ جملہ فوائد جو تعلیمی اور سکونتی یونیورسٹی سے حاصل ہو سکیں۔ کامل پیمانہ پر علی گڑھ میں مہیا ہوتے ان کو امید تھی کہ جب دوسرے کالج یونیورسٹی سے ملحق ہونے کے لئے تیار ہوتے تو تعلیم اور سکونت کی شرائط جیسا کہ علی گڑھ کالج میں رائج ہیں حتی المقدور یہاں بھی زیر نگرانی انتظام یونیورسٹی جاری ہو جاتے۔ جب یونیورسٹی کی تجویز پیش کی گئی تو یہی امر قوم کے مدنظر تھا۔ یہ نسبت سرکاری یونیورسٹیوں کے جو صرف تعلیمی یونیورسٹیاں ہیں اس قسم کی یونیورسٹی سکونتی اور تعلیمی یونیورسٹی کے زیادہ ہم رنگ ہوگی۔ ہندوستان کے تمام حصے کے لوگوں نے اس امید پر بیش بیش سے عطیے دیئے کہ مسلمانوں کے لئے ایک یونیورسٹی ایسی قایم ہوگی جس کا اقتدار یا

اثر چند صورتوں میں علی گڑھ کی حدود سے باہر بھی پڑے گا۔ اکثروں کا خیال ہے کہ اس توقع کو ایک حد تک گورنمنٹ بھی تقویت دے۔ خیر کچھ ہو اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا کہ کیوں مسلمان یا ہندو جبکہ وہ اپنے خاص خرچ سے یونیورسٹی قایم کرنے کے لئے مستعد ہیں تو ان کو یہ کہا جائے کہ تم کو چارٹر اسی وقت ملے گا جب کہ مجوزہ یونیورسٹیاں بعینہٖ آکسفورڈ اور کیمبرج کے طریقہ پر ہوں اور نہ اُس طریقہ پر جس کو اب تک خود گورنمنٹ آف انڈیا نے قبول کیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ مناسب حدود سے باہر دور دور کے کالجوں کا الحاق موزوں نہ ہوگا۔ اور یہ قابل غور امر ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا دائرۂ اقتدار کس حد تک ہو اور اس طریقہ پر کیوں گورنمنٹ سے سلسلۂ جنبانی نہ کی جائے۔

دستور العمل کے متعلق سرہارکورٹ بٹلر نے ہندو یونیورسٹی کو جس کے الحاق کے اختیارات کو بنارس سے محدود کیا ہے۔ سارے ہندوستان کی یونیورسٹی کہا ہے اور انھوں نے اپنی تقریر میں اس کی وجہ تسمیہ یہی بتائی ہے۔ علی گڑھ کی یونیورسٹی بھی یقیناً سارے ہندوستان کی یونیورسٹی ہونی چاہیئے جس میں ہندوستان کے تمام صوبجات کے مدرسوں اور کالجوں کے طلباء شریک ہو سکیں۔ اور جس کا انتظام مختلف صوبوں کے نامئین کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور جس کی رہ نمائی وہ حضرات کریں گے جن کا علی گڑھ میں رہنا ضروری نہیں ہے۔ ہندوستان کے تمام حصوں کے قابل ترین لوگ علی گڑھ یونیورسٹی کے صیغہ کے اراکین ہوں گے۔ اس کے وائس چانسلر پرو وائس چانسلر اور غالباً چانسلر ممکن ہے خود علی گڑھ سے باہر کے مقامات منتخب کئے جائیں۔ ہاں گو کہ ضرور ہے کہ وہ علی گڑھ کے قرب میں ہوں۔ مثلاً الٰہ آباد۔ لکھنؤ۔ دہلی۔ بانکی پور۔ اور حتیٰ کہ لاہور۔ اور کلکتہ سے بھی کئی حضرات سینٹ اور سنڈیکیٹ کے اراکین ہوں گے۔

مجھے یقین ہے کہ اکابر قوم اور لایق و فاضل حضرات جن میں عہدہ داران گورنمنٹ بھی ہوں گے۔ جن کی ہوشمندی خوش اعتقادی اور وفاداری میں لمحہ بھر کے لئے کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری یونیورسٹی میں موجود ہوں گے۔

لیکن چوں کہ گورنمنٹ سے ہماری یونیورسٹی کی ڈگریاں تسلیم کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ اور خود گورنمنٹ ایک فیاضانہ عطیہ دے گی۔ گورنمنٹ کو مداخلت کے کسی قدر اختیارات ضرور ہیں تاکہ اس کو یونیورسٹی کے نصاب سے اطمینان ہو۔

میں خوب واقف ہوں کہ اس بل پر ایک یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ خود گورنمنٹ ایسی یونیورسٹیوں کی

ڈگری تسلیم کرتی ہے۔ مگر اُسے کوئی قطعی اقتدار نہیں۔ فرض کرو کہ گورنمنٹ کی رائے اس معاملہ میں مناسب ہے اور میں اُس سے اس بات کے کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس کو یہ بات تسلیم کرنا چاہئے کہ گورنمنٹ کے پاس چند اختیارات مداخلت کے رہیں

عملی سوال یہ ہے کہ یہ اختیارات کس قسم کے ہوں اور کس شکل کے ہوں اور یقیناً ہم اس معاملہ میں رائے زنی کے مستحق ہیں۔ یہ بھی چند لوگوں کا خیال ہے کہ جب تک گورنمنٹ کو اقتدار مداخلت اور معائنہ نہ ہو تو خودمختار درس گاہوں میں اور کالجوں میں بغاوت کے پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ اسی خیال سے بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ میں گورنمنٹ نے اس قدر اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ یہ آپ لوگوں کو ضرور واضح ہوگا کہ بنارس ہندو یونیورسٹی یا مسلم یونیورسٹی کے متعلق اس قسم کا گمان لغو ہے۔ جو لوگ یونیورسٹیوں کے کام کے ذمہ دار ہیں اگر ان سے بغاوت ہونی ممکن ہے تو میری رائے میں بغاوت محض ایک بے معنی لفظ ہے یہ سب صحیح مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ اندیشہ بعض حلقوں میں ضرور موجود ہے مگر اس کی محافظت بغیر ان سخت قواعد کے جو بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ میں رکھے گئے ہیں کافی طور سے ہو سکتی ہے۔

میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی کہ لفٹنٹ گورنر یا گورنمنٹ آف انڈیا اُن وافر اختیارات کا بے جا استعمال نہ کریں گی جو ان کے لئے مخصوص کئے جائیں۔

درحقیقت میں نہیں سمجھتا ہوں کہ کبھی ایسا اتفاق ہوگا۔ کہ ہندو اور مسلم یونیورسٹیوں کی روئداد میں گورنمنٹ کو مداخلت کی ضرورت داعی ہو مگر مجھ کو اور دوسری طرح کے اندیشہ ہیں جن کا ثبوت علی گڑھ کالج کی تاریخ سے ملتا ہے۔ بعض لوگ دائرۂ یونیورسٹی میں ایسے بھی ہوں گے جو اختلاف رائے کو ذاتی رنج و شکایات پر محمول کریں گے اور اس بات کا خوف ہے کہ جب ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اراکین آرا کی گنجائش ہے تو وہ وفاداری کے یونیورسٹی فیصلہ پر رضامندی نہ ظاہر کریں گے۔ پس جو کچھ اقتدارات گورنمنٹ کو دیئے جائیں۔ اولاً اس بات کا خیال رکھا جائے کہ زود رنج حضرات کو کارروائی کی گنجائش نہ ملے۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ بہت ہی عدیم الفرصت حاکم ہیں اور بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ کے مطابق جو وسیع اختیارات اُن کو دیئے گئے ہیں یا تو وہ بیکار رہیں گے یا ان کی تعمیل کلکٹر یا کمشنر یا سکرٹریٹ کے عہدہ داروں کے ہاتھ میں آ جا دے گی

اور ان کا عمل اپنے کم درجہ کے ماتحتوں کی رپورٹ پر یا یونیورسٹی کونسل کے غیر متعلق ارکان کے بیان پر مبنی ہوگا۔ قطع نظر اس بات کے کہ وزیر یا گورنمنٹ آف انڈیا اپنے اختیارات کو بے جا طور سے استعمال میں لائے گی۔ کیا ایسی یونیورسٹی کے شایان شان ہے کہ ایک غیر شخص کی رائے سے اس کی روئیداد کی تنسیخ ہو جاوے علاوہ اس کے بلحاظ اس امر کے کہ یہ آل انڈیا یونیورسٹی ہوگی۔ کیا آپ کی رائے میں یہ زیادہ تر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام اقتدارات جناب حضور والیسرائے صاحب بہادر کو تفویض ہوتے۔ ان کے علاوہ دیگر اہم مسائل کورٹ۔ کونسل و سینیٹ کے نظام اور اُن اختیارات کے متعلق ہیں جن پر قوم مسلمانان اور علی گڑھ کالج کے مخصوص حالات کی روشنی میں غور کرنا ہے۔

میری رائے میں مسلم یونیورسٹی کے متعلق میں نے جو کچھ گزارش کی ہے اُس کو مدنظر رکھ کر گورنمنٹ آف انڈیا سے عرضداشت کی جائے جو ہمارے جدید ایجوکیشن ممبر ہیں مجھے امید ہے کہ موجودہ مسائل کی نسبت فیصلہ کرنے میں گزشتہ واقعات ان کے سدِراہ نہ ہوں گے۔

میری آپ کو یہ بھی نصیحت ہے کہ ہز ایکسیلنسی لارڈ ہارڈنگ کے زمانہ میں اس مسئلہ کا تصفیہ ہو جائے لوگوں کو اُن پر پورا اعتماد ہے کہ اور ان کے جانے سے پہلے ایک چارٹر حاصل کر لینا قوم کے لئے مفید ہے۔ اس بارہ میں میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہم موجودہ ایجوکیشن ممبر سے درخواست کریں کہ چند قایم مقامان قوم سے وہ ملاقات کریں یا بعد گفت و شنید اس مسئلہ کا تصفیہ ہو جائے مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کو ابھی کیا کرنا ہے۔ وہ کہہ نہیں سکتی مگر جب اس کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی تجاویز پر گورنمنٹ آف انڈیا کا کیا قول فیصل ہے۔ تب اس کے مطابق وہ مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کو رائے دینے لگے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری تجاویز گورنمنٹ آف انڈیا کے قابل تسلیم ہوں۔ اور جن کو بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ پر ترجیح ہو تو ہمارے ہندو بھائی بھی چاہیں تو ان تجاویز سے فائدہ اٹھا سکیں خدا کرے ایک خاطر خواہ چارٹر علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی قایم کرنے کے لئے جلد عطا ہو جائے۔ کیوں کہ مجھے امید قوی ہے کہ اس کے ذریعہ سے بے شبہ قوم کی تعلیم میں ایک زوردار نئی روح پھونکی جائے گی اس یونیورسٹی سے زیادہ تر شمالی ہندوستان کو فائدہ پہونچے گا۔ یہ نیک فال ہے کہ گورنمنٹ میسور نے حال میں ایک علحدہ یونیورسٹی قایم کرنے کے لئے تجویز کی ہے۔ بہت زمانہ سے اس قسم کی کارروائی کے لئے مسلمانان ہند کی آنکھیں ریاست حیدرآباد پر لگی ہوئی ہیں۔

اور میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی کام ایسا نہیں ہے جس سے خود حیدرآباد میں اور

عموماً جنوبی اور مغربی حصہ جات میں قوم کی تعلیم کو ترقی ہو۔

حضور ہز ہائنس نظام گورنمنٹ کی توجہ اس مقدمہ میں موزوں اور مودبانہ طور پر مبذول کرانا چاہئے۔

امور عامہ میں نے تعلیمی حالت کے چند نہایت اہم اور ضروری مسائل کے بارہ میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ آپ اس بات کو خوب محسوس کر سکتے ہیں کہ ہم کو ایسے وسیع اور مشکل مسائل درپیش ہیں جن کے مناسب حل ہونے پر قوم و ملک کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ یہ ہماری تعلیمی کوششوں کی ابتدا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی کوششوں کو زیادہ وسیع اور عظیم الشان پیمانہ پر مرتب کریں۔ ہر پریسیڈنسی میں ہم کو ایک مرکزی انجمن کی ضرورت ہے جو مقامی انجمنوں کے ذریعہ سے تمام صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیم کی محافظت کرے۔ قوم کی رائے عامہ کو ایک نقطہ پر مجتمع کر کے گورنمنٹ کو مستند رائے دے سکے۔ ان انجمنوں میں عام باثر اکابر یا عمائد اسلام شریک ہوں گے اور عملی ہمدردی کریں گے تعلیم کے مختلف صیغوں کے متعلق مختلف شاخیں ہونگی اور علی گڑھ میں کانفرنس کی کمیٹی صوبجات کی کمیٹی سے خط و کتابت کرتی رہے گی۔ ہر بڑے شہر میں محلہ محلہ کمیٹیاں قائم کی جائیں جن میں باثر حضرات شریک ہوں۔ ان کمیٹیوں کے فرائض میں مقامی ابتدائی تعلیم کی محافظت مشتمل ہوگی۔ حلقوں میں اور قصبوں میں ہر ایک قریہ میں جہاں پر تعلیم پانے والے مسلمان بچے موجود ہیں۔ ایسی کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ اس قسم کی قومی انجمنیں کئی محض ابتدائی اور غیر مرتب شکلوں میں متعدد صوبجات میں جیسے کہ مدراس۔ پنجاب اور ممالک متحدہ میں موجود ہیں۔ لیکن ہم کو اگر مکمل اور کافی طور پر تعلیم کی تجاویز عمل میں لانا منظور ہے تو موجودہ تعلیمی انجمنوں کو ہم وسعت دیں اور اُن میں نئی جان و روح پھونکیں۔ یہ محتاج بیان نہیں کہ ہر صوبہ کی استعداد و ضروریات مختلف ہیں۔ مثلاً اگر ہم تجارت کے لئے کسی صوبہ کو منتخب کرنا چاہیں تو تجارتی تعلیم کے لئے بلاشبہ سب سے زیادہ موزوں مقام بمبئی ہے جیکے باشندے ایک خاص تجارتی قابلیت رکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا مختلف صوبجات میں صنعت اور حرفت کے حالات بھی مختلف ہیں لہذا ہر صوبہ کے متعلق اس کی مخصوص ضروریات اور حالات کے لحاظ سے مختلف پروگراموں کے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

خاتمہ خلاصہ یہ ہے کہ قومی کاموں کا میدان بے پایاں ہے۔ یاد رکھو کہ دنیا کے تمام حصوں میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں بے مثل رہے ہیں۔ جہاں کہیں وہ گئے انھوں نے انسانی قوائے ذہنیہ کی ترقی کی بے نظیر یادگاریں چھوڑی ہیں۔ انسانی پیداواروں میں عجیب ترین مفید ترین پیداواریں انھیں کی ہیں۔ بلند خیالی ان کا شعار ہے۔ وہ ہمیشہ عظیم الشان خدمات انسانی کے درپے رہے ہیں اور مشکل سے مشکل کام بھی مسلسل جد و جہد کے بعد اُنھوں نے انجام کو پہونچا کر چھوڑا ہے۔ اس وقت بھی قوم کو جہالت ضعف اور افلاس کے غار عمیق سے نکالنا درحقیقت ایک بہت بڑا کام ہے اور دعا ہے کہ اس کے متعلق خدائے تعالیٰ ہمیں اپنے فرض کے انجام دہی کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین۔



خان بہادر سر میاں محمد شفیع
صدر اجلاس سی ام (علی گڈہ سنہ ۱۹۱۶ع)

اجلاس سی ام

(منعقدہ علی گڑھ ۱۹۱۶ء)

صدر خان بہادر سر میاں محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا کے سی ایس آئی

حالات صدر

اس دور جدید میں تعلیم جدیدہ کی بدولت (باغبان پورہ) کے میاں خاندان میں میاں محمد شاہ دین اور میاں محمد شفیع ایسے پھلے اور پھولے جن کی خوش بوئے عالم کو مہکا دیا۔ میاں محمد شاہ دین صدر اجلاس کانفرنس کے مختصر حالاتِ زندگی انھیں اوراق میں اپنی جگہ پر قلم بند ہو چکے ہیں اب میاں محمد شفیع کی باری ہے آپ ۱۸۶۹ء میں اپنے موضع باغبان پورہ مضافات لاہور میں پیدا ہوئے جن کی ابتدائی تعلیم قرآن پاک سے شروع ہوئی اور سب سے پہلے ایک مسجد کے مکتب میں مولوی اللہ دین سے قرآن شریف پڑھ کر ختم کیا اس کے بعد اسی موضع کے ورناکیولر مڈل اسکول کی تعلیم ختم کر کے سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور میں داخل ہو گئے اور ۱۸۸۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا میٹرک میں کامیاب ہونے کے بعد فورمن کرسچین کالج میں اٹھارہ مہینے تک تعلیم پائی جس کے بعد ۱۸۸۹ء میں قانونی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان روانہ ہو گئے۔ ان سے دو سال قبل میاں محمد شاہ دین جو ان کے چچا زاد بھائی تھے انگلستان جا چکے تھے، اس وقت انگلستان میں سر عبدالرحیم، سر علی امام، جسٹس میاں محمد شاہ دین

سر محمد شفیع ، مولوی رفیع الدین بیرسٹرایٹ لا بیک وقت زیر تعلیم تھے۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مذکورۂ بالا گروپ جب انگلستان سے کامیاب ہو کر ہندوستان کو لوٹا اور ہر ایک نے دنیائے عمل میں قدم رکھا تو ان میں سے سوائے مولوی رفیع الدین کے باقی تمام افراد آسمان شہرت پر بدر کامل بن کر چمکے میاں محمد شفیع انگلستان جانے سے پہلے ذہین اور ہوشمند طلبہ میں شمار ہوتے تھے اخبار بینی اور مضمون نگاری سے ان کو خاص شوق تھا پبلک معاملات میں وہ اسی وقت سے دلچسپی لینے کے قابل نظر آتے تھے جبکہ ان کے مضامین پائنیر، ٹریبیون، مسلم ہیرلڈ، سول اینڈ ملیٹری گزٹ میں شائع ہوتے تھے ان کو قیام انگلستان میں بہترین سوسائٹی ملی تھی وہاں رہ کر اُنھوں نے اپنے مقصد حیات میں ترقی دینے کی اور کامیاب ہونے کی پوری کوشش کی ان کی کتب بینی نہ صرف نصاب تعلیم پر محدود تھی بلکہ اُنہوں نے برٹش کانسٹی ٹیوشن اور برٹش پولیٹیکل لائف پر بھی غور کیا تھا اور اس مبحث پر جو ذخیرہ کتابی شکل میں موجود تھا اس کو بھی بہ نظر امعان اُنھوں نے دیکھا تھا۔ وہ دارالعوام کے جلسوں میں شوق سے جاتے اور اس کی بحثوں اور تقریروں کو غور سے سنتے تھے سیاسی مجالس میں بھی ان کی شرکت لازمی طور سے ہوتی تھی اسی زمانہ میں مسٹر عبدالرحیم نے جو اب سر عبدالرحیم ہیں اور اس وقت مسٹر شفیع سے سینیر طلبہ میں شامل تھے اپنے مکان پر جلسہ کر کے (انجمن اسلام لندن) کی بنیاد قایم کی اس وقت اس انجمن کے صدر خود مسٹر عبدالرحیم نائب صدر سید علی امام مسٹر محمد شاہ دین مولوی رفیع الدین مسٹر حسن امام اور مسٹر محمد شفیع ممبر قرار پائے تھے آخر میں مسٹر عبدالرحیم مسٹر شاہ دین اور سید علی امام کی واپسی کے بعد مسٹر شفیع انجمن مذکور کے صدر منتخب ہوئے۔

اگست ۱۸۹۲ء میں میاں صاحب موصوف بیرسٹری کا ڈپلومہ لے کر وطن آئے اور اکتوبر ۱۸۹۲ء میں اُنھوں نے (ہوشیارپور) کے ضلع میں وکالت شروع کی ۱۸۹۵ء میں ہوشیارپور سے لاہور آئے اور چیف کورٹ میں پریکٹس شروع کی بہ حیثیت خوش بیان مقرر اور اچھے قانون داں ہونے کے بہت جلد ان کا شمار چوٹی کے بیرسٹروں میں ہونے لگا حتیٰ کہ ۱۸۹۹ء میں پنجاب چیف کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری منتخب کئے گئے ۱۹۰۸ء میں خطاب خان بہادر سے مخاطب ہوئے ۱۹۰۹ء میں پنجاب لیجس لیٹو کونسل میں مسلمانوں کے نمایندہ ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے نشست کی جنوری ۱۹۱۲ء میں امپیریل لیجس لیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور اس لحاظ سے دس برس تک اُنھوں نے کونسلوں میں رہ کر ملکی اور قومی خدمات انجام

دینے کی کوشش کی سنہ ۱۹۱۲ء مین ہائی کورٹ مدراس کی عارضی جگہ کو قبول کرنے کی ان سے درخواست کی گئی جس کے منظور کرنے سے اُنھوں نے انکار کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء و سنہ ۱۹۱۷ء میں پنجاب بار ایسوسی ایشن کی وائس پریسیڈنسی اور پریسیڈنٹی کی خدمات جلیلہ اُنہوں نے انجام دیں کامیاب پیشۂ وکالت کو انجام دینے اور راس کے متعلق بہت سی عزتوں اور مناصب کو طے کرنے کے بعد جولائی سنہ ۱۹۱۹ء میں سر سنکرن نائیر کے مستعفی ہو جانے سے گورنمنٹ آف انڈیا کی وزارت تعلیمات کے عہدہ پر سرفراز کئے گئے چنانچہ ممبر تعلیمات و پبلک ہیلتھ کا آفس آخر سنہ ۱۹۲۲ء تک ان کے زیر نگرانی رہا بعدازاں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر قانون قرار پائے جس کی میعاد بالاخر وائیسرائے کی بے حد ستایش اور حاکمان اعلےٰ میں کافی ہر دل عزیزی حاصل کرنے کے بعد ۲ رجنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو ختم ہوئی اپنے پیشۂ وکالت کی مصروفیت اور سرکاری عہدوں کے مشاغل کے علاوہ سر موصوف مختلف زمانوں میں اور مختلف اوقات میں اکثر قومی انجمنوں کے جن کا تعلق خواہ پنجاب سے تھا یا دیگر مقامات سے ان کے سرگرم معاون اور رکن رہے قومی تعلیم اور قوم کی سیاسی زندگی سے ان کو ہمیشہ شغف رہا قوم کی تعلیمی ترقی میں نہ صرف خیالات سے مدد کی بلکہ اکثر موقعوں پر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کالج اور انجمن حمایت اسلام لاہور اور دیگر مفید انسٹی ٹیوشنوں کی چندوں سے معاونت کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہوشیارپور میں اُنہوں نے اپنی پریکٹس کے ابتدائی زمانہ میں وہاں ایک مفید انجمن اسلام قایم کی تھی عرصہ تک وہ خود اس کے آنریری جنرل سیکرٹری رہے ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن لاہور کے وائس پریسیڈنٹ انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر، آل انڈیا مسلم لیگ کے وائس پریسیڈنٹ اور سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک صوبہ پنجاب کی پراونشل مسلم لیگ کے آنریری جنرل سکرٹری رہے۔ انہیں کے ذاتی اثر اور کوشش سے صوبہ پنجاب کے ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ مسلم لیگ قایم ہوئی۔

میاں محمد شفیع انڈین نیشنل کانگرس سے ہمیشہ علحدہ رہے لیکن جب مانٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ انڈین کانسٹی ٹیوشن رفارمس پر شائع ہوئی تو کانگرس لبرل اور ماڈریٹ کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اُنہوں نے ماڈریٹ کانفرنس کی تائید کی جس کے صدر سر سریندر و ناتھ بنرجی تھے اور جس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا اور یہ نیشنل لبرل فیڈریشن کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے جس کے بعد اُنہوں نے زبردست مضامین کا ایک سلسلہ قایم کیا اور اُن کے ذریعہ سے اس ملک کے یوروپین، آفیشل، نان آفیشل اور اپنے ہم وطنوں سے درخواست کی کہ وہ آپس میں مل جل کر ریفارم کو کامیاب بنانے میں مدد کریں پبلک زندگی شروع کرنے کے ساتھ ہی اُنہوں نے تعلیمی معاملات میں بھی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔

جس وقت ہوشیار پور میں اُنہوں نے انجمن اسلام قایم کی اس کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ انجمن کی کوشش سے ایک مسلم ہائی اسکول قایم کیا جاوے۔ یہ اسکول گو ان کی ہوشیار پور کی موجودگی میں قایم نہ ہو سکا تاہم ان کی سچی خواہش مابعد کے زمانہ میں پوری ہوئی اور غالباً ۱۹۰۸ء میں نواب وقارالدولہ وقارالملک مولوی مشتاق حسین مرحوم آنریری سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ہاتوں سے اسکول کا سنگ بنیاد رکھا گیا اس جلسہ میں میاں محمد شفیع کو بھی خاص طور پر اہالیان ہوشیار پور نے مدعو کیا تھا۔

۱۸۹۶ء میں وہ پنجاب یونی ورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے اپنی تمام غیر سرکاری حیثیت میں میاں صاحب اس وقت تک پنجاب یونی ورسٹی کے فیلو رہے جب تک کہ ایگز کیٹو کونسل کے ممبر نہ بن گئے۔

اس کافی زمانہ میں وہ کالج انسپکشن کمیٹی کے متعدد مرتبہ ممبر رہے علاوہ ازیں وہ کالج فیکلٹی اور لا کالج کمیٹی اور سنڈیکیٹ یونی ورسٹی کے سیکرٹری مقرر ہوتے رہے۔ یونی ورسٹی کے ساتھ یہ قریبی تعلقات ہی تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے تعلیمی ممبر ہونے کی حیثیت میں ان کے بہت کام آئے۔

اُنہوں نے مختلف اوقات میں قوم کی تعلیمی اور سیاسی مجالس کی صدارت کے فرائض انجام دے کر اس کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی جولائی ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا اردو کانفرنس منعقدہ پونا کے صدر ہوئے ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر قرار پائے اسی طرح آل انڈیا مسلم لیگ کی بھی صدارت کا منصب حاصل کیا ۱۸۹۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ حال (مسلم یونی ورسٹی) کے ٹرسٹی مقرر ہوئے سرسید احمد خاں مرحوم کے کاموں سے اور علی گڑھ تحریک سے ان کو ہمدردی کے ساتھ دلچسپی رہی ہے مسلم یونی ورسٹی کی تجویز کو کامیاب کرنے میں ان کے ذاتی اور صفاتی اثر کا بہت بڑا حصہ ہے جس زمانہ میں اس تحریک کے لئے عام طور سے مالی امداد کا سوال پیش تھا اس وقت پانچ ہزار روپیہ کا عطیہ انہوں نے اپنی جیب سے دیا علاوہ ازیں صوبہ پنجاب سے یونی ورسٹی کے لئے سرمایہ بہم پہنچانے میں بھی کوشش بلیغ کی جب ۱۹۲۲ء میں سرولیم وِنسنٹ کی سبکدوشی کے بعد سر موصوف وائسرائے کی انتظامی کونسل کے پریسیڈنٹ بنائے گئے تھے اس وقت ان ہی کے زمانہ ممبری میں ڈھاکہ، رنگون، لکھنؤ، علی گڑھ دہلی، ناگپور کی یونی ورسٹیاں عالم وجود میں آئیں۔

ان کی پبلک اور سرکاری خدمات کے اعتراف میں جون ۱۹۱۶ء میں سی، آئی، ای اور یکم جنوری ۱۹۲۲ء میں کے، سی، ایس، آئی کے اعلیٰ خطابات ان کو دئے گئے۔

واقعات مذکور اس امر کے شاہد ہیں کہ سر موصوف اپنی قابلیت، مستعدی، ذہانت کی وجہ سے زندگی کے دشوار گزار مراحل میں اول سے آخر تک کامیاب ہوئے پیشۂ وکالت میں ناموری اور شہرت کے ساتھ اُنہوں نے کافی دولت پیدا کی سرکاری خدمتوں پر اونچی سے اونچی جگہ ان کی نشست کے لئے دی گئی، قومی اور ملکی خدمات میں بھی جس حد تک اُنہوں نے صرف ہمت کی قوم کی طرف سے بھی عزت افزائی کے بارہا موقعے ان کو دیئے گئے ۱۹۲۳ء میں مسلم یونی ورسٹی کی طرف سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی گئی مختلف قومی مجالس کے وہ صدر بنائے گئے مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں کے اعزازی عہدے ان کو پیش کئے گئے جو ایڈرس سر موصوف نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے پڑھا تھا اس میں اُنہوں نے صنعتی اور حرفتی تعلیم پر قوم کو مائل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی تھی اور زمانہ موجودہ کی رفتار کے خیال سے تعلیم مذکور کی خواہش کو قوم کے ذہن نشین کرنے میں صرف ہمت کی تھی جبکہ گیارہ برس پیشتر اس تعلیم کی ضرورت تھی ظاہر ہے کہ آج اس زمانہ سے بدرجہا اس زمانہ سے زیادہ تعلیم مذکور کی حاجت ہے مگر افسوس کہ ہمارا تعلیمی قدم ابھی اُسی جگہ پر ہے جہاں ہم گیارہ برس پہلے کھڑے ہوئے تھے" ہم نے کیا سنا اور کیا عمل کیا؟ اس کا جواب زمانہ مستقبل دے گا۔

ترجمۂ خطبۂ صدارت

حضرات! جس وقت میرے نہایت معزز دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے آپ کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کی اس خواہش کی مجھے اطلاع دی کہ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسویں سالانہ اجلاس کی صدارت قبول کروں تو میں نے خیال کیا کہ یہ اعلیٰ اعزاز جو میرے سامنے پیش کیا گیا ہے ایک قطعی ثبوت ہے اس امر کا کہ پنجاب نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں (بلاشبہ جس کا مرکز و منبع علی گڑھ ہے) .... جو حصہ لیا ہے اُس کی نسبت آپ نے اپنی خوشنودی و پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے خود میرا تعلق اس عظیم الشان کانفرنس کے ساتھ دسمبر ۱۸۹۳ء سے ہے جب کہ ہمارے آٹھویں سالانہ جلسہ کے موقعہ پر اسی اسٹریچی ہال میں مسٹر سید محمود مرحوم نے ایک نہایت ہی دلچسپ لکچر مسلمانوں کی تعلیم پر دیا تھا جو منجملہ اُن دو لکچروں کے تھا جنہوں نے توسیع و نظر ثانی کے بعد اُس نہایت بیش قیمت تصنیف کی شکل اختیار کی جس کا نام "ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ ہے" یہ وہ مبارک عہد تھا

جبکہ علی گڑھ تحریک کا بلند پایہ بانی جس کی بانگ درائے مسلمانان ہند کو موت نما خواب سے بیدار کیا اور جس کے زیر سایہ ہم میں سے اکثر کو پبلک لائف کا پہلا سبق پڑھنے کا فخر حاصل ہوا ہے ہمارے درمیان موجود تھا۔ دنیا کی تاریخ میں قومی تحریکوں کے چند ہی ایسے بڑے بڑے رہنما گزرے ہیں جنھوں نے خود اپنی زندگی میں اپنی محنتوں کے پھلوں کو اس درجہ پختہ ہوتے دیکھا ہو جتنا کہ سر سید سیّد احمد خاں نے دیکھا مرکزی تحریک ہمارے علی گڑھ کے قومی کالج کی شکل اختیار کر چکی تھی جو ایک بے نفس قومی خدمت گزار کی پاک یادگار کی سب سے بڑی اور کبھی نہ مٹنے والی نشانی ہے نیز اس کانفرنس کے سالانہ جلسوں نے قوم کو دور دراز صوبوں تک میں تعلیمی ترقی کی اہم ضرورت کی جانب متوجہ کر دیا تھا زندہ دلان پنجاب پہلا گروہ تھا جو سیّد کے چشمہ فیض سے سیراب ہوا چنانچہ انجمن حمایت اسلام کی مستعدیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ صوبہ وار تعلیمی تحریک کا آغاز ہو گیا اور آخر کار لاہور میں اسلامیہ کالج کی بنیاد قایم ہو گئی اور اگرچہ ہمارا محترم لیڈر خود اپنی زندگی میں مسلم یونی ورسٹی کے متعلق اپنی خواب شیریں کی تعبیر ظاہر ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا تاہم اس عظیم الشان قومی تحریک کی نسبت اُس کے وطن پرستانہ جوش نے اُس کے جانشینوں کو برابر گرمائے رکھا یہاں تک کہ آخر کار منزل مقصود بالکل نظر کے سامنے آ چکی ہے۔ گزشتہ پچیس سال کے اندر ان عظیم الشان تعلیمی مقاصد کی جو کچھ بھی خدمت مجھ سے بن آئی اُس کا آپ نے جس فیاضی سے اعتراف فرمایا ہے اُس کے لیے میں آپ کا از حد ممنون ہوں اور گو میں اس ذمہ داری کے بوجھ سے جو میرے کمزور شانوں پر رکھا گیا ہے بخوبی واقف تھا تاہم میں نے آپ کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ارشاد کی تعمیل محض اس امید پر کی ہے کہ آپ ہمارے اس قومی مجمع کے اعزاز کو برقرار رکھنے اور اُس کے مباحث کو بخیر و خوبی انجام کو پہنچانے میں از راہ کرم میری امداد فرمائیں گے۔

عالمگیر جنگ

حضرات! تمام اُن لوگوں کا جو پُر امن و سکون ترقی کے خواہاں ہیں خیال تھا کہ امسال کا اجلاس کانفرنس اُن حالات سے بالکل مختلف حالات میں منعقد ہو گا جو گزشتہ دو سال کے اندر نوع انسان کو پیش آتے رہے ہیں لیکن ایک خونریز جنگ کا ابر غلیظ خشکی و تری پر اب تک چھایا ہوا ہے اور تین براعظموں کے بعض سر سبز ترین ملکوں کو تباہ اور دنیا کی بعض سب سے بڑی قوموں کی مردانہ آبادی کو غارت کر رہا ہے اور جو ذرائع اور قویٰ بنی نوع بشر کی ترقی کے لئے اب تک

مخصوص تھے اُن کو بیکار کر رہا ہے اور جس سے وہ ممالک بھی مامون مصئون نہیں ہیں جو اس بے مثل آتش زنی کے مرکز سے دور ہیں بلا شبہ اس عالمگیر مصیبت کی ذمہ داری اُس قوم پر ہے جس نے سیادت عالم کے خیال میں مست ہو کر مہذب دنیا کو موت اور تباہی کی اُبلتی دیگ میں جھونک دیا ہے یہ غیر ممکن ہے کہ امن اور باہمی اعتبار کی قوتیں انسانی معاملات پر از سر نو قابو حاصل کریں جبتک کہ جرمنی کا دیو حرص و آز اس درجہ مغلوب نہ ہو جاوے کہ وہ دوبارہ دنیا کو کسی ایسی ہی برباد کن جنگ میں مبتلا نہ کر سکے ہندوستان نے اس عام مصیبت میں اور سچائی اور تہذیب کی تائید اور انگلستان کے اعزاز و اقتدار کے برقرار رکھنے کی امداد میں جو کچھ کیا ہے اُس نے نہ صرف جرمنی کے بے بنیاد اندازوں کو پورے طور پر جھٹلا دیا ہے بلکہ اس سے برطانیہ عظمیٰ کی پُر شوکت سلطنت کے اندر ایسی جدید قوتیں اور کیفیتیں پیدا ہو رہی ہیں جو اُن رشتوں کو اور زیادہ مضبوط اور مستحکم کر دیں گی جو اس سلطنت کے مختلف حصوں کو باہمی ملائے ہوئے ہیں حضور ملک معظم کی مسلمان رعایا نے اس ملک کے اندر ایسے حالات میں جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں موجود نہیں ہے اور جن سے اس ملک کی کسی اور قوم کو سابقہ نہیں پڑ سکتا تھا برٹش تخت و تاج کے ساتھ اپنی روایتی اور دائمی وفاداری کا قطعی ثبوت پیش کیا ہے مسلمانوں نے تین براعظموں کے میدان ہائے جنگ پر (جس میں مشرق ادنیٰ بھی شامل ہے) جس خوشی سے اپنی جانیں قربان کی ہیں جس طرح اُنھوں نے ہندوستانی فوج میں اپنے ہزاراں ہزار افراد شامل کئے ہیں جو اُس نسبت سے بدرجہا زیادہ ہے جو اُنھیں برٹش انڈیا کی آبادی میں حاصل ہے خود ملک کے اندر اُنھوں نے قانون اور امن کی حمایت کی ہے مسلمانان ہند نے بلا شائبہ شبہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ اس کانفرنس ہال کے اندر یا باہر کسی ایسے وعظ کی احتیاج نہیں ہے جو اُنھیں اُس سلطنت کے متعلق اُن کے فرائض کی تعلیم دے جس کے شہری ہونے کو وہ اپنی ایک پر فخر ملکیت تصور کرتے ہیں اس موقع پر میں اپنے اس ملک کے کروڑوں ہم مذہبوں کی جانب سے اپنے ذی جاہ و جلال شہنشاہ کے قدموں پر اپنی قوم کی پائدار وفاداری کے گہر ہائے آبدار نثار کرتا ہوں اور اپنی قوم کی دلی تائید کا اُس وقت تک کے لئے یقین دلاتا ہوں کہ جرمنی کے جنگجویانہ جنوں پر ایک مہلک ضرب پڑے جو نوع انسان کو اُس پریشانی سے نجات دینے کا واحد ذریعہ ہے جس نے آجکل امن اور ترقی کے جملہ ذرائع کو جکڑ رکھا ہے۔

لارڈ ہارڈنگ

حضرات! جس وقت ایک سال قبل اس کانفرنس کا اجلاس پونا میں ہوا تھا اُس وقت ہندوستان کے ملکی اُمور اس شریف شخص کے زیرِ نگرانی تھے جس نے اپنے دوراندیش تدبّر باریک بینی اور بے تعصب ہمدردی سے ملک معظم کی رعایا کے دلوں میں ایک خاص جگہ حاصل کر لی تھی۔ وہ زمانہ جس میں ہز ایکسیلنسی لارڈ ہارڈنگ ہندوستان میں رہے انگریزی تاریخ میں ایک درخشاں باب ہے۔ ممدوح کی حمایت نے ہمارے ملک ہندوستان کو ایک ملک مقبوضہ کی حیثیت سے بڑھا کر وہ جگہ دلادی ہے جس کا وہ بوجہ اپنی وفاداری کے مستحق ہے۔ ہمارا ملک ممدوح کے ظل حمایت میں دنیا کی سب سے عظیم الشان سلطنت میں اپنے حقوق کے لحاظ سے مساوی کا شریک ہوگیا۔ اگر میں ان جملوں کا اقتباس کروں جو ممدوح نے اپنی بمبئی کی ایک رخصتی تقریر میں فرمائے تھے تو میں کہوں گا کہ ممدوح ہندوستان پر بھروسہ رکھتے تھے ہندوستان کا اعتبار کرتے تھے اور ہندوستان کی اُمید و بیم اور خوشی و رنج میں شریک تھے مختصر یہ کہ بزمانہ ممدوح ہندوستان میں غیریت کی جھلک نہ رہ گئی تھی۔ ممدوح نے اپنے اس مقولہ کی سچائی کا عملی ثبوت دیا کہ وائسرائے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی آرزوؤں اور تمنّاؤں کو ہمدردانہ توجہ سے سُنے اور اُن کے جذبات اور دلی خواہشات کا شہنشاہ انگلینڈ اور برطانیہ کے باشندوں کے روبرو ترجمان بنے اور اسی طرح اُس کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستانی اس سچی ہمدردی اور ان دلی جذبات کو جو خدا کی نظر میں مقبول ہیں اور جس سے انگلینڈ کے جلد متاثر ہونے والے قلب میں جان پڑ گئی ہے اچھی طرح سمجھیں ممدوح نے یہ سمجھ کر کہ ہندوستان کی آیندہ بہتری مختلف اقوام میں اشاعت تعلیم پر منحصر ہے تعلیم کو اپنے زمانہ حکومت میں خاص اہمیت دی۔ ممدوح کے زمانہ حکومت کے ان تین سالوں میں جو اس خوفناک جنگ سے قبل گزرے مختلف صوبوں میں مد تعلیم میں ۰۰۱۷۱۴۷۴ روپیہ غیر مستقل خرچ کے لئے اور ۱۲۴۰۰۰۰۴ روپیہ سالانہ مستقل خرچ کے واسطے معمولی تعلیمی بجٹ سے زیادہ ملا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے شروع زمانہ میں ہندوستانیوں کی تعلیم انتظامیہ پالیسی میں شامل نہ تھی برٹش پارلیمنٹ نے اس اہم ضرورت کی جانب اپنی توجہ سنہ ۱۹۱۲ء میں مبذول کی اور از راہ عنایت حسب دفعہ ۴۳ ایکٹ ۵۳ باب ۱۵۵ یہ امر قرار پایا کہ تینوں صوبوں میں تعلیم کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کر دی جائے اس ایکٹ کے ۱۷ برس بعد تک کل ۵۱۵۲۲۰۰۰ روپیہ تعلیم کے لئے مقرر ہوا۔

ان حالات پر نظر کرنے سے گورنمنٹ کی اُنیسویں صدی کے شروع سالوں کی تعلیمی پالیسی اور بیسویں صدی کے شروع سالوں کی تعلیمی پالیسی میں تعجب انگیز فرق نظر آتا ہے۔ ہم کو لارڈ ہارڈنگ کے جانشین وائسرائے کی ذات سے ہندوستان کا مستقبل شاندار نظر آتا ہے۔

موجودہ وائسرائے نے بمبئی پہنچنے پر اپنی پہلی تقریر میں اس محویت کا جو لارڈ ہارڈنگ نے لوگوں کے دلوں میں حاصل کر لی تھی ذکر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ان کی رائے میں کسی جانشین کی پالیسی کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ وہ اپنے سابق حاکم کی پالیسی کو قایم رکھے اور اس لئے وہ لارڈ ہارڈنگ کی تحریکوں کو حتی الامکان جاری رکھنا اپنا فرض خیال کرتے ہیں ہز ایکسیلنسی لارڈ چیمس فورڈ کا ممتاز تعلیمی زمانہ وہ تعلیمی اعلیٰ خدمات ہیں جو ممدوح نے انگلینڈ میں لنڈن کونٹی کونسل کی ممبری کے زمانہ میں کیں اور حضور کی حال کی تقریر (جو آگرہ کے میونسپل بورڈ کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے فرمائی) جس میں یہ ارشاد تھا کہ گورنمنٹ پرائمری تعلیم۔ اُستادوں کی تعلیم تعلیم نسواں کی ترقی اور یونی ورسٹی تعلیم کو پہلو بہ پہلو لانے کے لئے خاص توجہ کر رہی ہے اس امر کی کافی ضمانت ہیں کہ ممدوح کے زمانہ میں تعلیم میں نمایاں ترقی ہوگی اور ہندوستان میں تہذیب اور شائستگی بہت بڑھ جائے گی! اور سلطنت برطانیہ کا جس کی مُربیانہ حفاظت میں قدرت کے دانشمند ہاتھوں نے ۳۱ کروڑ بنی آدم کو رکھا ہے اقتدار روز افزوں ہوگا۔

ہمارا پہلا کام

حضرات! میں اس موقع پر یہ نہیں چاہتا کہ ان تغیرات پر جو گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی میں ہوتے رہے ہیں بحث کروں یا موجودہ تعلیم کی ابتدائی سلطنت برطانیہ سے جانچ کروں۔ ان مضامین پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ لارڈ میکالے کی مشہور تحریر مورخہ ۲ فروری ۱۸۳۵ء سے پہلی اور پچھلی حالت اور لارڈ ولیم بنٹنک کے عہد حکومت کا انگریزی تعلیم کے مشہور رزولیوشن مورخہ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء مسٹر محمود مرحوم کی کتاب میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں درج ہیں۔ یہ کتاب تعلیمی معلومات کا نہایت قیمتی لب لباب ہے اور اسی کی معلومات پر مختلف غیر مسلم تعلیمی کانفرنسوں کی جو موجودہ زمانہ میں تک

نوٹ ۔ عام تعلیم کے لئے سالانہ عطیہ ۱۹۱۲ء ...... ۵ روپیہ

یونی ورسٹی کے لئے سالانہ عطیہ ۱۹۱۲ء ...... ۱ روپیہ

مختلف شعبوں کے لئے سالانہ عطیہ { ۱۹۱۲ء ...... ۵۰ روپیہ
۱۹۱۳ء ...... ۹۰ روپیہ }

کے مختلف حصوں میں ہیں بُنیاد پڑی ہے۔ ان مسئلوں کو جن پر ہمارے قومی مفاد کا دارومدار ہے عملی نقطۂ خیال سے دیکھنا چاہیئے یہ ایک اصول ہے جس کو میں نے اپنے بڑے معلم (سرسید علیہ الرحمۃ) سے سیکھا ہے اور اس اصول کو میں کبھی نظرانداز نہیں کرتا حقیقی اصلاح کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری موجودہ حالت کی ٹھیک تصویر ہماری نظر میں ہو کہ ہم کو ان نقائص کا جو ہماری فوری توجہ کے محتاج ہیں پورا علم ہو۔ چونکہ اس ملک میں تعلیمی ترقی کے لئے یہ مسلّمہ ضرورت ہے کہ قوم اور گورنمنٹ مل کر اس گتھی کو سلجھائیں لہذا یہ نہایت ضروری امر ہے کہ ہم گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی سے بخوبی واقف ہوں تاکہ ہم اپنی تمام قوت کو ان کوششوں میں جو ہمارے کرنے کی ہیں صرف کریں۔ ایسا نسخہ لکھنے سے پہلے جس سے بیماری کا ازالہ یقینی ہو یہ بات ضروری ہے کہ بیماری کی تشخیص غور سے کر لی جائے۔

موجودہ حالت

اب یہ دیکھنا ہے کہ ہماری موجودہ حالت اس ملک کی پرائمری۔ سکنڈری اور یونیورسٹی کی تعلیم میں کیا ہے اور اس حالت کے متعلق بعض ایسے مسائل ہیں جو ہمارے اور گورنمنٹ کے سامنے ہیں۔ مختلف کالجوں میں تعلیم پانے والے طلباء کی تعداد ۳۱ مارچ ۱۹۱۵ء کو ۵۰۵۷۹ تھی ان میں صرف ۶۲۴۵ مسلمان تھے۔ سکنڈری مدارس میں من جملہ ۱۰۹۷۹۲۲ طلبا کے ۶۹۳۳۰۲ مسلمان تھے پرائمری مدرسوں میں کل تعداد ۵۴۴۷۸۵۰ تھی اس میں مسلمان صرف ۶۵۱۶۳۱۱/۱ تھے۔

(نوٹ) ان اعداد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں کی تعداد شامل ہے مگر وہ تعداد جو خاص اسکولوں میں یا خانگی درس گاہوں میں تعلیم پا رہی ہے شامل نہیں ہے)

اِن اعداد سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یونی ورسٹی کی تعلیم میں مسلمانوں کی تعداد کل تعداد کے ۱/۹ حصہ سے کم ہے۔ سکنڈری اور پرائمری اسکولوں میں مسلمانوں کی تعداد ان مسلمان بچوں کی تعداد کا جن کی عمر تعلیم پانے کے قابل ہے ۱/۵ حصہ سے زیادہ ہے تو اعداد مندرجہ بالا سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت تعلیم کی اعلیٰ درجوں میں نہایت ناقابل اطمینان ہے۔

گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی

موجودہ حالت بذریعہ اعداد دکھلاکر اب میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر نظر ڈالتا ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مشہور مراسلہ مؤرخہ ۱۹ جولائی ۱۸۵۴ء میں (جس کو بعض اوقات ہندوستان کا تعلیمی عہدنامہ کہا جاتا ہے) سب سے پہلے اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ تعلیمی معاملات میں گورنمنٹ کو کس قدر حصہ لینا چاہئے اور رعایا کو کیا کرنا ہے۔ اس مراسلہ میں تعلیمی پالیسی کے اصول اور ان قواعد کے بعد جن پر تعلیمی کاموں کا انحصار ہے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر گورنمنٹ ابتدائی تعلیم کو عام لوگوں کے لئے سہل الحصول کردے تو جو لوگ یا قوم اس سے زیادہ تعلیم چاہیں وہ خود بمدد گورنمنٹ یا بلا امداد گورنمنٹ[۱] اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مختار ہیں امداد کا طریقہ اس لئے قایم کیا گیا تھا کہ بذریعہ امدادی مدارس گورنمنٹ تعلیم کی اشاعت میں معین ہو۔ یہ خیال کیا گیا تھا کہ امداد کے طریقہ سے نہ صرف گورنمنٹ کا تنہا تعلیمی بندوبست بند ہو جائے گا بلکہ گورنمنٹ کی اکثر درس گاہیں بھی رفتہ رفتہ یا تو بند ہو جائیں گی یا لوکل جماعتوں کے زیر انتظام چلی جائیں گی[۲] ۱۸۸۲ء کی انڈین ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رائے ظاہر کرتے وقت سررشتہ تعلیم کے اس فرض کو جو حسب منشا مراسلہ ۱۸۵۴ء اس کے ذمہ عائد تھا نظر انداز نہیں کیا۔ اسی مراسلہ کے مطابق ڈپارٹمنٹ کا یہ فرض ہے کہ کالج اور اسکول کھولے جاویں خواہ یہ درس گاہیں بطور ماڈل (نمونہ) کے ہوں یا مقامی اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوں کمیشن کو ان اعلیٰ فوائد کا جو ہندوستانیوں نے سرکاری درس گاہوں سے حاصل کئے ہیں پورا احساس تھا۔ علاوہ ازیں اس نے یہ بھی تسلیم کرلیا تھا کہ تعلیم کے لئے خانگی کوششیں اس پیمانہ تک جس کا خیال مراسلہ[۳] ۱۸۵۴ء کی تعلیم کی اسکیم میں تھا نہیں پہنچیں۔ آخر کار کمیشن نے گورنمنٹ کی اعلیٰ تعلیم سے کنارہ کش ہو جانے کے موافق اور مخالف دلیلوں کو بیان کرکے یہ نتیجہ نکالا۔

ہماری تحقیقات اور مباحثوں سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر بطیب خاطر کہیں حقیقی خواہش ہو تو درس گاہیں سررشتہ تعلیم کے انتظامات سے نکال کر خانگی انتظامات کے ماتحت کردی جائیں

---

(۱) رپورٹ آف دی انڈین ایجوکیشن کمیشن ۱۸۸۲ء صفحہ ۳۵۵

(۲) ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۳۵۷

(۳) ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۲۸۰

مگر ہم کسی ایسے طریقہ کے اختیار کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں جس سے یہ خواہش ہو کہ گورنمنٹ فوراً یا عام طور سے اعلیٰ تعلیم کے ذرائع پیدا کرنے سے دست کش ہو جاوے۔ ہم کو یہ کامل یقین ہے کہ مندرجۂ بالا شرطوں پر کسی درسگاہ کو سرکاری انتظام سے نکال کر خانگی انتظام دیدینا مناسب اور موزوں ہے مگر یہ مقصد نہایت احتیاط سے رفتہ رفتہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہم یہ باور کرتے ہیں کہ دانشمندانہ پالیسی یہی ہوگی کہ ہر معاملہ پر اس کے واقعات کی حیثیت سے خیال کیا جاوے۔

جس وقت ہندوستانی شرفا کی کوئی جماعت کسی کالج یا اسکول کو اپنے انتظام میں لینے کی خواہش ظاہر کرے تو گورنمنٹ بشرطیکہ اس بات کی کافی اُمید ہو کہ اس تبادلہ سے تعلیم میں کچھ نقصان نہ ہوگا ایسی خواہش کو قبول کرے سررشتہ تعلیم کو ہر ایسی درخواست کو خوش آمدید کہنا چاہیئے اور اگر اس کے قبول کرنے میں اس فرقہ کا کوئی نقصان نہ ہو تو منظور کر لینا چاہیئے ڈپارٹمنٹ کا طرز عمل ایسی درخواستوں کے ترغیب دلانے میں ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ گویا وہ ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کو اپنے کندھوں سے دوسروں کے کندھوں پر پھینکنا چاہتے ہیں بلکہ اس کا طریق ایسا ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ ان لوگوں کو جو اعتبار کے قابل ہیں اور قومی تعلیم کے کام اور فکر میں خوشی سے گورنمنٹ کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں موقع دیتی ہے۔ ہم ہرگز کسی ایسے طریقہ کی جس کا اثر اشاعت تعلیم میں روڑا اٹکانا ہو سفارش نہیں کریں گے۔ صرف اس بھروسہ پر کہ بسا اوقات ڈپارٹمنٹ کے علیحدہ ہو جانے سے تعلیم کو فائدہ پہنچے گا۔ مقامی جماعت درسگاہوں میں متفقہ گہری دلچسپی لے گی اور خانگی ذرائع سے بطور امداد ایسی درسگاہوں کے قیام اور اجرا میں زیادہ روپیہ صرف کرے گی مندرجۂ ذیل سفارشیں کی جاتی ہیں۔ ہم پہلے یہ سفارش کرتے ہیں کہ سرکاری کالجوں اور سکنڈری اسکولوں کو پرائیویٹ درسگاہوں میں تبدیل کرنے سے مقامی ہمدردی اور جوش پیدا کرنے کی غرض سے یہ مناسب ہے کہ اس مقامی جماعت کو جو کسی درسگاہ کا انتظام خوشی سے اپنے ہاتھ میں لینا پسند کرے فیاضانہ امداد چند سال کے لئے دی جائے بشرطیکہ معیار تعلیم اور قیام درسگاہ کی کافی ضمانت ہو۔ کمیشن کو یہ اُمید تھی کہ اس طرح گورنمنٹ کی خواہش اعلیٰ تعلیم کو بلا کچھ نقصان پہنچائے ہوئے رفتہ رفتہ پوری ہو جائے گی ڈپارٹمنٹ کی درسگاہیں زیادہ پرائیویٹ انتظام میں چلی جائیں گی اور گورنمنٹ کا کام امداد اور نگرانی پر محدود ہو جائے گا اور ان درسگاہوں پر اختیار رہے گا۔ اعلیٰ تعلیم کی اشاعت زیادہ ہوگی مختلف قسموں کی تعلیم ہوگی اور خرچ میں بمقابلہ موجودہ حالت کے کفایت ہوگی۔ گورنمنٹ نے

رزولیوشن نمبر۱ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں کمیشن کی ان سفارشوں کو جو اعلیٰ تعلیم کے لئے رپورٹ کے فقرہ (۳۰) میں کی گئی ہیں بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ گورنمنٹ کمیشن کی ان تجاویز کو جو اعلیٰ تعلیم سے گورنمنٹ کی رفتہ رفتہ دست کشی کے متعلق دوراندیشی اور غور و خوض سے کی گئی ہیں منظور کرتی ہے۔ یہ سفارشیں گورنمنٹ کی اس پالیسی کے بالکل مطابق ہیں جو اس رزولیوشن کے جس کے ذریعہ سے یہ کمیشن مقرر ہوئی تھی فقرہ (۱۰) میں مذکور ہے ..... ان سفارشوں کا رفتہ رفتہ مقامی حالت کے مطابق نفاذ دینا لوکل گورنمنٹوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ متواتر ظاہر کیا گیا ہے گورنمنٹ کی یہ خواہش ہرگز نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کی اشاعت میں کوئی رکاوٹ ہو۔ برخلاف اس کے گورنمنٹ اعلیٰ تعلیم کی اشاعت اور ترقی کو اپنے فرض اولین میں خیال کرتی ہے۔ گورنمنٹ کی منشا یہ ہے کہ سلطنت کے محدود فنڈ کو ہر خانگی ذرائع سے تعلیم عام کے ہر شعبہ میں مدد ملے۔ اعلیٰ تعلیم کے متعلق اور ان مالی فوائد کے خیال سے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو ہوتے ہیں گورنمنٹ صحیح طور پر "اپنی مدد آپ" کرنے کے اصول پر عمل کرنا مناسب خیال کرتی ہے۔

حضرات۔ ان مندرجہ بالا احسابات سے جو سرکاری قابل وثوق مراسلات سے لئے گئے ہیں یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کا خاص اصول ہی ہے کہ ابتدائی تعلیم کی عام اشاعت گورنمنٹ خاص اپنے ذمہ رکھے اور سکنڈری اور کالج کی تعلیم کے براہ راست انتظام سے رفتہ رفتہ دست کش ہو کر امداد دے۔ نگرانی کرے۔ اور درسگاہوں کو اپنے اختیار میں رکھے۔

آپ حضرات کو گورنمنٹ کی پالیسی کا خلاصہ سنا کر میں اپنی رائے اس بارہ میں کہ تعلیم کے متعلق ہم گورنمنٹ سے کیا امید کرنے کے مستحق ہیں اور ہندوستانیوں کی تعلیم کے مقدس کام میں ہمارے فرائض جن پر میرے خیال میں ہند کے مستقبل کا انحصار ہے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

پرائمری تعلیم

حضرات! ان اعداد سے جن کا میں ذکر کر چکا ہوں یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہ صرف مسلمانوں کی تعلیم بلکہ تمام ہندوستانیوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ آپ نے یقیناً

یہ خیال کیا ہوگا کہ اگرچہ مسلمانوں نے تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے قدم رکھا مگر نمایاں ترقی کر گئے اور اگر گزشتہ ترقی کی رفتار جیسا کہ مجھے اُمید ہے قایم رہی تو نتیجہ قابلِ اطمینان ہوگا - لیکن تعلیم عامہ کے نقطۂ خیال سے جو حالت ابتدائی تعلیم کی ہے اُس کو باوجود گزشتہ سالوں کی تیز ترقی کے کوئی ہمدرد ملک بغیر تاسف کے نہیں دیکھ سکتا - میں یہاں یہ بحث نہیں کرتا کہ اگر ہندوستان کو مہذّب قوموں میں اپنی جگہ لینا ہے تو اشاعت تعلیم کی کس قدر ضرورت ہے یا حضور ملک معظم کی ہندوستانی رعایا کی خوشحالی اور بہتری کے لئے عام تعلیم کس قدر لابدی ہے اس امر کی صداقت کو گورنمنٹ نے بخوبی محسوس کر لیا ہے اور مشاہیر اس پر ہمیشہ زور دیتے رہے ہیں - حضور ملک معظم کے دہلی میں تاج پوشی کے قابل یادگار موقع پر ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ہز اکسیلنسی لارڈ ہارڈنگ نے یہ اظہار کیا تھا کہ علاوہ اور خسروانہ مراعات کے حضور ملک معظم کی خواہش اور خوشی کے مطابق گورنمنٹ نے نہایت ادب اور فرماں برداری کے ساتھ حضور شہنشاہ ہند کی منظوری سے یہ طے کر لیا ہے کہ خزانہ عامرہ پر اشاعت تعلیم کو نمایاں حق دیا جاوے اور یہ نہایت مفید اور قابل فخر حکم کی تعمیل میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ حتی الوسع تعلیم کی اشاعت ہو اور تعلیم کو ہر شخص کے لئے سہل الحصول کر دیا جاوے - اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے گورنمنٹ یہ تجویز کرتی ہے کہ مبلغ پچاس لاکھ روپیہ عام تعلیم کے لئے مخصوص کیا جاوے اور گورنمنٹ کا یہ مستحکم ارادہ ہے کہ آیندہ سالوں میں اس موعودہ رقم پر معتد بہ اضافہ کیا جاوے - ہندوستان کے بہی خواہوں کو جس قدر خوشی اور طمانیت یہ اظہار ایسے یادگار موقع پر حضور ملک معظم کے روبرو سُنکر ہوئی میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا - لارڈ ہارڈنگ کے زمانۂ دربار کے بعد کے تین سالوں میں جو روپیہ مستقل و نیز سالانہ خرچ کے لئے ملا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مستحکم وعدہ کو لفظاً لفظاً پورا کیا گیا اور اگر یہ خطرناک جنگ جس کا اثر ہندوستان کے مسائل پر انتہا درجہ تک پڑ رہا ہے نہ چھڑ جاتی تو اس میں مجھے ذرا بھی شک نہیں کہ ۱۹۱۱ء کا وعدہ پورا ہوتا رہتا - گورنمنٹ نے عام لوگوں میں ابتدائی تعلیم کی اشاعت کا فرض اپنے ذمّہ لے لیا ہے تو اب ہمارا مطمح نظر کیا ہونا چاہیئے میں نے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس اہم مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار مندرجۂ ذیل الفاظ میں کیا تھا جس سرعت اور تیزی سے تعلیم میں ہر جانب ترقی ہو رہی ہے وہ اس موجودہ حالت کی جس سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا ورق اُلٹتا ہے تشفی انگیز صورت ہے اور اس سے

ملک کو بیحد فائدہ پہنچے گا۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورتیں یہ ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے مدارس تمام ملک ہند میں جال کی طرح پھیل جائیں اور رفتہ رفتہ جہاں تک کہ ملک کی مالی حالت اجازت دے ابتدائی تعلیم مفت کر دی جائے تاکہ سب لوگ تعلیم سے مستفید ہو سکیں۔ اس زمانہ سے اب تک پانچ سال گزر چکے ہیں اور میری ناچیز رائے میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ لڑائی ختم ہونے پر ابتدائی تعلیم ہندوستان میں مفت دینے کی منظوری دی جاوے۔ گورنمنٹ میونسپلٹی اور مقامی جماعتوں کی متحدہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر شہری اور دیہاتی مفت ابتدائی تعلیم سے بآسانی متمتع ہو سکے اگر ایسا ہوگیا تو تعلیم عامہ کی ترقی ایسی جلد اور آسانی سے ہو سکے گی جیسا کہ ہندوستانی تعلیم کے شیدائیوں کا خیال ہے اور جیسا کہ جوزف بیزنی کے خیال کے مطابق میں تسلیم کرتا ہوں ایک آئیڈیل اسٹیٹ میں ہونا چاہئے جبریہ تعلیم واجب ہوگی۔ میں اپنے دوست آنریبل مسٹر جسٹس عبدالرحیم کے پونا کانفرنس کے سال گزشتہ کے پریزیڈنشل ایڈریس کے اس بیان سے بالکل متفق ہوں کہ اگر فی الحال مدارس کی تعداد کافی بڑھادی جاوے تو اس امر پر غور کرنے کا کہ آیا جبریہ تعلیم کا قانون بنایا جاوے یا نہیں کافی موقع ملے گا۔

مسئلہ زبان

تعلیم عامہ کے مسئلہ کو زبان کے مسئلہ سے جس پر کافی بحث ہو چکی ہے گہرا تعلق ہے۔ میں نے اپنی رائے اس مسئلہ پر جولائی ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا اُردو کانفرنس پونا کی صدارتی تقریر میں پورے طور پر آزادانہ ظاہر کر دی ہے۔ ہر صحیح الخیال آدمی کو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ پرائمری مدارس میں مختلف زبانیں خواہ وہ مقامی لحاظ سے ہوں یا مختلف قوموں کے خیال سے مختلف لوگوں کو متحد کرنے کی کارروائی میں جو ملک کی آیندہ بہتری کے لئے نہایت ضروری ہے حارج ہوں گی۔ اُردو جو درحقیقت ہندوستان کی عام زبان ہے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اتحاد سے صدیاں گزریں پیدا ہوئی تھی۔ ہر وہ کوشش جو اُردو زبان کے خلاف ہوگی یقیناً نااتفاقی پر منتج ہوگی اور ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے لئے بربادکن ثابت ہوگی۔ جیسا کہ میں نے پونا میں کہا تھا ایسی پالیسی ملک معظم کی رعایا کے مختلف گروہوں کو قریب قریب متحد کر کے ایک بنانے کی بجائے بیگانگی کی خلیج کو اور چوڑا کر دے گی

اور ایسے معاندانہ احساسات اور متضاد خواہشات پیدا کرے گی جن کا بڑا اثر ہندوستان کی آیندہ ترقی پر ہوگا اس وقت اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ تمام ملک کے فائدے کی غرض سے درس گاہوں کی زبان اُردو کم از کم شمالی ہندوستان میں رہنی چاہیئے اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے قدیم فیصلہ کو دیانت داری سے قایم رکھنے پر زور دینا چاہیئے تاکہ مختلف فرقوں میں وہ اتحاد جو ملک کی آیندہ بہبودی کے لئے جزو لاینفک ہے پیدا ہو۔

سکنڈری تعلیم

حضرات! جو کچھ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اُس سے یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے جو ترقی سکنڈری تعلیم میں کی ہے وہ ناقابل اطمینان نہیں ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کے لحاظ سے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں ہماری آیندہ ترقی ہماری قومی کوششوں پر منحصر ہے جن میں گورنمنٹ بھی ہم کو کافی امداد جس کا وہ مستحکم وعدہ کر چکی ہے دے گی چنانچہ ہز آنر سر مائکل اوڈائر کی گورنمنٹ جس کی ہمدردانہ پالیسی کی وجہ سے باوجود اس وقت کی مشکلوں کے ۲۵۴۴۱۳ روپیہ پنجاب کے مختلف اسلامی پرائیویٹ درسگاہوں کو ملا شکریہ کی مستحق ہے مجھے اس میں کچھ شک نہیں کہ گورنمنٹ ہند کی مقررہ پالسی کی بموجب ایسی ہی امداد دوسرے صوبوں میں بھی ضرور ملی ہوگی۔ درحقیقت میرے خیال میں یہ بات صاف ہے کہ گورنمنٹ کی رفتہ رفتہ اعلیٰ تعلیم سے کنارہ کشی کی پالیسی کی وجہ سے یہ گورنمنٹ کا فرض ہوگیا ہے کہ وہ پرائیویٹ کوششوں میں فیاضانہ امداد دے۔ دوسرے الفاظ میں میں یہ کہوں گا کہ گورنمنٹ کی متذکرہ بالا پالیسی گورنمنٹ کو اس کے اس فرض سے کہ وہ خزانہ عامرہ کا کافی حصہ ہماری تعلیم میں صرف کرے سبکدوش نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہے مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے مختلف قوموں کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی جاتی ہیں اور اس لئے یہ ظاہر ہے کہ ایک باقاعدہ کوشش درکار ہے۔ میں بذات خود یہ پسند کروں گا کہ ہندوستان کے ہر ضلع میں کم از کم مسلمانوں کا ایک ہائی اسکول جس کا انتظام معقول ہو اور جس میں آلات و سامان کافی ہوں موجود ہو تاکہ مختلف یونیورسٹیاں اپنے ملحقہ اسکولوں سے یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے مسلمان طلبہ لے سکیں۔

عام تعلیم یونیورسٹی

حضرات! قبل اس کے کہ میں یونیورسٹی تعلیم کی بابتہ جہاں تک ہماری قوم کا تعلق ہے بیان کروں میں چند الفاظ اس مسئلہ پر عام نقطۂ خیال سے کہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ حضرات واقف ہیں

اس وقت برٹش ہندوستان میں چھ ۶ یونی ورسٹیاں ہیں ان کے علاوہ پٹنہ یونی ورسٹی کا بل حال ہی میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پیش ہو چکا ہے - رنگون ڈھاکہ ناگپور اور پونا میں یونیورسٹیاں قایم کرنے کی تجویز زیر غور ہے - یہ صاف ظاہر ہے کہ اس قدر قلیل تعداد یونی ورسٹیوں کی ہندوستان جیسے ملک میں جس کا رقبہ سلطنت روس کے رقبہ کو نکال کر باقی تمام یورپ کے برابر ہے اور جس کی آبادی ۳۱ کروڑ ہے ملک معظم کی ہندوستانی رعایا کی تعلیمی ضروریات کے لئے کافی نہیں - اس وقت یونائیٹڈ اسٹیٹ امریکہ میں ۱۳۴ یونی ورسٹیاں ہیں - یونائیٹڈ کنگڈم میں ۱۸ فرانس میں ۱۵ اٹلی میں ۲۱ اور جرمنی میں ۲۲ یونی ورسٹیاں ہیں جب ہم اُن اعداد پر نظر ڈالتے ہیں اور ان ملکوں کے رقبوں کو ہندوستان کے رقبہ سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اور معتدبہ یونی ورسٹیاں قایم کرنے کی ضرورت محتاج بیان نہیں رہتی - اگر کسی صاحب کو ہنوز ۱۸۳۵ء کے اس فیصلہ کے متعلق جو مشرقی اور انگریزی تعلیم کے مقابلہ میں ہوا تھا دانشمندانہ ہونے میں شک ہو میں اُن سے نہایت سرگرمی سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس وضع کو چھوڑ دیں کیونکہ ایسا خیال موجودہ حالت میں ملک اور سلطنت کے بہترین فوائد کو یقیناً ضرر رساں ہے - اس سے غیر ضروری اور مضر غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور تعلیم کی چلتی ہوئی گاڑی کے پہیہ میں روڑا اٹکتا ہے - اگر ایسے حضرات ایک ایسے فیصلہ پر جس کی نظر ثانی نہیں ہوسکتی اپنا وقت خراب کرنے کی بجائے اپنی توجہ اور طاقت کو قدرتی سرگرمیوں کو سیدھے راستہ پر لے چلنے میں یا ان مغربی علوم وفنون کی تحصیل میں جو ۱۸۳۵ء کی گورنمنٹ کی پالسی کے مطابق تمام ہندوستان میں پھیل گئے ہیں صرف کریں تو یہ ملک معظم کی ہندوستانی رعایا کی (جو سلطنت برطانیہ میں ۷۰ فی صدی ہے) تعلیم اور تہذیب کی حقیقی خدمت ہوگی - کیا کوئی محدود ایک قاعدہ ایسا ہوسکتا ہے جس پر ہماری ہندوستانی یونی ورسٹیاں نہیں - ہم سے زیادہ کوئی ریزیڈنشل (مقامی) یونی ورسٹی کے فوائد کو محسوس نہیں کرتا بلکہ یہ طریقہ اسلام کی پرانی تعلیمی روایتوں کا ایک جزہے تمام قدیمی مسلم یونی ورسٹیاں بغداد قرطبہ اور نیز مسلمانوں کے تمام مشہور تعلیمی مرکز جو سنہ ہجری کی شروع صدیوں میں قایم ہوئے رزیڈنشل اصول پر قایم ہوئے لیکن ہندوستان جیسے وسیع ملک میں مختلف مقامی اور قومی ضرورتوں کے لحاظ سے یہ مجبوری ہے کہ ہماری تعلیمی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاویں اور اس لئے کوئی غیر تغیر پذیر قاعدہ یونی ورسٹیاں قایم کرنے کا مقرر نہیں ہوسکتا اس امر کی صداقت کو گورنمنٹ نے بھی تسلیم کرلیا ہے چنانچہ صوبہ بہار کے لئے

گورنمنٹ ایسی یونی ورسٹی منظور کرنے والی ہے جو رزیڈینشل بھی ہوا ور امتحان لینے والی بھی - اور باہر کے کالجوں کا الحاق کر سکے - مگر ڈھاکہ میں صرف رزیڈینشل یونی ورسٹی قایم کرنے کی تجویز ہے میں اس موقع پر پٹنہ یونی ورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق جس کا یل آنریبل سرسنکرن نایر نے حال ہی میں پیش کیا ہے اپنی رائے ظاہر کرنی نہیں چاہتا کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے جس کی بابتہ ممکن ہے مجھے لیجسلیٹو کونسل میں بحث کرنی پڑے - مگر یہ کہنا میرے لئے جائز ہے کہ پرانی یونی ورسٹیوں کے لئے جب یونی ورسٹی ایکٹ سنہ ۱۹۰۴ء کے ترمیم شدہ کانسٹی ٹیوشن سے پٹنہ یونی ورسٹی کے بل میں اہم اختلافات سینیٹ اور وائس چنسلر کے اختیارات اور سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے تعلقات کے متعلق ایسے پیچھے ہٹانے والے ہیں جن میں قبل اس کے کہ یونیورسٹی بل ترقی کرنے والے تعلیم یافتہ گروہ کے نزدیک قابل قبول ہے بہت سے تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں یونیورسٹی تعلیم

حضرات! یونی ورسٹی تعلیم کے متعلق عام نقطہ خیال سے اپنی رائے ظاہر کرنے کے بعد اب میں یونیورسٹی تعلیم کے چند ان مسائل پر جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے گفتگو کرتا ہوں - یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں اگر وہ ملک کی ذہنی ترقیوں میں اپنی جگہ جس کے وہ مستحق ہیں قایم رکھنا چاہتے ہیں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کی کیسی سخت ضرورت ہے - جیسا کہ میں نے سنہ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر لکھنؤ میں بیان کیا تھا - ہندوستان کے ملکی واقعات برقی سرعت کے ساتھ چل رہے ہیں اور ترقی کرنے والی قوم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس حالت میں زمانہ کی رفتار کے قدم بقدم چلے - اگر آپ حضرات قوم کے سچے دل سے خیرخواہ ہیں تو کیا مسلمانوں کی موجودہ حالت کو جبکہ اُن کی تعداد کالجوں میں ۱/۲ حصہ سے کم ہے اطمینان کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں - مسلمانوں میں یونی ورسٹی تعلیم کے لئے سب سے زیادہ کوشش درکار ہے یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ موجودہ زمانہ میں کسی قوم کی پولیٹیکل طاقت کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ اُس کے افراد کی زیادہ تعداد یونی ورسٹی کی تعلیم حاصل کریں - جس قدر یونی ورسٹی کی تعلیم زیادہ ہوگی ایگزیکٹیو اور جوڈیشل معاملات میں حصہ ملے گا اور اُسی کا اثر قانون سازی پر پڑے گا - جو واقعات انگلینڈ میں ہو رہے ہیں اور جو واقعات ہندوستان میں گزشتہ چوتھائی صدی سے پیش آ رہے ہیں اُن پر غور کرنے سے مجھے یہ کامل یقین ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عظیم الشان

مستقبل میں مسلمانوں کا حصہ ان کی اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہوگا۔ ہمارے سامنے ایک درحقیقت مشکل کام ہے۔ ہم کو نہ صرف اپنی غفلت کی تلافی کرنی ہے بلکہ دیگر قوموں کے جو تعلیمی رفتار میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ ہم کو مستعد ہو جانا چاہئے اور منزل مقصود پر پہنچنے کی باقاعدہ کوشش کرنی چاہئے۔ گورنمنٹ ہند ہمارے پیچھے رہجانے کی وجہ سے ہماری ہمت بڑھانے اور ہم کو خاص امداد دینے کی ضرورت کو سمجھتی ہے اُس نے بذریعہ حکم نمبری ۵۸۵ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۳ء لوکل گورنمنٹ کی توجہ اس امر پر دلائی ہے کہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ کو صاف صاف یہ بتلا دیں کہ کن خاص امور میں ہم کو سلطنت کی مدد درکار ہے اور اپنی ان قومی ضرورتوں کو سمجھیں جو ہماری ذاتی کوششوں پر منحصر ہیں۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں مسلمان نمایندے

حضرات! جو مختلف یونی ورسٹیاں ہندوستان میں ہیں اُن کا نظم ونسق قانون ملکی کے مطابق انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اُن کی انتظامی جماعت میں مسلمانوں کے نمایندے کافی تعداد میں ہوں۔ اس معاملہ میں غفلت کرنے کا اثر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے سخت مضرت رساں ہونا ضروری ہے۔ گورنمنٹ نے اس مراسلہ کے فقرہ (۳) میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں یہ تسلیم کرلیا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ہماری یونیورسٹیوں میں بہت کم اور ناکافی ہے پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کا ۵۵ فی صدی ہے سینیٹ کے ۵۰ فیلوز میں ۱۷ مسلمان ہیں کلکتہ یونی ورسٹی میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کے خیال سے اور اُن کی تعلیمی حالت کی پستی کے خیال سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے نمایندے کافی ہوں سینیٹ کے ایک سو معمولی ممبروں میں کل ۶ مسلمان ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے سینیٹ میں ۸۱ میں سے ۱۲ مسلمان فیلو ہیں۔ بمبئی میں ۸۸ میں سے ۷ مسلمان اور مدراس میں ۱۰۱ میں کل ۴ مسلمان ہیں ان اعداد سے یہ قطعی ثابت ہے کہ یونیورسٹیوں کی انتظامی جماعت میں مسلمانوں کے نمایندے کافی نہ ہونے کی شکایت بالکل بجا ہے اور اس شکایت کے جلد رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ کانفرنس کی جانب سے میں نہایت ادب سے اپنی یونی ورسٹیوں کے چینسلروں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے فوائد کی حفاظت کے لحاظ سے سینیٹ میں کافی مسلمان نمایندے

رکھے جائیں اور امید کرتا ہوں کہ ہماری اس درخواست پر توجہ کی جائے گی۔

وظائف فنڈ

حضرات! مسلمانوں میں یونیورسٹی تعلیم کی کمی کا بڑا باعث اوسط درجہ کے طبقہ کے لوگوں کا افلاس ہے۔ اس طبقہ کے لوگ بوجہ اپنی کم آمدنی کے اور کسی قدر بہتر طرز معیشت کے کالج کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنے سے مجبور ہیں اور اس لئے اپنے بچوں کو میٹریکیولیشن سے زیادہ تعلیم نہیں دلا سکتے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں لوکل گورنمنٹوں نے کچھ وظائف مسلمان طلبا کے لئے مخصوص کرائے ہیں اور گورنمنٹ ہند نے اپنے اس مراسلہ کی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں دفعہ ۵ میں مسلمانوں میں اس طریقے سے تعلیم بڑھانے کی جانب توجہ دلائی ہے۔ ہم گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹوں کی اس ہمدردانہ پالیسی کے شکرگزار ہیں۔ لیکن ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وظیفہ کی مدبھی ان خانگی کوششوں کا جن کی سخت ضرورت ہے ایک ممیز جزو ہے۔ غریب اور ہونہار مسلمان طلبا کےلئے یونی ورسٹی کی تعلیم کے لئے مختلف صوبوں میں وظائف فنڈ قایم کرنے کی کوشش ایک ایسی قومی خدمت ہے جس سے میرے خیال میں بہترین نتائج مرتب ہوں گے۔ اس جانب پیشقدمی کرنے کا فخر بلاشبہ انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرتسر کو حاصل ہے اس انجمن نے ۱۹۱۰ء سے (جب سے یہ انجمن قایم ہوئی) ۳۲ مسلمان طلبا کو تعلیم کے مختلف شعبوں میں وظائف دیئے۔ اس انجمن کی وطن پرستی کی کوششیں شکریہ کی مستحق ہیں۔ اس وقت اس انجمن کے صرف سے ۹۳ مسلمان طلبا مختلف کالجوں اور اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور انجمن کا بحساب اوسط مبلغ ایک ہزار روپیہ ماہوار خرچ ہو رہا ہے۔ آل انڈیا کشمیری کانفرنس نے جس کا صدر مقام لاہور ہے اپنی ہستی کے بہت مختصر زمانے میں ۲۶ مسلمان طلبا کو وظائف دیئے ہیں۔ انجمن راعیان سندھ۔ لاہور نے گزشتہ ۱۸ ماہ سے وظائف کا فنڈ قایم کیا ہے اور ۱۰۲ مستحق طلباء کو کالجوں اور اسکولوں میں وظائف دیئے جا چکے ہیں۔ تمام ہندوستان میں ایسے وظائف کے فنڈ کی کثرت سے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے مختصر زمانہ میں نہایت مفید نتائج نکلیں گے اور مسلمانوں کی دماغی ترقی کے لئے ایک زبردست محرک ہو گی۔ یہ تعلیم کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی جانب ہمارے دولتمند طبقہ کے لوگوں نے گزشتہ سالوں میں کافی توجہ نہیں کی اگر تعلقہ داران اودھ۔ بمبئی کے تاجر شہزادے۔ بنگال کے وہ زمیندار جن کے علاقوں میں بندوبست استمراری ہے اور اور مختلف صوبوں کے خوش گزران اصحاب اپنی دلی توجہ کو مستحق مسلمان

طلباء کو یونیورسٹی کی تعلیم دلانے میں لگائیں تو یہ قوم کی بہت ہی بڑی خدمت ہوگی۔ شب برا کے موقع پر ہندوستان کے مسلمان کم از کم پانچ چھ لاکھ روپیہ ایک رات میں آتشبازی میں خراب کر ڈالتے ہیں۔ اگر کوئی باقاعدہ کوشش کی جاوے اور ہر شہر کے مسلمانوں کو یہ ترغیب دی جائے کہ جس قدر روپیہ وہ اِس طرح فضول برباد کر ڈالتے ہیں، وظائف فنڈ کی ترقی کی اسکیم میں لگا دیں تو مسلمانوں کی تعلیم کو ایک اہم فائدہ پہنچے گا۔

مسلم یونی ورسٹی

حضرات! میں نے اب تک مختلف مسائل پر تقریر کرنے میں آپ صاحبان کو مشغول رکھا۔ اب میں اُس مسئلہ کے متعلق جس کو اکثر وہ حضرات جو اس عالیشان ہال میں موجود ہیں بہت اہم سمجھتے ہیں گفتگو کرتا ہوں۔ تاریخ ۴ فروری ۱۹۱۶ء کو بنارس میں جو کہ (مشہور تاریخی شہر ہے) اس کثیر جماعت کی موجودگی میں جس میں والیانِ ریاست۔ صوبوں کے گورنر۔ یونی ورسٹیوں کے چانسلر۔ امپیریل اور لجیسلیٹو کونسلوں کے ممبر اور ہزاروں ہندو اصحاب شامل تھے لارڈ ہارڈنگ نے ہندو یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس دن میں نے اپنے معزز اور قابل دوست ڈاکٹر سندر لال صاحب کو اپنے صوبہ کے مسلمانوں کی جانب سے اپنے ہندو بھائیوں کو اُن کی دلی تمنّا بر آنے پر مبارکباد کا تار دیا تھا۔ اُس دن صبح کو میرے دل میں جو خوشی اور رنج کی ملی ہوئی کیفیت تھی بیان کرنا ممکن نہیں۔ میں ہندو برادرانِ وطن کی قومی خواب کی خوشگوار تعبیر ملنے سے خوش تھا۔ مگر یہ خیال کہ مسلمان جن کے دماغ میں قومی یونی ورسٹی قایم کرنے کا خیال پہلے پیدا ہوا اور جنھوں نے علی گڑھ تحریک کے بانی کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تھی کامیاب نہ ہوئے میرا دل ٹکڑے کئے ڈالتا تھا۔

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند دو چار ہات جبکہ لبِ بام رہ گیا

اُسی روز سے جس روز لارڈ لٹن نے ۱۸۷۶ء میں اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھا تھا ہمارے معزز قومی لیڈر سرسیّد علیہ الرحمۃ کا ہر فعل اور اُس قومی مرکزی درس گاہ کا ہر حصہ بلکہ ہر ایک اینٹ جو اس کمرہ میں لگی ہے یہ پیشگوئی کر رہی تھی کہ آخر کار یہ درس گاہ جیسا کہ سر انٹونی میکڈانل نے فرمایا تھا مشرق کا قرطبہ ہوگی۔ مگر کُل امر مرہونٌ باوقاتہا یہ مقدر تھا کہ وہ یونی ورسٹی جس کا قومی یونی ورسٹیوں میں پہلا نمبر ہونا چاہئے تھا پچھلے نمبر پر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ واقع ہوا

اُس کے کون ذمہ دار ہیں اور کس حد تک - مجھ سے بڑھ کر اس بات کی خواہش کوئی نہ رکھتا ہو گا کہ ہماری قومی یونی ورسٹی علی گڑھ میں ہو اور اس کو بیرونی کالجوں کے الحاق کا پورا حق حاصل ہو نہ مجھ سے زیادہ کوئی یہ چاہتا ہو گا کہ ہم کو اپنی یونیورسٹی کے اندرونی معاملات میں پورا اختیار رہے مگر میں اس پالیسی کو کہ "سب ہو یا کچھ نہ ہو" سمجھنے سے قاصر ہوں - اگر گورنمنٹ اس وقت کالجوں کا الحاق بوجوہ جن کو وہ خود سمجھ سکتی ہے منظور کرنے کے لئے تیار نہیں تو کیوں اس شرط کے مان لینے سے قطعی انکار کیا جاتا ہے درآنحالیکہ اس وقت اسلامیہ کالج بھی الحاق کے لئے نہیں تھے - اگر اس خیال سے کہ ابھی تجربہ کی حالت ہے گورنمنٹ وہی اصول امداد - نگرانی اور اقتدار قایم رکھنے کو جو بنارس یونی ورسٹی ایکٹ میں ہیں ضروری خیال کرتی ہے تو کیوں اس قدر لینے سے جس قدر ہمارے ہندو بھائیوں نے جو میدانِ عمل میں ہم سے بہتر ہیں لیا ہے انکار ہے - درآنحالیکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری تعلیم کے لئے موجودہ یونی ورسٹیوں کا اقتدار جس میں بہت زیادہ تعداد غیر مسلم آفشل سرکاری اور نان آفیشل (غیر سرکاری) ممبروں کی ہے زیادہ سخت ہے سلطنت روم ایک دن میں نہیں بن گئی تھی اور نہ لارڈ ہارڈنگ کی گورنمنٹ کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے قطعی ہے اب یہ سوال اختلافات کی حد سے گزر چکا ہے - ہندو یونیورسٹی ایک طے شدہ معاملہ ہو گیا ہے مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن و نیز فاونڈیشن کمیٹی نے طوعاًو کرہاً ان شرائط کو جن پر ہمارے ہم سے زیادہ خوش قسمت ہندو بھائی اپنا مقصد حاصل کر چکے ہیں اُصولاً قبول کر لیا ہے - ان کو اب تک حیص وبیص خاص اس لئے تھا کہ بنارس یونیورسٹی کے قواعد ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہوئے تھے - اب یہ قواعد شائع ہو گئے ہیں - میں نے اُن قواعد کو غور وخوض سے اپنے گزشتہ ۱۸ سال کے اُس عملی تجربہ کی بناپر دیکھا جو مجھ کو فیلو ہونے کی حیثیت سے سنڈیکیٹ کی ممبری سے اور پنجاب یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے کنوینیر ہونے کے زمانہ میں ہوا ہے - مجھے اس کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ یہ قواعد اس طریقہ کی جس پر ہندو یونیورسٹی قایم ہوئی امتحاناً علی اسکیم کے لئے خاصے ہیں - ہماری قوم کی ضرورتیں خاص ہیں ہماری حالت بھی خاص ہی ان وجوہ سے یہ ضروری ہے کہ مسلم یونی ورسٹی کے ایکٹ میں خاص قواعد ہماری ضرورتوں کے لحاظ سے رکھے جاویں - چونکہ گورنمنٹ کی پالیسی مسلمانوں کی تعلیم کی جانب ۱۷۸۱ء سے جب کلکتہ میں مدرسہ قایم ہوا اب تک رہی ہے مجھے پوری اُمید ہے کہ گورنمنٹ یونیورسٹی کے قواعد بنانے میں ہماری مخصوص ضرورتوں اور احتیاجوں کا

خیال رکھے گی۔ گورنمنٹ سے اور قوم سے میری یہ دلی درخواست ہے کہ اس اہم معاملہ کو جلد طے کرلیا جائے تاکہ دونوں بہن بہن یونیورسٹیاں اپنا وہ اعلیٰ کام جو ہندوستان کے حق میں بے حد مفید ہوگا ساتھ ساتھ شروع کردیں گورنمنٹ یونیورسٹیاں بوجہ مذہبی تعلیم سے سخت غیر جانب داری کی پالیسی کے ہماری روحانی ضرورتوں کو مہیا نہیں کرسکتیں اور صرف دنیوی تعلیم مذہبی تعلیم سے الگ تھلگ رہ کر جو نتیجے پیدا کرتی ہے وہ قابل اطمینان نہیں ہیں۔ ہم کو صرف گریجوائیٹوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم مسلمان گریجویٹ چاہتے ہیں جنھوں نے روحانیت کے اثر میں نشو و نما پائی ہو ایسے گریجویٹ یقیناً خود دارا اور دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑی سلطنت کے وفادار شہری ہونگے اب ہم کو یہ اندوہناک باب جس نے ہماری قوم کو عرصہ سے دو حصوں میں منقسم کر رکھا ہے بند کردینا چاہیئے اور ہم کو نہ صرف پوری کوشش اپنی تعلیم کو نیا جامہ پہنانے کی کرنی چاہیئے بلکہ وہ باہمی اتفاق جس پر ہماری قومی ہستی کا دار و مدار ہے قایم کرنا چاہیئے۔

تعلیم صنعت و حرفت

حضرات! صرف ایک اور مسئلہ باقی ہے جس کے متعلق بیان کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ یہ مسئلہ ہندوستان کی بہتری کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً بہت ضروری ہے۔ اگر زمانہ موجودہ کی تاریخ پر نظر غائر ڈالی جائے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا میں قوموں کا اقتدار اُن کی دیگر اقوام کے ساتھ تجارت کی نسبت سے ہوتا ہے۔ باشندوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ ان صنعتوں اور حرفتوں کو جن کے لئے ملک اپنے قدرتی وسائل کی وجہ سے سب سے زیادہ موزوں ہو ترقی دیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بمقابلہ دیگر قومی کاموں کے صنعت و حرفت کے کاموں میں گورنمنٹ اور باشندوں میں زیادہ ہمدردی اور دلی یکجہتی کی ضرورت ہے۔ جو لوگ اس بین الاقوامی طوفان کی رفتار کو جو تمام دنیا میں پھیل رہا ہے غور سے دیکھ رہے ہیں اُن پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اس خوفناک جنگ کے ختم ہونے پر گورنمنٹ کے اندرونی اور بیرونی ایکانومیکل (اقتصادی) پالیسی میں عظیم الشان تغیرات ہوں گے۔ اور یہ تغیرات سلطنت برطانیہ کے دوسرے ملکوں کے دوش بدوش ہندوستان کی صنعت و حرفت کے لئے زبردست محرک ہوں گے۔ جو انڈسٹریل کمیشن، ملک کے مختلف حصوں میں تحقیقات کر رہی ہے اس کا تقرر اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ہماری گورنمنٹ ہندوستان کی صنعت و حرفت کے نہایت اہم مسئلہ کے متعلق اپنی ذمہ داری کما حقہ محسوس کر رہی ہے اور مجھے یہ قوی اُمید ہے کہ اس تحقیقات

کے بعد ہندوستان کی صنعت و حرفت کا نیا دور شروع ہوگا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی حالت پر نظر کرنے سے یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے مختلف فرقے صنعت و حرفت میں ساتھ ساتھ ترقی کریں اِس لئے مسلمانوں کو اس ضروری اور اہم مسئلہ کی جانب اپنی پوری توجہ دینی فرض ہے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے کہ اس ملک میں ہماری پولیٹکل کمزوری ہماری صنعتی اور تجارتی پستی کی وجہ سے ہے۔ اس معاملہ میں ہماری گزشتہ غفلت ایک ناقابل معافی تقصیر ہے اور آیندہ غفلت خودکشی کی مرادف ہوگی۔ زمانہ موجودہ میں کسی قوم کی دولت کا انحصار صنعت اور تجارت کی ترقی پر منحصر ہے اور دولت پولیٹکل طاقت کی کنجی ہے۔ ہر گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ ایسے وسائل پیدا کرے جن سے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو قابل اطمینان ترقی ہو۔ مسلمانوں کے لئے دیگر اقوام سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ صنعت و حرفت کی ترقی میں باقاعدہ کوشش کی جائے۔ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں صنعت و حرفت کے کالج اور سکول قایم کرنے چاہئیں اور گورنمنٹ کے ساتھ ساتھ اس معاملہ میں پبلک کی انفرادی کوشش اور باقاعدہ جماعتوں کی متحدہ کوشش خصوصاً مسلمانوں کی جماعت کی سب سے بڑی ضرورت موجودہ زمانہ کا ساتھ دینا ہی ٹھیک وقت پر کوشش ہونے سے یقیناً اچھے نتیجے مترتب ہوں گے اور وقت پر غفلت کرنے سے ضرور ایسے بڑے نقصانات ہوں گے جن کی تلافی کچھ نہ ہوسکے گی میں ہندوستان کے اُن تمام مسلمانوں کی جو کچھ کام کر رہے ہیں اس اشد قومی ضرورت پر پوری توجہ دلانے کی جرأت کرتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ ایسے صاحبان مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے جلد عملی کارروائی کریں گے۔ اور اُن کو اس اہم معاملہ میں اُن کے اُن فرائض کی تعمیل کے لئے جن پر اُن کی اور آنے والی نسلوں کی نئی زندگی کا انحصار ہے آمادہ کریں گے۔

حضرات! جو کام مسلمانوں کے پیشِ نظر ہے وہ بلاشبہ بہت بڑا کام ہے۔ لیکن اگر ہم کو قومی فرائض کا پورا احساس ہو اور ان کاموں کے کرنے کی جو ہماری علمی اور مالی ترقی کے جزو لاینفک ہیں سچی اور دلی خواہش ہے تو ایسا کوئی بھاری کام نہیں ہے جو ہماری قوم نہ کرسکے۔ ہندوستان جیسے ملک میں اور اس زمانہ میں جب کہ قومی زندگی کے ہر قدم پر بین الاقوامی مقابلے موجود ہیں اُس قوم کی طاقت جو مردم شماری کے لحاظ کم ہو اُن کے

باہمی اتفاق پر منحصر ہے ۔ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنا وہ وقار جس کے وہ اپنی گزشتہ تاریخ سے مستحق ہیں قایم رکھنا چاہتے ہیں اور اُن کی یہ خواہش ہے کہ صرف تعداد کی کمی سے اُن کے حقوق نظر انداز نہ ہوں تو اُن کا یہ فرض ہے کہ وہ مستعد ہو جایئں ۔ میں اپنے ہم قوموں سے نہایت زور کے ساتھ یہ التجا ر کرتا ہوں کہ ہم اُن طاقتوں کا جو ہمارے قابل فخر اتحاد اور یگانگت پر منحصر ہے جس کی بنیاد دہائی چارہ کے اس مضبوط چٹان پر ہے جو گزشتہ تاریخوں میں عدیم المثال ہے رخنہ انداز نہ ہوں اور مستعد ہو کر مقابلہ کریں ۔ بین الاقوامی مقابلہ کے طوفان میں ہم صرف مستعد ہو کر قایم رہ سکتے ہیں اور اگر اتحاد نہ ہوگا تو ہم اس طرح فنا ہو جایئں گے کہ پھر شاید کبھی نہ اُبھر سکیں گے ۔

آخر میں آپ صاحبان کی طرف سے میں نہایت احسان مندانہ شکریہ ہز ہائینس حضور پر نور نظام حیدرآباد کا ادا کرتا ہوں حضور عالی کے شاہانہ عطیہ ۰۰ ۱۷٫۵ کے گورنمنٹ پرامیسری نوٹ جن کی سالانہ آمدنی چھ ہزار روپیہ ہے اس کانفرنس کی بنیاد مستقل کرنے میں بہت معین ہوگا ۔ حضور کی علی گڑھ تحریک کے پچھلی مربیانہ حمایت نے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا بے حد شکرگزار بنا لیا ہے ۔ جو گراں قدر عطیہ آپ نے کانفرنس کو اور دکن کے مجوزہ کالج کو مرحمت فرمایا ہے اس امر کی پوری ضمانت ہے کہ ہز ہائینس مسلمانوں کی تعلیم سے جن کے وہ بلاشبہ سب سے بڑے ریپریزنٹیٹو ہیں اس ملک میں دلچسپی رکھتے ہیں ۔

نیز اس فیاض لیڈی کا احسان مندانہ شکریہ ادا کرتا ہوں جس کی عظیم الشان فیاضی نے اور مسلمان مرد و عورت کی تعلیم کی سچی محبت نے اس کانفرنس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے لئے ایسا عظیم الشان مکان جو اُس کی شان کے شایاں ہے بنا سکے ہر ہائینس بیگم آف بھوپال کی گہری دلچسپی ہے جو حضور علیا ہندوستان کے ہر حصہ کے مسلمانوں کی تعلیم کی بہتری میں فرماتی ہیں اور اُن گراں قدر عطیوں نے جو وقتاً فوقتاً مختلف اسلامی درس گاہوں کو عطا ہوتے رہتے ہیں تمام مُلک کے مسلمان احسان مندوں میں جگہ پیدا کر لی ہے ۔ ہندوستان کی اسلامی جماعت احسان کے اس بار عظیم کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو اُن پر دیر ہائی نسز کا ہے اور نہ اس سے کسی طرح سبک دوش ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ اُس ذات پاک کی جناب میں جو ہر خیر و برکت کا لازوال منبع ہے محدوحین کی صحت و عافیت کے لئے صمیم قلب کے ساتھ دعا کریں ۔ آمین

تمام شد

التربیۃ الاستقلالیہ

مندرجۂ بالا کتاب فن تعلیم و تربیت کے متعلق ایک مشہور و مستند کتاب ہے یہ کتاب فرانسیسی زبان میں تالیف ہوئی ہے جس کا نام

"اُنیسویں صدی کا ایمل"

تھا۔ کتاب ایسی مفید و کار آمد سمجھی گئی کہ مصر کے یگانۂ روزگار علامہ مفتی محمد عبدہ نے ہربرٹ اسپنسر کی مشہور کتاب کے بعد اس کو ترجمہ کے لیئے انتخاب کیا۔ اور علامہ ممدوح کی تحریک سے مصر کے مشہور رسالہ المنار میں اس کا ترجمہ شائع ہونے لگا جو بہت پسند کیا گیا اور آخر کار ریاض پاشا وزیر مصر کی تحریک سے مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہوا اور مقبول ہوا۔ اُس وقت سعد پاشا زاغلول مصر میں وزیر تعلیم تھے اُنھوں نے سرکاری طور پر اس کتاب کو ٹریننگ کے طلبا کے لیئے تجویز کیا۔ اور تھوڑی مدت میں اس کتاب کے دو ایڈیشن عربی میں شائع ہوئے۔

اب جناب مولنا **محمد حبیب الرحمن خاں** صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی تحریک سے ہندوستان کے مشہور انشا پرداز مولنا عبدالسلام صاحب ندوی نے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا جس کو حال میں کانفرنس نے شائع کیا یہ ایسی مفید کتاب ہے کہ کوئی شخص اس کے مطالعہ سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اساتذہ و والدین بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق اس سے بیش بہا معلومات اور صحیح طریقۂ تعلیم و تربیت معلوم کر سکتے ہیں۔ اور عمدہ تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہماری آیندہ نسلوں کی فلاح و ترقی کا انحصار ہے کتاب کی ضخامت مع دیباچہ ۳۲۰ صفحے کاغذ سفید تقطیع ۲۰ × ۲۶ قیمت ــــــــــــ (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

وقارِ حیات

یعنے

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی حاجی محمد مشتاق حسین صاحب سابق ریونیو سکرٹری گورنمنٹ نظام و آنریری
سکرٹری محمدن کالج و بانی آل انڈیا مسلم لیگ

کی

نہایت مفصل، مکمل، دلچسپ و پُر از معلومات سوانح عمری جو ایجوکیشنل کانفرنس نے
علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کی

یہ سوانح عمری درحقیقت مسلمانوں کی گزشتہ پنجاہ سالہ زمانہ کی تعلیمی، سیاسی و رقومی تاریخ اور عجیب و غریب
واقعات کا مرقع ہے۔ حیدرآباد علی گڑھ تحریک اور اسلامی پالٹکس کے متعلق بہت سے پر اسرار
مخفی حالات اس کتاب سے معلوم ہوتے ہیں جو کسی دوسرے طریقہ سے نہیں معلوم ہو سکتے

معہ مقدمہ

نوشتہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور

مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

کاغذ سفید تقطیع ۲۰×۲۶ کتابت و طباعت عمدہ ضخامت تقریباً ۹۰۰ صفحہ معہ فوٹو نواب صاحب

قیمت پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ